لندن سے شائع ہونے والا میدانِ ادب کا واحد کثیر الاشاعت بین الاقوامی اردو میگزین

लंदन से सबसे अधिक प्रकाशित होने वाला उर्दू अदका मात्र अंतरराष्ट्रीय मैगज़ीन

An International Literary Urdu Magazine Globally Circulated

ماہنامہ

قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

شمارہ:120 دسمبر 2022ء

QINDEEL-E-ADUB INTERNATIONAL

103 Peterborough Road Carshalton SM5 1EE London
(M) 0044-7886-304637 (R) 02086482560
www.qindeel-e-adub.co.uk, ranarazzaq52@gmail.com

قندیل ادب انٹرنیشنل لندن کے 10 سال اور 120 شُمارے شائع ہونے پر قارئین کو مبارکباد

Earlsfield Properties

Professional Residential Property Management Services

We will manage your property at 0% commission
Guaranteed
Rent Schemes for 3 & 5 years.

Free Management Services
Guaranteed Vacant Possession.

Get it Right

- Member National Landlord Association
- Member Deposit Portection Schemes
- Member The Property Ombudsman Scheme
- Winner of Pakistan Achievement Award 2014 (Excellence Management)
- Vastly Experience in Housing Benefits Clients.

PLEASE CONTACT: NAVEED SARWAR (MA EUROPEAN REAL ESTATE)

175 Merton Road, London SW18 5EF

Tel: 02082656000 02088770762
Fax: 02088749754
Email: info@earlsfieldproperties.com
Web: www.earlsfieldproperties.com

مجلس ادارت

بانی اراکین

خان بشیر احمد رفیق مرحوم

آدم چغتائی مرحوم

مدیر

رانا عبدالرزاق خان

نائب مدیر: مبشر شہزاد، گلاسگو

اراکین ادارتی بورڈ

ڈاکٹر منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ امجد مرزا امجد، طارق مرزا آسٹریلیا، عبدالقدیر کوکب، بشارت احمد چیمہ۔ نجمہ محبوب نجمہ، عبدالحمید حمیدی۔

التماس

تمام دوستوں سے التماس ہے کہ اپنی شعری و نثری تخلیقات اور ادبی پروگرامز کی رپورٹس وغیرہ برائے اشاعت بصورت ''اِن پیج اردو'' فائلز مع تصاویر ای میل سے روانہ فرمائیں۔ ''قندیل ادب انٹرنیشنل'' بیسیوں ممالک میں لاکھوں اردو قارئین کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ میگزین کے مندرجات پر آپ کی رائے یا مختصر تبصرے ہمیں اپنا محاسبہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مضامین کے ساتھ ضروری حوالہ جات آپ کے مضامین کی افادیت کو بڑھاتے ہیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر وغیرہ ''کاپی رائٹ فری'' ہونی چاہئیں۔ شکریہ

IMPORTANT ANNOUNCEMENT

"Qindeel-e-Adab International" magazine is a non-commercial and non-profit e-product, as well as on paper, internationally distributed free of cost for the promotion of bi-lingual poetry, fiction, informative multi purpose interesting articles etc in Urdu alphabet in the UK and Europe under the sole ownership of its Chief Editor Abdul Razzaq Khan of the address as stated elsewhere within this magazine for delivery of documents.

The magazine and the contents herein DO NOT relate to a political, religious or a social group whatsoever. The Editor does not necessarily agree with the opinions expressed by the article writers, poets etc..

Although the e-magazine is FREE OF COST to all, yet for ON PAPER copies of the magazine we do expect a reasonable amount of donation to cover the costs of printing, postage and packing for all countries as stated

Chief Editor

فہرست مضامین

نیا سال بہتر ہو	اطہر حفیظ فراز	4
ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن کے دس سال (اداریہ)		5
قندیل ادب کی دسویں سالگرہ اور رانا عبدالرزاق خان صاحب کی خدمات تحریر۔ شفیق مراد، شاعر و ادیب، نقاد، دانشور، ڈائریکٹر شریف اکیڈمی جرمنی		6
آپ کے خطوط	ادارہ	8
عشق لاہوتی کتاب کی تقریب پذیرائی	ادارہ	13
غزلیات: شعرائے کرام	ادارہ	14 تا 42
اسماء صباخواج کا انٹرویو	محمد سوز علی سوز	43
آہ کوثر علی	امجد مرزا امجد	51
روادِ ذات	اقبال مجیدی	52
آفتاب شاہ کا انٹرویو	جبیں نازاں	53
سید سبط علی صبا صاحب	پیشکش: اعجاز زیڈ ایچ	56
مبارک صدیقی، صدق و وفا کا شاعر	امجد مرزا امجد	57
یشب تمنا لندن	ادارہ	58
شائق نصیر پوری کی غزل کا مزاج	اسحاق ساجد جرمنی	59
سلسلہ دلداری کا عباس تابس	بی بی سی ایک جائزہ	59
کافی ہاؤس	ندیم راعی	64
احمد فراز کی شاعری	احمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر	68
انسانیت کا نوحہ گر افسانہ نگار اقبال متین	احمد علی جوہر	72
اقبال متین کے افسانوں میں زوال پذیر جاگیردار	احمد علی جوہر	75
اسحاق ساجد۔ برِ صغیر کا ایک جمالی گیت کار	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	85
آفتابیات	آفتاب شاہ	86
آبروئے قلم پر تبصرہ۔ شاہین کہروڑی		88
تانیثی شعری کی علمبردار شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ	مظفر احمد مظفر لندن	90
مشہور شعراء پر ایک نظر	ادارہ	92
اسحاق ساجد جرمنی	شہزادہ قمر الدین مبشر گلاسگو	105
قریشی داؤد احمد ساجد	شہزادہ قمر الدین مبشر گلاسگو	106
نیاز جیراجپوری کا شخصیت نامہ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظم	107
کرامت راج ایک ادبی شخصیت	صفی اللہ راجپوت، ملٹن، کینیڈا	109
ڈاکٹر منور احمد کنڈے	شہزادہ قمر الدین مبشر گلاسگو	111
''لبِ لباب'' ڈاکٹر طارق انور باجوہ صاحب	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	113
ڈاکٹر شمس الحق طیب شہید ایک ماہر سرجن	شفیق مراد جرمنی	114
صفیہ سلطانہ کے افسانوں کے مجموعہ مشتِ خاک کا سفر	ڈاکٹر نذیر فتح پوری، پونے	116
ڈاکٹر نجمہ شاہین کی تصنیف میں آنکھوں کو بند رکھتی ہوں	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	117
منور احمد کنڈے اور ان کی نظم گوئی	رفیق شاہین	118
شہزادہ قمر الدین مبشر ایک صحافی ادیب و شاعر	ادارہ	121

امریکہ میں اردو کا سفیر عبدالقادر فاروقی	ڈاکٹر محمد زاہد	122
آئینِ پاکستان اور فکرِ قائد میں تضاد کیوں	رانا محمد حسن۔ ایڈیٹر پیشوا	125
سخن کا سفر	عبدالشکور، کلیولینڈ اوہائیو	126
بزمِ اردو لندن کے زیرِ اہتمام عالمی مشاعرے کا انعقاد	ادارہ	132
غزلیات	ادارہ	133
جستہ جستہ	عطاء القادر طاہر	134
ادیبوں کے لطائف	ذکریہ ورک ٹورنٹو	135
اردو اور قندیل ادب	محمد کولمبس خاں جرمنی	136
مرزا غالب شعری ادب اطفال کے تناظر میں	رئیس صدیقی	137
تبصرہ کتاب سپوت ایشیا	ڈاکٹر عبدالکریم خالد	139
امجد مرزا امجد عظیم قلمکار شاعر و ادیب	ادارہ	141
افسانہ: بھلا یہ بھی کوئی پینا ہے؟	امجد مرزا امجد	145
افسانہ: شکوہ	امجد مرزا امجد	146
ایسے کو تیسا	امجد مرزا امجد	148
آسٹریلیا میں اردو کا علمبردار شاعر ڈاکٹر طارق احمد مرزا	ڈاکٹر محمد زاہد۔ کلکتہ، انڈیا	150
اقبال کی نظم 'نشانِ حقیقت' کے جواب میں	سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ	151
کئی صفتوں کے قلمکار، رانا عبدالرزاق خاں صاحب	امجد مرزا امجد	152
رانا عبدالرزاق خان صاحب۔ قلمکار، شاعر و ادیب	پروفیسر عبدالقدیر کوکب	154
پرانا تبصرہ: محترم خان بشیر احمد رفیق خان صاحب	ادارہ	155
زبانِ اُردو کا ارتقاء کثیر اقوامِ ہند کی مشترکہ زبان	ادارہ	156
چند مشاعروں کی جھلکیاں	ادارہ	160
ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی شخصیت اور زندگی کا سفر	شہزادہ قمر الدین مبشر گلاسگو	163
عبدالکریم قدسی، ایک عظیم مقبول روایتی شاعر	شہزادہ قمر الدین مبشر گلاسگو	165
دیسی گوری	امجد مرزا امجد	167
بزمِ علم و ادب	ادارہ	168
ادب کا نوبل انعام 2022	طارق احمد مرزا، آسٹریلیا	179
ڈاکٹر طارق احمد مرزا، آسٹریلیا	عاصی صحرائی	180
عبیداللہ علیم	آصف محمود ڈار	181
شکرانہ عمرہ زیارت	ادارہ	185
پاکستانی معاشرے کی تربیت ماحول	رانا عبدالرزاق خان	186
آپ کے خطوط	ادارہ	189
علامہ اقبال اور حب الوطنی	ڈاکٹر احمد علی جوہر	190
مزاج اپنا اپنا	امجد مرزا امجد	193
تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا دورہ	رانا عبدالرزاق خان	194

نیا سال بہتر ہو

اطہر حفیظ فراز

مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
طبیعتیں بھی ہوں اچھی تو حال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
نئی رُتوں کے مہینے تمہیں مبارک ہوں!!
بلندیوں کے یہ زینے تمہیں مبارک ہوں!!
چلن تمہارا ہو اچھا تو چال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
بہار آئے تو یارو!! سدا قیام کرے!!
خزاں چمن سے جو گزرے تو بس سلام کرے!!
تپش رہے، رہے سردی، سنبھال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
شعاعیں شرق سے آئیں، تمہیں بیدار کریں!!
اندھیرے غرب سے اُٹھیں، تمہیں تیار کریں!!
جنوب سے ہو تحفظ، شمال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
ہر ایک ہفتے میں ساتوں دنوں سکون رہے!!
وہ جنوری ہو دسمبر ہو یا وہ جون رہے!!
ہاں موسموں کا اُبھرتا جلال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
اگر مئی کی حرارت تمہیں نہال کرے،
یا پھر اگست میں حبس آئے، تمہیں نڈھال کرے،
خدا کرے کہ تنفس بحال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!
قدم قدم پہ وہ خوشیاں تمہیں نصیب کرے!!
وہ اپنی رحمت و شفقت بہت قریب کرے!!
خدا کرے کہ مرا یہ خیال بہتر ہو!!
مری دعا ہے عزیزو!! یہ سال بہتر ہو!!

***

ادار یــــــــہ::

ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن کے دس سال

اللہ تعالیٰ کا بہت فضل اور احسان ہے کہ اس نے صحت وسلامتی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کی توفیق دی۔ اور تمام دنیا سے ادب پرست اپنی تخلیقات مسلسل ارسال کرتے رہے۔ اور اس رسالے کو ساری دنیا میں ایک بہترین پہچان ملی ۔ ہزاروں ادیب اور شعراء نے بھرپور اس رسالے کی ترقی میں اپنا کردار ادا کیا۔ عالمی دنیا سے سب اس میگزین کو بہت پذیرائی ملی۔ دیارِ غیر میں اس رسالے نے ادب کی خدمت میں وہ مقام حاصل کیا جو کم کسی کو ملتا ہے۔ کتب کی رُونمائی، مشاعروں کی روئیداد، شعراء کا تعارف، افسانے، کہانیاں مع تصاویر سب شائع ہوتے رہے۔ باقی ممالک اور لندن کے ادیبوں اور شعراء کی تخلیقات مسلسل اس رسالے کی زینت بنتی رہیں۔

محض یہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل ہے کہ یہ رسالہ بذریعہ واٹس ایپ اور بذریعہ ای میل اور بذریعہ ویب سائٹ دنیا کے تقریباً دوصد ممالک میں پہنچتا رہا۔ پرنٹ کروا کر اس کی کاپیاں لوگوں تک اور لائبریریوں تک بذریعہ ڈاک بھی ہم پہنچاتے رہے ہیں ۔ انڈیا کی بارہ ریاستوں میں جہاں اردو زیادہ پڑھی جاتی ہے ۔ اور سارے ہندوستان اور بنگلہ دیش تک اس کی رسائی ابھی تک ہے ۔ افریقہ کے صحراؤں کے باسیوں تک بھی یہ پہنچتا ہے ۔ جزائر فیجی اور آسٹریلیا میں بھی یہ پڑھا جاتا ہے ۔ اردو کے قارئین دنیا میں ہر جگہ اور ہر ملک میں رہائش پذیر ہیں ۔ جہاں جہاں رابطہ ہوتا رہا یہ رسالہ بلا ناغہ وہاں پہنچتا ہے ۔ یہ رسالہ اس کی دسویں برسی منا رہا ہے ۔ اور سب سے التماس ہے کہ آپ سب میرے احباب اس سے جڑے رہیں ۔ اور خود اور اپنی نسلوں کو اس اردو ماہنامے سے جوڑے رکھیں ۔ اس رسالے سے ہمارے کلچر سے ہماری نسلیں متعارف ہوتی ہیں ۔ ہمیں ہمارے بزرگوں کے رہن سہن اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے ۔ تاریخ کا بھی علم ملتا ہے ۔ زبان کی ترقی بھی ہوتی ہے ۔ دنیا کی مختلف معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ خود بھی پڑھیں اور اپنے پیارے دوستوں کو بھی ارسال کریں ۔ نیز اس میں شائع کرنے کے لئے اپنی تخلیقات بھی ارسال کریں ۔ اور اردو کے خدمتگاروں کی صحت اور تندرستی کے لئے بھی دعا گو بن جائیں ۔ جو قومیں اپنے کارکنوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتیں ان قوموں میں اچھے خدمتگار پیدا ہونا بند ہو جاتے ہیں ۔ لٰہذا خاکسار کی درخواست ہے کہ ہم سے تعاون فرمایئے اور ہمدرد اور دعا گو رہیں گے ۔ خدا تعالیٰ میرے معاونین کو اور کارکنان کو خوش رکھے آمین ۔

رانا عبدالرزاق خان (مدیر)

قندیل ادب کی دسویں سالگرہ
اور
رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی ادبی خدمات

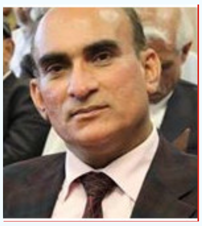

تحریر۔ شفیق مراد، شاعر و ادیب، نقاد، دانشور، ڈائریکٹر شریف اکیڈمی جرمنی

دس سال مسلسل ہر ماہ باقاعدگی سے ادبی جریدہ کی اشاعت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

قندیلِ ادب کی دسویں سالگرہ پر میں قندیل ادب کے مدیرِ اعلی رانا عبدالرزاق خاں اور اراکین ادارتی بورڈ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور نیک تمناؤں کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جن کی انتھک محنت اور علم وادب سے بے لوث محبت قابل داد اور قابل تحسین ہیں۔ اور اہل قلم کے لئے باعثِ تسکین بھی ہے۔ دس سال مسلسل ہر ماہ باقاعدگی سے ادبی جریدہ کی اشاعت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جو ممکن تو ہے لیکن آسان نہیں۔ اس کوہ کنی میں جن مراحل سے انہیں گزرنا پڑا یہ وہی جانتے ہیں۔ قندیل ادب کا پہلا شمارہ جنوری 2013 میں زینت قرطاس ہوا اور قندیل کی روشنی پھیلنے کا آغاز ہوا۔ اہلِ نقد و نظر کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین، اہلِ بصیرت کے افکار، اہل ادب کے شہ پارے اور اہل فکر کے طائرِ خیال کی گرفت میں آنے والے مضامین جن کے بارے میں غالبؔ یوں لب کشائی کرتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شعور و آگہی کی یہ قندیل مثل آفتاب دنیا کے ہر گوشے میں روشنی پھیلاتی ہوئی مزید کئی شمعیں روشن کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

قلم کی نوک سے صفحہ قرطاس پر اُترنے والی نوائے سروش بھی شائع ہوئی اور دنیا بھر کے شعرائے کرام کا کلام جس میں غزلیں، نظمیں اور دیگر اصناف شاعری کے گوہر انمول شامل ہیں اور قندیل ادب پرستاروں کے مانند اکناف عالم میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ شاعروں ادیبوں کا تعارف اور علمی ادبی پروگراموں کی رپوٹس بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اس طرح علم و ادب کے یہ نایاب پارے قندیل ادب کے طفیل دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پہنچ کر اہل علم کو سیراب کرتے اور مردہ دلوں کو زندگی کا پیغام دیتے ہیں۔ دسمبر 2022 میں اس ادبی رسالے کے دس سال مکمل ہوئے اس طرح دس سالوں میں 120 رسالے شائع ہوئے جس کی کامیابی کا سہرا رانا عبدالرزاق خاں کے سر ہے جنہوں نے کمالِ شوق سے اور مستقل مزاجی سے ہر رسالہ بروقت، بلا التوا اور بلا توقف شائع کیا اور روزمرہ کے نشیب و فراز کو راستے کی رکاوٹ نہ بننے دیا۔ ایک تخمینے کے مطابق 5000 شعراء کا کلام قندیل ادب کی زینت بنا۔ جبکہ متعدد نثر نگاروں کی تخلیقات جنکی تعداد کا تعین کرنا قدرے مشکل ہے جو قندیل ادب پر موتیوں کے مانند آب و تاب کے ساتھ چمکتی نظر آتی ہیں۔ قندیل ادب ایک بین الاقوامی رسالہ ہے۔ جس میں پاکستان، ہندوستان کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں میں تخلیق ہونے والے ادب کو بلا تفریق مذہب و ملت باقاعدہ اشاعت کے مراحل سے گزار کر شائقین تک پہنچایا جاتا ہے۔ رسالہ کی تقریباً 5000 کاپیاں شائع کی جاتی ہیں۔ جبکہ پی ڈی ایف بنا کر سوشل میڈیا کے مختلف ذرائع سے دنیا کے تمام ممالک تک پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ رسالہ اس طریقے سے کتنے افراد تک پہنچتا ہے اور کتنے اہل ذوق پڑھتے ہیں اس کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم براعظم یورپ، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، عرب اور ایشیا کے تمام ممالک سے چیف ایڈیٹر صاحب کو جو مختلف پیغامات وصول ہوتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو بولنے والے لاکھوں افراد تک رسالے کی ترسیل ہوتی ہے۔ اور بقول شاعر:

اس طرح سے روشنی کا سلسلہ چلتا گیا
آدمی کو آدمی سے آگہی ملتی گئی
(شفیق مراد)

شعور و آگہی کی یہ قندیل مثلِ آفتاب دنیا کے ہر گوشے میں روشنی پھیلاتی ہوئی اور مزید کئی شمعیں روشن کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ قندیل ادب کا ذکر ہو اور اس کے رُوحِ رواں، مدیرِ اعلیٰ رانا عبدالرزاق خاں کی نابغہء روزگار شخصیت پر کچھ احاطہء تحریر میں نہ لایا جائے تو یقیناً یہ تحریر ادھوری رہے گی۔ رانا صاحب ہمہ گیر شخصیت کے حامل ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات پر انکی گہری نظر ہے۔ معاشرتی، معاشی اور ملکی سیاست کے حوالے سے انکی تحریریں قاری کے لیے باعث کشش ہوتی ہیں۔ سادہ اندازِ بیان میں تجزیہ نگاری اور حالاتِ حاضرہ پر کالم انکی قلم پر دسترس کا آئینہ دار ہیں۔ آپ ضلع خوشاب کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن کے بعد مختلف محکموں میں خدمات سرانجام دیں۔ اور پھر ہجرتوں کے عمل سے گزرتے ہوئے 2005ء میں لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے مضامین، کالم تجزیے رانا عبدالرزاق خان، اے آر خان، رجل خوشاب، ابن لطیف اور عاصی صحرائی کے نام سے مختلف جرائد و رسائل کی زینت بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خلوص اور درد کی دولت کے ساتھ ساتھ وسعت النظری اور وسعت القلبی بھی عطا کی ہے۔ اور پھر قلم کی طاقت دیکر خلائق عامہ کے لئے نافع الناس وجود بنایا۔ لندن سے شائع ہونے والے اخبار، یو کے ٹائم کے ادبی صفحہ کے انچارج مقرر ہوئے اور اپنے فرائض بطریق احسن سرانجام دئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس اخبار کے لئے سیاسی کالم بھی لکھتے رہے۔ علاوہ ازیں مختلف شخصیات پر آپ نے قلم اُٹھایا اور ان کی خدمات اور فن کو امر کر دیا۔ آپ کے تنقیدی مضامین اور تحقیقی مضامین آپ کے ذہانت و فطانت کی آئینہ دار ہیں۔

> رانا عبدالرزاق کی علمی و ادبی خدمات کو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

برطانیہ میں موجود تنظیم بزمِ شعر و سخن برطانیہ کی بنیاد 2008 میں رکھی۔ جس کے تحت متعدد مشاعرے اور ادبی نشستوں کا اہتمام کیا۔ ایک اندازہ کے مطابق ہر ماہ محفل شعر و سخن کا اہتمام کر کے دیارِ غیر میں ادب کی ترویج کرتے رہے۔ بزمِ شعر و سخن برطانیہ تنظیم کے کام کو مزید وسعت دینے کی غرض سے 2013 میں تنظیم کو قندیل شعر و سخن یو کے، کا نام دے کر مملکت متحدہ برطانیہ تک دائرہ وسیع کیا۔ اس تنظیم کے تحت ماہنامہ قندیل ادب اور سہ ماہی قندیل حق رسالہ نکالا۔ جو کہ تادمِ تحریر جاری ہے اور جس کے فیض سے تشنگانِ علم کی تشنگی کا درمان ہوتا ہے۔ 2020ء میں زوم مشاعروں کا اجراء کیا۔ تقریباً 300 زوم مشاعرے کرا چکے ہیں۔ اس طرح شعور و آگہی کا پیغام عام کیا اور ہوا کے دوش پر شاعروں کی شاعری کو بلندیٔ پرواز بخشی۔ آپ کی تصانیف کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ ۱۔ قندیل علم ۔ ۲۔ قندیل حق ۔ ۳۔ دانشکدہ عظیم ۔ ۴۔ سپوتِ ایشیا ۔ ۵۔ میرا گاؤں ۔ ۶۔ بہادر شیر مرحوم (سوانح حیات) ۔ ۷۔ معمار پاکستان۔ علم و ادب کے سفیر رانا عبدالرزاق خاں کا روشنی کا سفر جاری ہے۔ میں اس سفیرِ ادب اور پاسبانِ قلم کو سلام پیش کرتے ہوئے حفیظ ہوشیار پوری کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

خدا دراز کرے عمر اہلِ شوق حفیظ
کہ جی رہے ہیں کسی دورِ منتظر کے لئے

اعلان: ماہانہ قندیل ادب انٹرنیشنل میگزین کا سالانہ چندہ 25 برطانوی پونڈ ہے۔ اگر کسی کو گھر پر بذریعہ ڈاک ارسال کرنا پڑے تو 35 پونڈ سالانہ ہے۔ نیچے دیئے گئے اکاؤنٹ میں سالانہ چندہ کی ادائیگی فرمائیں۔ جزاکم اللہ

رانا عبدالرزاق خان لندن

HSBC London UK, A/C 04726979   Sort Code 400500

(M) 0044-7886-304637, 02086482560

آپ کے خطوط

لندن سے محترم ڈاکٹر سر افتخار احمد ایاز صاحب رقم طراز ہیں:

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی عمر سے نوازے۔آمین،ہم آپ کے علمی، ادبی فیض سے مستفید ہوتے رہیں۔قندیل ادب اکتوبر کے شمارے میں آپ کی اُن عدیم المثال خدمات اور قربانیوں کا شدت سے احساس ہوا ہے جو آپ اُردو ادب کے فروغ کے لئے بجالا رہے ہیں۔علم وادب کی روشنی بکھیرنے کے ساتھ اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کی بھی سیرابی ہو رہی ہے۔ان بیش بہا خدمات کا صلہ تو اللہ تعالیٰ ہی آپ کو دے گا۔لیکن میری عاجزانہ دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور رہیں گی۔آپ کی ان کٹھن کاوشوں کے سفر کے لئے (ایک صد) پونڈ ادنیٰ ترین زادِراہ پیش ہے۔مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔عاجز و احقر۔

محترم خالد شیخ صاحب لاس اینجلس کیلیفورنیا سے لکھتے ہیں۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ ہر ماہ آپ بڑی مہربانی سے قندیل ادب ای میل کرتے ہیں۔یہ میگزین اس قدر دلچسپ اور معلوماتی مواد پر مشتمل ہوتا ہے کہ شروع کروں تو ختم کر کے ہی دم لیتا ہوں۔میں آپ کے انتخابِ مضامین ،شعر وسخن ، نئے اور پرانے شعراء کا کلام ،تاریخی معلومات، تعارف شخصیات ،لطائف زندگی،تعارف کتب،مشاعروں کا ذکر جو بڑی سنجیدگی سے ہوتا ہے۔ اس سے بہت متاثر ہوں۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی فعال زندگی سے نوازے آمین۔

محترم عبدالباری ملک صاحب ایم بی ای لندن سے تحریر کرتے ہیں۔

مکرم ومحترمی جناب رانا صاحب......السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ۔آپ کی طرف سے بذریعہ ای میل قندیلِ ادب اگست کا شمارہ ملا۔پڑھ کر خوشی ہوئی۔آپ نے ماشااللہ بہت محنت کی ہے۔آپ کا غزلوں کا چناؤ بہت اچھا ہے۔جناب عبدالکریم قدسی کی نظم پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اُنہوں نے اس نظم میں تمام اُن خاندانوں کے دل کی بات کی ہے۔جن کو راہِ خدا میں اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت پر مجبور کیا جا رہا ہے۔اللہ تعالیٰ خود ہی ان کا حافظ و ناصر ہو۔جناب پروفیسر مبارک عابد،مبارک صدیقی اور دوسرے شعراء کا کلام پڑھ کر بہت لطف آیا۔ملانوں کے متعلق بھی مضمون پڑھا ''معلومات سے پُر'' تھا۔محترمی جناب بشیر احمد رفیق صاحب کا اردو زبان سے متعلق مضمون بھی دلچسپ تھا۔اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں اور برکت عطا فرمائے۔''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ'' آمین۔

محترم عدیل صدیقی لکھتے ہیں:

جناب رانا صاحب،سلام مارچ کا قندیل ادب بہت عمدہ ہے۔آپ جس حُسن وخوبی سے اسے ترتیب دیتے ہیں وہ قابل تحسین ہے اللہ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو خوش رکھے۔آمین۔

محترم عبدالحلیم طیب لکھتے ہیں:

مارچ کا شمارہ ملا ،محترم خان بشیر احمد خان رفیق کا تبصرہ اور تعریف ایک حقیقت پر مبنی ہے۔آپ اور آپ کی ٹیم قندیل ادب میں ادبی حسن وجمال سے متعارف کرا رہی ہے۔وسیع سوچ کا من سلویٰ ان لیڈروں اور پالیسی بنانے والوں کے لئے بھی ہے۔کاش سب لوگ ان پند ونصائح کے موتیوں سے کچھ سیکھ لیں۔خدا آپ سب کو خوش رکھے۔آمین۔

محترم الیاس صاحب لکھتے ہیں:

محترم رانا صاحب آپ جیسے علم دوست انسان مجھے بھی یاد رکھتے ہیں۔میں شکر گزار ہوں۔آپ ایک بے مثال،بلا معاوضہ خدمت ادب کر رہے ہیں۔اس آپا دھاپی کے دور میں فرشتہ صفت لوگ ہی ایسے کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

گیا،انڈیا سے محترم سید احمد قادری لکھتے ہیں:

رانا صاحب آداب قندیل ادب مارچ کا شمارہ پڑھا میرے افسانے کو آپ نے عزت بخشی۔شکریہ،بہت ہی معیاری رسالہ ہے۔خصوصاً حبیب جالب کی غزل امجد مرزا کا انشائیہ ''بیوقوف'' خوب تھے۔ادیبوں کی خوش مذاقیاں بھی اچھی تھیں۔ایک افسانہ ارسال خدمت ہے۔

محترم امجد مرزا امجد لکھتے ہیں:

آپ کا میگزین ملا،پڑھ کر بہت مزا آیا۔آپ کا میگزین ایک ڈائجسٹ ہے۔اس میں ہر قسم کے مضامین مل جاتے ہیں۔اور کسی قسم کی گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔علمی وادبی،سیاسی،مزاحیہ،افسانے،سبق آموز چٹکلے،غرضیکہ ہر قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔خدا آپ کی خدمت قبول کرے آمین۔

محترم عبدالستار خان آف گوئٹے مالا: شکریہ ادا کرتے ہیں قندیل ادب بھیجنے پر،بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔

عاصم نور: جزاک اللہ کہتے ہیں:

ایک ستارہ ہے ادب کا۔ایک چاند ہے کہکشاں کا۔

محترم محی الدین عباسی سینئر تجزیہ کار لکھتے ہیں:

محترم رانا صاحب السلام وعلیکم

آپکا پچھلا شمارہ ملا تو دل سے دعا نکلی اور خوشی ہوئی کہ آپ کا رسالہ ماشاء اللہ ترقی (کی منازل) طے کر رہا ہے۔اس میں شاعری اور اردو ادب کا ایک حسین امتزاج ہے۔جو دوسروں سے مختلف اور نمایاں نظر آتا ہے۔جس تیزی سے آپ کے رسالے نے ترقی کی ہے۔اس کی خاص وجہ شہرت اعلیٰ نظمیں،غزلیں اور آرٹیکل کا اعلیٰ معیار ہے۔جس پر تبصرہ ہمارے دلعزیز استاد اعلیٰ پایہ کے مقالہ نویس محترم بشیر رفیق خان صاحب کر دیں تو (دوسروں) کی ضرورت نہیں رہتی ۔اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی کاوشوں کو چار چاند لگائے۔آمین۔

محترم مبارک احمد فرخ ویانا آسٹریا سے رقم طراز ہیں:

خاکسار آپ کی شفقت اور محبت کا ممنون ہے آپ کا میگزین ایک عمدہ کاوش ہے۔مضامین اور شاعری کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔دیارِ غیر میں اپنی زبان میں اس قدر شاندار میگزین مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں۔رانا صاحب خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کے سب معاونین کو جزا دے۔آمین۔

عبدالحئی بشارت کینیڈا سے لکھتے ہیں: مکرمی رانا صاحب۔آپ کا تازہ شمارہ پڑھا۔ہر شمارہ پہلے سے سبقت لے جاتا ہے۔ایک عمدہ پیشکش ہے اور یقین کرتا ہوں کہ اس کی ادارت میں سب علم دوست احباب کے تعاون سے اس کے معیار کو پہلے سے بہتر کرنے کی لگن اور کوشش میں کمی نہیں آنے دیں گے۔محترم پروازی صاحب کے 'احمدیہ کلچر' کی ایک چھاپ ہے ان سب دوستوں پر جو نیک ماحول میں پلے بڑھے اور تعلیم الاسلام کالج کی عظیم درسگاہ کے سایہ میں پروان چڑھے۔یہ دوست اگر اردو شعر وادب کے شہر کے مکین نہیں ہوئے تو اس شہرِ دلربا کی گلیوں سے گذرے ضرور ہیں۔اسی لئے آج بھی اردو سے محبت میں دوسروں سے دو ہاتھ آگے ہی ہیں۔کینیڈا میں ہماری شعر وادب کی نشستیں ہوتی ہی رہتی ہیں اور پھر ہمارے محبوب استادِ محترم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب کی شفقت چلچلاتی دھوپ میں گھنے سائے کی طرح ہے۔انکی قدآوری کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب بڑے بڑے شعراء انکے احترام میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انکو صحت والی زندگی عطا فرمائے۔آپ کا شمارہ تو ایک خوبصورت خوشبودار پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔اس شمارہ میں نظیر اکبر آبادی کی ایک مشہورِ زمانہ نظم 'سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا' پڑھنے کو ملی جس کے لئے آپ کا اور پیارے بھائی کولمبس صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔اللہ آپ کے زورِ قلم میں اور قوت دے ۔آمین۔

محترم ندیم احمد فرخ گلگت بلتستان سے لکھتے ہیں:

محترم رانا صاحب پہلی بار قندیل ادب نظر سے گزرا۔مارچ کا شمارہ۔آپ نے تو واقعی اسے ادب کی قندیل بنا ڈالا ہے۔بلاشبہ یہ میگزین آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔فی زمانہ ہر صاحب ذوق کو ایسی ہی قندیل کی ضرورت تھی۔دعا ہے کہ آپ کی قندیل ابد تک روشن رہے۔

محترم غلام احمد اسمٰعیل صاحب مالابار انڈیا سے رقم طراز ہیں:

جناب رانا صاحب سلام،آپ کا قندل ادب ملا اسے پڑھنے کے بعد آپ کی ویب سائٹ سے سارے ماہنامے پڑھ ڈالے۔آپ کا ایک مضمون سخن فہمی نے مجھے واقعی متاثر کیا،ہم مالابار کے لوگ اردو فہم نہیں ہیں تاہم میرے بچے اس میں قدرے دلچسپی لیتے ہیں۔ہم آپ کی اس کاوش کے معترف ہیں۔

محترم امجد مرزا امجد صاحب لکھتے ہیں:

محترم رانا عبدالرزاق صاحب سلام وآداب

بہت شکریہ قندیل ادب بھیجنے کا۔اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ نہایت محنت طلب کام ہے اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ آپ اور آپ کی ٹیم اسے نبھا رہی ہے جس کے لئے آپ سب کو دلی مبارک۔نثر،شاعری کے علاوہ اس میں باتصویر معلوماتی مضامین اور چٹکلے بھی نہایت دلچسپ ہیں۔آپ نے اس ناچیز کو اپنے ادارتی بورڈ میں شامل کرکے نہایت عزت افزائی کی ہے جس کے لئے میں شکر گزار ہوں۔میں آپ کو اپنے دو کتابیں ان پیج میں بھیج رہا ہوں جس میں سے آپ شاعری اور نثر چن کر اپنے ادبی مجلّے میں شامل کر سکتے ہیں دو تین مختلف فوٹو بھی ارسال خدمت ہیں ان میں کوئی لگا دیا کریں۔آپ کے اس خوبصورت ادبی رسالے میں میری تحریر شامل ہونا میرے لئے باعث فخر ہوگا۔ہر ماہ بھیجنے کا اہتمام کئی بار نہیں ہوسکتا کہ میری بھی کافی ادبی مصروفیات ہوئی ہیں اس لئے اکٹھا مواد ارسالِ خدمت ہے اسے اپنے تک ہی رکھئے۔بہت شکریہ۔

سید حسن خان صاحب لندن سے لکھتے ہیں:

رانا صاحب۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی قندیل ادب میں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں اور اس معلوماتی رسالے کو پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔اور آپ کے لئے دُعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو سدا خوش رکھے۔ریاض احمد ڈوگر صاحب لکھتے ہیں،بہت خوب،جاری رکھیئے۔شکریہ۔

علیم محمود صاحب لکھتے ہیں: خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ

عبدالجلیل عباد ہمبرگ سے لکھتے ہیں:

قندیل ادب ایک چمن کی طرح اپنی خوشبو بے لوث ساری دنیا میں پھیلا رہا ہے،

محمد فضل الرحمن صاحب ڈھاکہ بنگلہ دیش سے لکھتے ہیں:

آپ کا میگزین بہت دلچسپ ہے۔ میں آپ کی کاوش کا معترف ہوں۔ میں نے سارا میگزین پڑھا ہے۔ بنگلہ دیش کا تعارف کافی تفصیلی ہے۔ مگر جو بات اس میں رہ گئی ہے اس کا ذکر کئے دیتا ہوں۔ پٹ سن دو دہائی پہلے ہماری بڑی ایکسپورٹ تھی مگر اب ریڈی میڈ گارمنٹس کی انڈسٹری ہے جو کہ پانچ ہزار کی تعداد میں کام کر رہی ہے۔ اب بنگلہ دیش دنیا میں ریڈی میڈ گارمنٹس کا دوسرا بڑا ایکسپورٹر ہے۔ دوسری بات اب سارے دریاؤں پر بڑے بڑے پُل بنا دیئے گئے ہیں۔ سب سے بڑا پل دریائے پدما پر زیرِ تعمیر ہے۔ ایک دفعہ پھر میگزین ارسال کرنے کا شکریہ۔ براہ مہربانی جاری رکھیئے گا۔

محترم زکریا ورک صاحب کو ای میل آئی ہے جو کہ انہوں نے ادارے کو ارسال کی ہے۔ جس میں پرفیسر وسیم احمد فریدی لکھتے ہیں:

”قندیل ادب پڑھا، بہت پسند آیا، خصوصاً پاکستان پر مضمون جو کہ سب کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ میں رانا صاحب کی کاوش کو ستائش کی نظر سے دیکھتا ہوں اُن تک میرے جذبات پہنچا دیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نسیم فاروق صاحب برمنگھم سے لکھتے ہیں: بہت خوب، جاری رکھئے۔

کسی کو دیکھوں تو ماتھے پہ ماہ و سال ملیں
کہیں بکھرتی ہوئی دھول میں سوال ملیں
آ ؤ کچھ دیر دسمبر کی دھوپ میں بیٹھیں
یہ فرصتیں ہمیں شاید نہ اگلے سال ملیں

محترم فرید احمد ناصر صاحب فرماتے ہیں:

آپ کا قندیل ادب پہلی بار ملا۔ مختلف موضوعات پر کئی ایک مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ ماضی قریب اور ماضی بعید کے استاد کا متنوع کلام پڑھ کر تعریف نہ کرنا بخل ہوگا۔ اسی طرح وقت کے معمور کے تابع اور زیرِ سایہ شعراء کا کلام بھی اس رسالہ میں ملا دونوں زمانوں کے شعراء کا حسین امتزاج اور سنگم محسوس ہوا۔

محترم سوہن راہی صاحب رقم طراز ہیں:

رانا صاحب سلام۔ آپ کی محبتوں اور محنت کا ثمر قندیل ادب مسلسل مل رہا ہے۔ یہ مجھ جیسے معمولی طالب علم کی علمی پیاس بجھانے کے لئے بہت مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں موجود محبت اور نور کی کرنیں مجھے زندہ رکھتی ہیں۔ اس مشکل اور خوبصورت کام کو جاری رکھنا علم دوست اور فراخدل لوگوں کا کام ہے۔

محترم امجد مرزا امجد صاحب رقم طراز ہیں:

محترم رانا صاحب سلام و آداب۔

شکریہ قندیل ادب اپنی تمام روشنیوں و رعنائیوں کے ساتھ ملا، پڑھا خوشی ہوئی شکریہ آپ نے میرا افسانہ اور مضمون شامل کر کے میری عزت افزائی فرمائی۔ ڈاکٹر منور احمد کنڈے صاحب کی نظم اور میرا قطعہ پر بنی ہوئی میری گرا فک بھی شامل کی۔ بہت شکریہ، ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ڈھیر سا مواد، معلوماتی مضامین شعر و شاعری اور نثر لئے دنیائے ادب کے خزانے لٹا رہا ہے۔ اللہ پاک آپ کی محنت قبول فرمائے اور اجرِ عظیم عطا کرے۔ آمین۔

محترم شیخ رفیق طاہر صاحب لکھتے ہیں:

جناب محترم رانا صاحب نیا سال مبارک ہو۔ قندیلِ ادب ملا۔ جب یک لخت میں اسے پڑھ چکا تو میرے دل کے جا تاثرات تھے۔ کہ یہ مختلف بہترین اقسام کے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو جزا دے۔ آمین۔

محترم تنویر خان سڈنی آسٹریلیا سے تحریر فرماتے ہیں:

محترم رانا صاحب سلام و دعا۔ خاکسار کو آپ مسلسل دو سال سے قندیلِ ادب بھجواتے ہیں جس کے لئے بندہ آپ کو بہت ممنون ہے۔ جنوری کا شمارہ دیکھا۔ ہر شمارے کی طرح اس میں بھی ادب، ثقافت، نظم، نثر، شاعری، دینی اور دنیاوی معلومات، قصے کہانیاں اور افسانے، حالاتِ حاضرہ، مزاح لطائف بلکہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ ہر ماہ آپ ایک سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ ہر ماہ ایک شمارہ نکالنا بہت مشکل کام ہے۔ جو کہ آپ کی ٹیم مسلسل کئے جا رہی ہے۔ ہر تحریر خوبصورت الفاظ سے مزیّن، ہر ماہنامہ کا سرورق، انتہائی جدت سے تیار کردہ صفحات آپ کی ادب سے محبت وعقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس کے لئے مجھ جیسے ادب کے طالب علم پر آپ کی عقیدت اور شکر گزاری لازم ہے۔ کہ بندہ کو یہاں آسٹریلیا میں بیٹھے ادبی تشنگی مٹانے کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے۔ میں آپ کا اور آپ کے سب معاون کارکنان کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

خادم علی ہاشمی صاحب فرماتے ہیں:

محترمی زکریا ورک صاحب۔ سلام مسنون۔

قندیل ادب ارسال کرنے کا بے حد شکریہ۔ میں نے اسے پہلی نشست میں جستہ جستہ دیکھا ہے۔ نظم، نثر، فکشن اور غیر فکشن سب موضوعات کا ایک دلکش

امتزاج ہے۔خوشبو پر آپ کا مضمون انتہائی معلومات افزا ہے۔خوب ہے۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔اس میں دی گئی بہت سی معلومات میرے لئے نئی ہیں۔آپ نے حیاتیات کے علم کو ادبی معلومات کے ساتھ ایک خوبصورت مضمون کی بنا کی ہے بارِ دگر شکریہ۔

سید احمد قادری صاحب لکھتے ہیں:

محترم رانا صاحب سلام مسنون۔آپ کی مہربانی سے قندیل ادب جیسے خوبصورت اور معیاری رسالے کے پڑھنے کا موقع ملا۔ممنون ہوں۔اس شمارے کے تمام مشمولات دلچسپ اور حسن ومعیار سے مزیّن ہیں۔''نامے جو میرے نام آتے ہیں'' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ رسالہ کئی علمی وادبی حلقوں میں بھی مقبول ہے۔''ماہِ جنوری کی وجہ تسمیہ'' ایک اچھا اور معلوماتی تھا۔ایک افسانہ ارسال خدمت ہے پسند آئے تو قریبی اشاعت میں شامل کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

عزیزم سلمان احمد کیرالہ ہندوستان سے لکھتے ہیں:

میرا نام سلیمان ہے۔صوبہ کیرالہ سے ہوں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔عمر ۱۴ سال ہے۔قندیلِ ادب کافی عرصے سے پڑھتا ہوں نیا شمارہ تو ہم طلباء کا ہی شمارہ ہے۔سانحہ پشاور کے ذکر کے علاوہ جدید معلومات سے بھی مزیّن ہوتا ہے۔سکول کے ہوم ورک میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے زبان کہاں سے لاؤں۔

مشہور قلمکار،افسانہ نویس،شاعر وادیب،مصنف،مدیر گوشہ ادب جناب امجد مرزا امجد لندن سے رقم طراز ہیں:

محترم جناب رانا عبدالرزاق صاحب۔سلام وآداب

اگست کا شمارہ قندیل ملا جس نے دل ودماغ میں روشنی بھر دی۔ماشاءاللہ آپ کی شبانہ روز محنت سے قندیل دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔مضامین،نثر، شاعری چھوٹے موٹے ٹوٹکے،لطیفے معلوماتی مضامین اور دیگر تحریریں نہایت بامعنی اور پڑھنے کے لائق ہوتی ہیں۔اس بار جناب چوہدری محمد ابراھیم صاحب نے اٹلی وینس کا اس طرح سفر نامہ لکھا کہ لگتا تھا کہ ایک فلم چل رہی ہے۔اور ہم وینس کی سیر کر رہے ہیں۔رانچی کے معروف افسانچہ نگار جناب ڈاکٹر ایم سے حق کے افسانے پڑھ کر لطف آ جاتا ہے وہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ان کے بے حد فدائی ہوں اور جہاں بھی ان کا افسانہ ہو پہلے اسے ہی پڑھتا ہوں ان کے علاوہ دیپک بدکی بھی افسانچہ نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔اسی طرح جناب برادرم طارق مرزا بھی جہاں شاعری میں کمال کرتے ہیں وہاں ان کی نثر بھی خوبصورت ہے وہ دونوں میں باکمال ہیں

اسحاق ساجد کی شاعری بھی اعلیٰ اور مضامین بھی نہایت خوبصورت لکھتے ہیں انہوں نے ویلز کی معروف شاعرہ محترمہ شمع چوہدری کی کتاب 'ملائم شام' پر نہایت اعلیٰ تعارفی مضمون لکھا۔شمع چوہدری کافی مدت سے گوشہ نشین ہیں ان سے ای میل اور فون کے ذریعے بات چیت ہوتی تھی مگر اللہ جانے وہ کہاں اور کیسی ہیں بہت مدت سے ان سے رابطہ نہیں ہوا۔میری غزل اور افسانہ شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔آپ کی اس عزت افزائی کے لیے تہہ دل سے دعا نکلتی ہے۔اللہ کرے قندیل ادب دن دُگنی رات چگنی ترقی کرے آمین۔

سلیم انصاری جبلپور بھارت رقم طراز ہیں:

محترم رانا عبدالرزاق خاں صاحب۔سلام وخلوص،قندیل ادب اگست کا شمارہ مل گیا ہے۔اور میں نے اس کے چیدہ چیدہ حصے پڑھے ہیں۔مشمولات عمدہ اور ادبی معیار سے قابلِ ذکر ہیں۔آپ جس محنت اور لگن سے یہ رسالہ ترتیب دیتے ہیں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔آپ کی یہ ادبی خدمت قابل تقلید ہے۔اتنے خوبصورت شمارے کے لئے مبارکباد۔

ممتاز شاعر وادیب مجیب شہزر علی گڑھ سے رقم طراز ہیں:

علی گڑھ کے ممتاز استاد شاعر وادیب رئیس الدین رئیس کے پانچویں شعری مجموعہ''سرِ کنارہء شام'' کی رسمِ اجراء کی تقریب کی روئیداد برائے اشاعت ارسال خدمت ہے۔آپ دیارِ غیر میں اُردو کی سچی خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ محتسن ہے۔اللہ آپ کو ہمیشہ صحت وتندرستی عطا فرمائے۔

صد مبارک ''جشنِ پنج سالہ'' مبارک

ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا لکھتے ہیں:

جگنو کی روشنی،بانسری کی لے،بچے کی کلکاری،اور ہواؤں کی گدگدی کی طرح فنکار اور تخلیق کار کا کوئی فرقہ،کوئی قبیلہ،کوئی ذات اور کوئی ڈومیسائل یا پاسپورٹ نہیں ہوتا۔افسوس ہے ایسی ذہنیت پر جو کسی بھی تخلیق کار سے کسی بھی پہلو سے تعصب برتتے اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس ایسے تخلیق کار کی ذہنیت پر ہوتا ہے جو خود تخلیق کار ہو کر بھی اپنے ہی جیسے کسی اور تخلیق کار سے تعصب برتے۔پاکستان کی سب بڑی ٹریجڈی،سب سے بڑا المیہ یہی رہا ہے کہ فرقہ وارانہ،لسانی،قومی تعصبات کی دیمک ہمارے بعض بڑے بڑے تخلیق کاروں کو بھی گھن کی طرح اگر چاٹ نہیں تو اچھی طرح سے چکھ ضرور چکی ہے۔یہی دیمک زدہ ذہنیت پوری قوم میں وائرل ہو چکی ہے،ایک ایسے وائرس کی طرح جو خود کو ایچ آئی وی (HIV) کی طرح بڑی تیزی سے ریپلیکیٹ (Replicate) کرتی رہتی ہے۔سب کچھ آن ریکارڈ ہے لہٰذا مثال دینے

میں کوئی حرج، حجاب، قباحت یا عار آڑے نہیں، ابو الاثر حفیظؔ جالندھری جیسا اعلیٰ پائے کا تخلیق کار، اپنے ہم عصر ایک اور تخلیق کار ثاقبؔ زیروی کے خلاف اخبارات میں شہہ سرخیاں لگواتا اور اس کا ٹی اے ڈی اے منظور شدہ شرح سے گم کرواتا پھرتا ہے صرف اس لئے کہ ثاقب زیروی کا تعلق ایک مخصوص عقیدہ کی حامل جماعت سے تھا۔ اختلاف رائے اور چیز ہے او ر تعصب کچھ اور۔ ''ابوالاثر'' کا ذہن تعصب کے زیر اثر تھا (واضح رہے کہ میرا یہ جملہ تعصّب نہیں بلکہ حقیقت پر مشتمل ہے) اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ''بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں'' کا نقیب اپنے تعصّب کو بھی کچھ ایسے زوروں سے منوا گیا کہ اس کے تعصّب کی اس رِیت (Legacy) کا زور ابھی بھی اس کے وطن پہ چل رہا ہے۔

اسی ثاقب زیروی پہ پابندی لگوائی جاتی ہے کہ وہ سٹیٹ میڈیا کے ہی نہیں بلکہ پبلک مشاعروں میں بھی شرکت نہ کرے باوجود اس کے کہ وہ تحریک پاکستان کا ایک ایسا شاعر تھا جسے قائد اعظم کی تقریر سے قبل اپنا کلام سنا کر حاضرین کے دل گرمانے کا اعزاز حاصل تھا، جو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین صاحب کی خصوصی درخواست پر افواج پاکستان کا مورال قائم بلکہ بلند کرنے کے لئے فوجی افسران اور جوانوں کو دبنگ آواز میں اپنا کلام سنایا کرتا تھا۔ اسی ثاقبؔ پہ نہ صرف پابندی لگی بلکہ پاکستانی میڈیا، بشمول اخبار و رسائل و جرائد نے اس کی تخلیقات کا بائیکاٹ اس کے مرنے کے بعد اب تک جاری رکھا ہوا ہے

کچھ یہی سلوک عبید اللہ علیمؔ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اور یہ سلوک ثاقبؔ اور علیمؔ اور ان کے ہم عقیدہ (احمدی) تخلیق کاروں کے ساتھ ہی نہیں، کئی دوسرے تخلیق کاروں سے بھی روا رکھا جا رہا ہے۔ فی زمانہ ''ماہنامہ قندیل ادب انٹر نیشنل''، کو ہی یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس کے مدیر جناب رانا عبدالرزاق خان صاحب فنکاروں کے فن اور تخلیق کاروں کی تخلیق کو کمال وسیع المشربی، کمال وُسعت قلبی کے ساتھ اور بغیر کسی باریک در باریک دانستہ یا غیر دانستی تعصّب کے، اپنے رسالہ کے صفحات میں جگہ دے دیتے ہیں۔ میں ان کے اس حوصلہ کی تمام وسعتوں کا اس وقت دل و جان سے معترف ہو گیا جب قندیل ادب کے صفحات میں میں نے ایک ایسے تخلیق کار کا کلام آراستہ دیکھا جنہوں نے ثاقبؔ اور علیمؔ کے روحانی امام کی شان میں گستاخانہ ہجو لکھ کر شہرت عام حاصل کی ہے۔ غالباً یہ محترم رانا صاحب موصوف کی اس اعجاز نما صفت (اور عادت) کہ وہ گالیاں سن کے دعا دیتے اور دکھ پا کے آرام، کا کرشمہ ہے کہ مذکورہ شاعر محترم رانا صاحب کی ''مجلس شعر و سخن برطانیہ'' کی مجالس میں بھی 'بلا خوف و خطر' شرکت کر لیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ رانا صاحب کی اس مجلس میں انہیں کسی تعصب، کسی نفرت، کسی طنز، کسی بے اعتنائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس مجلس میں تو سب کے لئے محبت ہی محبت ہے اور نفرت کسی سے بھی نہیں۔

جگنو کی روشنی، بانسری کی لے، بچے کی کلکاری، ہواؤں کی گدگدی، فنکار کے فن اور تخلیق کار کی تخلیق کی طرح ''ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل'' کا بھی کوئی فرقہ، کوئی قبیلہ، کوئی ذات اور کوئی ڈومیسائل نہیں، یہ تو انٹرنیشنل یعنی عالمگیر ہے۔ ہاں یہ عالمگیر ہے انسانیت کی طرح، یہ عالمگیر ہے محبت کی طرح!۔

مسلسل اشاعت کے پانچ یادگار سال مکمل کرنے پر محترم رانا عبدالرزاق خان صاحب اراکین مجلس ادارت، معاونین، خواتین و حضرات ادبا، شعراء و شاعرات اور جملہ قارئین قندیل ادب انٹرنیشنل کی خدمت میں مبارک باد۔

عبدالحلیم طیب صاحب کنیڈا سے رقم طراز ہیں:

ماشاء اللہ ''قندیل ادب''، عظیم ادیبوں، شعراء کی منتخب ادبی تحریرات کے ساتھ انسانیت کی خدمت میں مسلسل رواں رواں ہے۔ اور ٹھیکیداران اسلام کو بھی آئینہ دکھاتا رہتا ہے جو معصوموں کی جان کے در پے رہتے ہیں، اور اسلامی تعلیم کے متضاد اپنی خواہشات کو اس سے بالا سمجھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو شعور دے! اور آپ کی کاوشوں کو چار چاند لگا دے، آمین!

آدم چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

دسمبر کا شمارہ نظروں سے گزرا جسے پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ کی یہ خدمت بلاتفریقِ مذہب و ملت قابلِ تحسین ہے میں بھی دو تین رسالوں کا ایڈیٹر رہا ہوں مگر اس جیسا عظیم رسالہ اس سے قبل لندن میں نہیں دیکھا تھا جس پر اس قدر بے لوث محنت کی جاتی ہو۔ کلام کی تلاش، اُس کا انتخاب، شاعر و ادیب کی تصاویر کی فراہمی، اسے لکھنا، پھر اس رسالے کو زمانے کے مزاج کے مطابق ڈیزائن کرنا، سارے موادکی احتیاط سے پروف ریڈنگ کرنا، اور پھر اس شاہکار کو بڑے شوق سے ساری دنیا میں قارئین کو ای میل کرنا۔ ایک جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غلطیاں تو بڑی کتب میں بھی رہ جایا کرتی ہیں۔ اس پر بھی نظر رکھیں اور آپ کے سب معاونین کو بھی سلام پیش کرتا ہوں۔ یہ بلاشبہ اُردو کی دیارِ مغرب میں عظیم خدمت ہے۔ آپ سے پہلے بھی بہت لوگ اس میدان میں آئے مگر آپ کی خدمت اب تک سب سے بالا ہے بلکہ آپ کی فراخدلی، شوق اور لگن اس کا متحرک ہے اور اب تو یہ خدمت بین الاقوامی ہو رہی ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو جزا دے۔ آمین۔

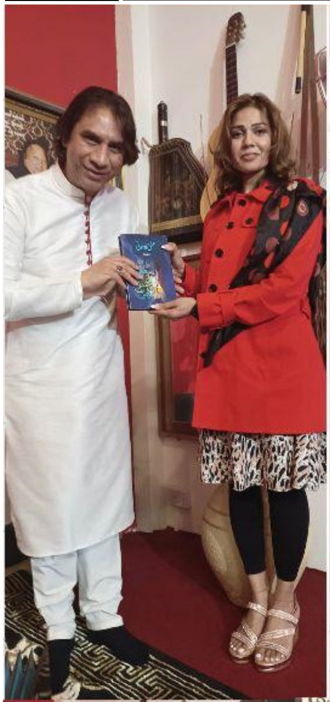

عشق لاہوتی کتاب کی تقریب پذیرائی اور لوک موسیقی شام کا انعقاد

ایسٹرن ہارمنی اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام سیدہ کوثر کے مجموعہ کلام 'عشق لاہوتی' کی تقریبِ پذیرائی اور فوک میوزک کے بادشاہ استاد شبیر خان گلو کے اعزاز میں ایک میوزک شام کا انعقاد مورخہ تئیس اکتوبر کو برمنگھم میں کیا گیا جس میں استاد شبیر خان گلو، محترم صابر رضا صاحب اور بشارت بیگ نے اپنے خوبصورت گیتوں سے محفل کو چار چاند لگائے پروگرام کی نظامت مایہ ناز براڈ کاسٹر محمد ایوب کلیار نے کی جبکہ دیگر انتظامی زمہ داریاں وقار عظیم گوندل نے نبھاہیں۔ پروگرام کے اختتام پہ پر تکلف دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔

(ادارہ)

غزلیات

حمدیہ و دعائیہ غزل

ضیاء اللہ مبشر

نہاں کو وہ عیاں کردے نشاں کو بے نشاں کردے
اگر چاہے تو حرفِ کُن سے ذرّے کو جہاں کردے
وہ جب چاہے ستاروں کو پرو دے کہکشاؤں میں
وہ جب چاہے تہہ و بالا زمین و آسمان کردے
کبھی وہ زیر کر ڈالے ابابیلوں سے دشمن کو
کبھی مکڑی کے جالے کو پیاروں کی اماں کردے
کبھی شق القمر دلبر کی انگلی کے اشارے پر
کبھی اک مشت بھر مٹی عدو پر امتحاں کر دے
کبھی جعفر کے بکروٹے سے لشکر کی شکم سیری
کبھی اک دودھ کا پیالہ ہریرہؓ کو نشاں کردے
کبھی پانی کی موجوں میں بہا دے کبرِ فرعونی
کبھی پانی کی موجوں کو وہ موسیٰ کی اماں کردے
کبھی وہ پتھروں کو چیر کر پانی بہا ڈالے
کبھی اک دم میں ان کو آتشیں سیلِ رواں کردے
کبھی مچھلی میں یونس کو، کبھی سولی پہ عیسیٰ کو
کبھی آتش میں ابراہیم کو زندہ نشاں کردے
کبھی عاد و ثمود و لوط کی قومیں مٹا ڈالے
کبھی وہ نوح کی کشتی کو دنیا کی اماں کردے
کبھی اپنے مسیحا کو نشاں دے رحمتوں والا
کبھی لیکھو کا گھر اس کے لئے ماتم کناں کردے
کبھی طاہر کے گریہ سے کرے فرعون کے ٹکڑے
کبھی مسرور کے ہاتھوں زمانے کی عناں کردے
اسی کی نگہ خوشنودی امر کر دے مقدر کو
اسی کا غیظ سلطانوں کو گردِ کارواں کردے
سبھی پھل پھول گلشن کے اسی کے حسن کی خوشبو
وہی اک بیج سے اک بیج تک فصلِ رواں کردے
وہی گنجِ گراں مایہ ہے ہم کو جان سے پیارا
اسی دلدار پہ نظرِ متاعِ کل جہاں کردے
وہ نچلے آسماں پر ہے سحر سے اک پہر پہلے
اُٹھو! شاید یہی لمحہ اَمر تیری فغاں کردے
مرے مولا تیری چاہت چھپے گی کب تلک دل میں
اُٹھا دے قدغنیں اب تو مجھے اذنِ اذاں کردے
بہت آلام جھیلے ہیں تری راہ کے اسیروں نے
اب ان پیاروں پہ اپنی رحمتوں کا سائباں کردے
شہیدوں کے لہو سے جو وفا کے دیپ ہیں روشن
تو ان جلتے چراغوں کو ضیا پاشِ زماں کردے
تمہارے نام پر دل کو ملے جو زخم غیروں سے
انہی زخموں کو میرے واسطے آرامِ جاں کردے
درِ امید پر بیٹھا ہوں تیرا منتظر کب سے
نوید وصل کے مجھ کو اشارے مہرباں کردے

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جہانداد منظر القادری

ممکن نہیں ملے وہ بشر کی زبان میں
لاؤں کہاں سے حرف کوئی ان کی شان میں
دھرتے ہیں ہاتھ دل پہ بصد احترام ہم
آئے جو ان کا اسم، کسی بھی اذان میں
خوشبو نشاں نہ کیوں ہوں یہ گل پھول باغ کے
ان کو مگس درود سناتی ہے کان میں
خیراتِ نورِ گنبدِ خضریٰ کی دین ہیں
مہر و مہ و نجوم مرے آسمان میں
بیٹی سنا رہی ہے مجھے نعتِ مصطفیٰ
صد شکر آ گئی یہ ترے سائبان میں
اور پھر سنا کے نعت تری پوچھتی ہے یہ
آئیں گے کب جناب ہمارے مکان میں
صلو علی النبی کی صداؤں کا فیض سے
رہتی ہے ان کی ذات سدا میرے دھیان میں
اس میں بھی کوئی راز ہے سدرہ کے بعد بھی
چلتے چلے گئے تھے نبی، لامکان میں
تصدیق کر رہا یہ ادنیٰ کا حرف حرف
کوئی نہ تیسرا تھا وہاں درمیان میں
ممکن تھی یہ دعا بھی فقط آپ سے حضور
رکھے خدا عدو کو بھی اپنی امان میں
دیکھیں تو دیکھتے ہی رہیں منظرِ حسین
اک سبز سبز نور ہے رحمت نشان میں

نامعلوم

سمٹتی جائے گی ہر رہگزر آہستہ آہستہ
چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ
کسی کونپل کو نہ کچلو کسی پتی کو نہ مسلو
ہے سایہ دار بنتا ہر شجر آہستہ آہستہ
کبھی ترکِ تعلق کی نہ دل میں سوچ بھی لانا
ہیں دل آپس میں مل جاتے مگر آہستہ آہستہ

انا کی آندھیاں ان کی ہیں دیواریں ہلا دیتیں
پھر آخر ٹوٹتے جاتے ہیں گھر آہستہ آہستہ
کوئی بستی اُجڑنے کو بس اک ساعت ہی کافی ہے
مگر آباد ہوتے ہیں نگر آہستہ آہستہ
کبھی یک لخت تکمیلِ محبت ہو نہیں سکتی
کیا کرتے ہیں جذبے بھی اثر آہستہ آہستہ
ابھی تو سامنے نظروں کے نظاروں کی دنیا ہے
کسی منظر پہ ٹھہرے گی نظر آہستہ آہستہ
یہ دنیا ہے یہاں ہر کام تدریجاً ہی ہوتا ہے
ہے بنتا آدمی سے بھی بشر آہستہ آہستہ
جمالِ لم یزل کی جس پہ بھی نظرِ کرم ہووے
وہ ہوتا خوب سے ہے خوب تر آہستہ آہستہ
اُڑا نہیں سارا دن بھرتے رہے جو شام ڈھلتے ہی
سمٹتے جا رہے ہیں ان کے پر آہستہ آہستہ
کبھی یوں بھی ہوا دن بھر ہنسی کی دولتیں بانٹیں
مگر روتے رہے ہیں رات بھر آہستہ آہستہ
کسی اکڑی ہوئی گردن پہ گر شفقت کی مالش ہو
تو خود سر بھی جھکا دیتے ہیں سر آہستہ آہستہ
"چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا، موجِ حوادث سے"
کہ آ جاتا ہے جینے کا ہنر آہستہ آہستہ
ضمیرِ دل کو گر ہم لوریاں دے کر سلا ڈالیں
ہے مٹ جاتی تمیزِ خیر و شر آہستہ آہستہ
شبِ تیرہ کی تاریکی بجا لیکن ذرا سوچو
نکلتی ہے پھر اس سے ہی سحر آہستہ آہستہ

سید توقیر

زخمِ اُلفت کا سہی دل پہ لگا ہے تو سہی
یہ ہوا کیسے ہوا سو جو ہوا ہے تو سہی
سامنا گردشِ دوراں کا بھی کرنا ہے اسے
پھول کانٹوں میں سرِ شاخ کھلا ہے تو سہی
جانئے اس کے دل و جاں پہ اثر ہو کہ نہ ہو
حالِ دل ہم نے ستم گر سے کہا ہے تو سہی
اک طلاطم سا رگ و پے میں ہے ہر لحظہ
نشۂ عشق بہر طور چڑھا ہے تو سہی
ہم نے بھی دیکھا تھا اس شوخ کو یونہی رُک کر
وہ بھی کچھ دیر کو توقیر رُکا ہے تو سہی

عبدالصمد قریشی

کبھی تنہائی میں اور شام کے سناٹوں میں
وہ حسیں باتیں اُسے بھی تو رُلاتی ہوں گی
اُس کی پلکوں کے دیئے بھی تو سُلگتے ہوں گے
بھیگی برساتیں اُسے بھی تو جلاتی ہوں گی
وہ بھی ماضی کے اُجالوں میں بھٹکتا ہوگا
چاندنی راتیں اُسے بھی تو جگاتی ہوں گی
تتلیاں اب بھی اُسی شاخ سے لپٹتی ہوں گی
اس پہ بے تاب سی پریاں بھی تو آتی ہوں گی

ساغر صدیقی

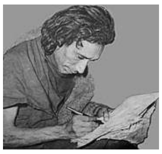

وہ بلائیں تو کیا تماشا ہو
ہم نہ جائیں تو کیا تماشا ہو
یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
بندہ پرور جو ہم پہ گزری ہے
ہم بتائیں تو کیا تماشا ہو
آج ہم بھی تری وفاؤں پر
مسکرائیں تو کیا تماشا ہو
تیری صورت جو اتفاق سے ہم
بھول جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغرؔ
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

پروین شاکر

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی
تیرا پہلو تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی
اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

قتیل شفائی

وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دُعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے
یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی سے
خدا کسی سے کسی کو مگر جدا نہ کرے
وہ خدا ہے کسی ٹوٹے ہوئے دل میں ہوگا
مسجد میں اُسے ڈھونڈ نہ کلیساؤں میں
ہم کو آپس میں محبت نہیں کرنے دیتے
اِک یہی عیب ہے اس شہر کے خداؤں میں

ترکِ اُلفت کی قسم بھی کوئی ہوتی ہے قسم
تو کبھی یاد تو کر بھولنے والے مجھ کو

اب تو راہ نہ بھولو گے تم اب تو ہم سے آن ملو
دیکھو ہم نے پلک پلک پر سو سو دیپ جلائے ہیں
ہائے قتیل اس تنہائی میں کیا سوجھی ہے موسم کو
جس دن سے وہ پاس نہیں اس دن سے بادل چھائے ہیں

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

زندگی اپنی گنہگارِ محبت ہی سہی
کوئی ایسا ہے جو پہلا اُسے پتھر مارے
ربط اتنا نہ بڑھا اس بُت کافر سے قتیلؔ
مار ڈالیں گے تجھے مل کے یہ مسلماں سارے

پکڑا ہی گیا ہوں تو مجھے دار پہ کھینچو
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا
دنیا میں اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

کیا عشق تھا جو باعثِ رُسوائی بن گیا
یارو تمام شہر تماشائی بن گیا

بن مانگے مل گئے مجھے راتوں کے رت جگے
میں جب سے ایک چاند کا شیدائی بن گیا

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

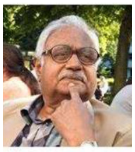

مسعود منور

خزاں کو گلستاں کرنا ہے ہم نے
چمن کو ہم زباں کرنا ہے ہم نے
جسے کہتا ہے غم سارا زمانہ
اسی کو حرزِ جاں کرنا ہے ہم نے
ستاروں پہ کمندیں ڈالنی ہیں
زمیں کو آسماں کرنا ہے ہم نے
اکیلا پن کہاں تک ساتھ دے گا
غموں کو کارواں کرنا ہے ہم نے
نئے انداز میں بھرنی ہے پرواز
ہوا پہ آشیاں کرنا ہے ہم نے
شکستہ کشتی پہ ان بازوؤں کو
ہمیشہ بادباں کرنا ہے ہم نے
جسے اک اشک کہتا ہے زمانہ
اسی کو بیکراں کرنا ہے ہم نے
شکستہ جام کی سب کرچیوں کو
دوبارہ ایک جاں کرنا ہے ہم نے
کڑکتی دھوپ کے صحرا میں مسعودؔ
بدن کو سائباں کرنا ہے ہم نے

سید معراج جامی

نادیدنی تحریر سے میں خوف زدہ ہوں
ہاں اپنی ہی تقدیر سے میں خوف زدہ ہوں
دیکھا تھا کبھی خواب محبت کا سہانا
اُس خواب کی تعبیر سے میں خوف زدہ ہوں
مجھ کو مرے لفظوں ہی سے وہ مات ہوئی ہے
اب اپنی ہی تحریر سے میں خوف زدہ ہوں
جس مہر کی تنویر سے ہر داغ اُبھر آئے
اُس مہر کی تنویر سے میں خوف زدہ ہوں
جھنکار صدا دیتی ہے پھر سنگ زنوں کو
پھر پاؤں کی زنجیر سے میں خوف زدہ ہوں
حیران ہوا جاتا ہوں آئینہ اُٹھا کر
کیا اپنی ہی تصویر سے میں خوف زدہ ہوں
کیا شہرِ ملامت سے گزرنا نہیں ہوگا
کیوں اپنی ہی تشہیر سے میں خوف زدہ ہوں
تقدیر کی بندش کوئی بندش نہیں رکھتی
ہاں اپنی ہی تقدیر سے میں خوف زدہ ہوں
جس شہر کی تعمیر ہو تخریب پہ جامیؔ
اس شہر کی تعمیر سے میں خوف زدہ ہوں

وسیم بٹ نیروبی

حکم صادر ہواؤں کا ہوگا
رنگ سہا گھٹاؤں کا ہوگا
بادلوں میں رہیں گے اور یہاں
اک بسیرا دعاؤں کا ہوگا
اس زمیں پر نہ بھاگ پائیں گے
زخم ہوگا تو پاؤں کا ہوگا
کوئی باشندہ گھر نہ لوٹے گا
سامنا جب قضاؤں کا ہو گا
موت کھیلے گی اور جدا اسلوب
زندگی کی اداؤں کا ہوگا

حباب ہاشمی الہ آباد

حریص طعنۂ اغیار رہنا
غریقِ لذتِ آزار رہنا

بہر صورت نہیں خطرے سے خالی
قریب سایۂ دیوار رہنا
ہمارے واسطے کچھ کم نہیں ہے
نگا ہوں میں کسی کی خار رہنا
سراپا عجز رہنا ہے سعادت
مگر ایسے میں بھی خوددار رہنا
لچکنا شاخِ گل کی طرح لیکن
عدو کے سامنے تلوار رہنا
خرد کو خود ہی بغلیں جھانکتی ہیں
جنوں سے بر سرِ پیکار رہنا
حبابؔ اس دور میں آساں نہیں ہے
کسی کا صاحبِ کردار رہنا

صدیقہ شبنم لندن

کوچہ کوچہ آرزو کے شہر میں چرچا رہا
میرا ذوقِ جستجو بھی کس قدر رُسوا رہا
یاد کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اس طرح
بس نظر کے سامنے وہ ایک ہی چہرہ رہا
گو کہ اپنی ذات سے ہے یہ سراپا انجمن
محفلوں میں دل مرا لیکن بہت تنہا رہا
رات کی انجانی طاقت سے ہراساں لوگ تھے
سب کے ذہنوں میں مسلط خوف کا سایہ رہا
ہم خود اپنی ذات سے شبنمؔ نہ کھل کے مل سکے
مصلحت اندیشوں کا درمیاں پردہ رہا

رؤف خیر آبادی

کہاں سے روکتا ہے یہ پردۂ غبار مجھے
کہ دیکھنا ہے پہاڑوں کے آر پار مجھے
مرے سوا کوئی پورا کہاں اُترتا ہے
بہت ٹٹول چکی ہے نگاہِ یار مجھے
جو پارسا تھا مجھے پارسا نہیں سمجھا
گناہگار نے سمجھا گنہگار مجھے
اسی لئے تو برابر کی چوٹ چلتا ہوں
یہاں کہیں کا نہ رکھے گا انکسار مجھے
خدا گواہ کہ قائل تو میں قصاص کا ہوں
ہے خوں بہا کا بھی ہر چند اختیار مجھے
میں دُشمنی کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا
سو راس آتا ہے یہ بھی تو کاروبار مجھے
وہ ہو تو ہو کوئی مجبور خیرؔ میں تو نہیں
پائے گا تو کسی کا گلہ گزار مجھے

زہرہ نگاہ۔کلام

سُنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سُنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے
تو وہ حملہ نہیں کرتا
سُنا ہے جب کسی ندی کے پانی میں
پرندے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اُس کو پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوّے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہیں
سُنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو سارا
جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑ آجائے
کوئی پُل ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
سُنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوندا، جلیل و معتبر، دانا و بینا منصف و اکبر
ہمارے شہر میں اب
جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر

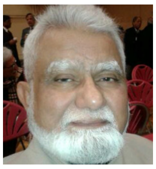

غالب ماجدی لندن

میں چاہتا ہوں معذرت میرا نہ چھاپئے
گوشے میں رہنے دیجئے گوشہ نہ چھاپئے
ہمدرد میرے آپ ہیں مخلص ہیں دوست ہیں
صد شکر ہے کہ آپ نے پوچھا نہ چھاپیے
مجھ کو نہیں پسند کہوں دوستوں سے میں
لکھو میرا قصیدہ، قصیدہ نہ چھاپیے
خود سے کوئی لکھے مجھے اچھا برا بھلے
وہ چھاپیے پہ اس کے علاوہ نہ چھاپئے
جس کو کہیں کہ شعر ہے اب تک نہیں کہا
تُک بندیوں کا میری پلندہ نہ چھاپئے
شاعر نہیں حقیر سا خادم ادب کا ہوں
اہل سخن میں نام تو میرا نہ چھاپئے
رسوا کرے گی شاعری مجھ کو خبر نہ تھی
اُفتاد طبع غالب رسوا نہ چھاپئے

ساحر شیوی

امن کا نشان ہے اردو
سب کی ہی ترجمان ہے اردو
ناز کیونکر نہ ہو ہمیں اس پر
شاعروں کی زباں ہے اردو
آج محسود روزگار ہے تو
تیری کیا آن بان ہے اردو

جو زبانیں یہاں مروج ہیں
سب میں میٹھی زبان ہے اردو
طرز و تحریر کی روانی سے
کچھ عجب تیری شان ہے اردو
چھا گئی ہے تمام عالم پر
اور اب بھی جوان ہے اُردو
ہر حقیقت شناس کہتا ہے
ملک و ملت کی شان ہے اردو
اس سے محفوظ ہے یہاں کا ادب
ساحؔر کی پاسبان ہے اُردو

بخش لائلپوری

پندار ورعونت کا پیکر
ہر پیر مغاں کی ہستی ہے
مسجد میں درس فقیری کا
حجرے میں عیش پرستی ہے
ہر دین مبین کی مسند پر
بے دینوں کی خرمستی ہے
یہ مُلاّ جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
صدیوں کے پرانے معبد پر
اک دنیا نئی آباد کرو
ہر چور یہاں کا رہبر ہے
ہر پیر ہوس کا بندہ ہے
ہر دل میں زہر تعصب کا
ہر سر میں جنوں کا پھندا ہے
ہر علم وادب کے مکتب میں
کج ذہن کی بالا دستی ہے
یہ مُلاّ جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
اس فکر ونظر کے گلشن کو
گُل چینوں سے آزاد کرو
یہ فسق وفسوں کی محفل ہے
ہر جسم یہاں کا گندہ ہے
تم مردِ خدا جسے کہتے ہو
وہ اپنے نفس کا بندہ ہے
یہ کذب بیانی کا مرقد
یہ ایمانوں کی پستی ہے
یہ مُلاّ جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
تبلیغِ جنوں کے پنجوں سے
انسانوں کو آزاد کرو
چہروں پہ نمائش کی داڑھی
بغلوں میں ریا کا خنجر ہے
اخلاق کی مردہ لاشوں پر
یہ حرص وہوا کا مندر ہے
ہر سانس گراں ہے جینے کی
اور موت یہاں پر سستی ہے
یہ مُلاّ جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
نظروں کے دریچے چھلنی ہیں
اوہام کے رنگیں خاروں سے
وحشت کی صدائیں آتی ہیں
اس بستی کے بازاروں سے
یہ شرک وشر کی دنیا ہے
انساں کی تیرہ بختی ہے
یہ مُلاّ جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
صدیوں کے پرانے معبد پر
اک دنیا نئی آباد کرو

نُزہت انجم گورکھپور

قرض غم کا چکانا پڑا ہے
رو کے بھی مسکرانا پڑا ہے
سچ کو سچ کہہ دیا تھا اسی پر
میرے پیچھے زمانہ پڑا ہے
اِک خدا کے آگے نہ جھکے تو
در بدر سر جھکانا پڑا ہے
تجھ کو اپنا بنانے کی خاطر
سب کو اپنا بنانا پڑا ہے
کیا بتائیں کہ کن مشکلوں میں
زندگی کو نبھانا پڑا ہے
سنگدل جو ہیں مشہور نُزہتؔ
شعر اُن کو سنانا پڑا ہے

فرخندہ رضوی

بے نور سمندر میں پڑا ہے کیسے
آفاق پہ یہ چاند چھپا ہے کیسے
مجھ کو بھی یہی فکر لگی ہے اب تو
وہ شخص مجھے بھول گیا ہو جیسے
سب لوگ ترقی میں لگے ہیں تو پھر
برباد سبھی شہر ہوا ہے کیسے
ظلمت سے نہیں کوئی تعلق تیرا
دامن پہ ترے داغ لگا ہے کیسے
ہر سمت چراغوں کے اُجالے ہیں پھر
دل میرا سرِ شام بُجھا ہے کیسے
فرخندہؔ خزاں کا ہی اگر ہے موسم
گھر میرا گلابوں سے سجا ہے کیسے

ڈاکٹر راشد متین

کیا بستی تھی کون گلی گھر بھول گیا
دستک دینا چاہی تو در بھول گیا
رنگ پکڑنے نکلا تھا جو تتلی کے
بچہ رستے کے سارے ڈر بھول گیا
وقت سے پہلے ہجرت کا اعلان ہوا
ایک پرندہ عجلت میں پر بھول گیا
سوم کلی نے کیاری میں انگڑائی لی
سورج بھی کرنوں کے نشتر بھول گیا
ہری ڈال اور بارش دونوں جوبن پر
میں کھڑکی میں آنکھیں رکھ کر بھول گیا
شیش بدن کا کوندا لپکا آنگن میں
اس کے بعد کا سارا منظر بھول گیا

ثاقبؔ زیروی

دنیا کو نہ محبوب نہ مطلوب ہوا ہوں
میں آپؐ کا ہوں آپؐ سے منسوب ہوا ہوں
کل تک مرے سائے سے لرز جاتا تھا سورج
آج اپنے ہی سائے سے میں مرعوب ہوا ہوں
کل تک مرا دامن تھا فرشتوں کی جبینیں
آج اپنی ہی نگاہوں میں معیوب ہوا ہوں
ہر رنگ میں پہچانتا ہوں اُن کی تجلّی
یوں ہوش میں رہتے ہوئے مجذوب ہوا ہوں
کس شہر میں ہیں ان کے تلطف کی ہوائیں
میں دیدۂ حالات کا معتوب ہوا ہوں
توفیق بھی دے، ظرف بھی دے، تابِ نظر بھی
کیوں اپنی تجلّی ہی سے محجوب ہوا ہوں
پھر میرے خیالوں کی مسیحائی کو آجا
میں دارِ خیالات پہ مصلوب ہوا ہوں
ہے عشق مجھے شاہدِ لولاکؐ سے ثاقبؔ
کیوں ظلمتِ ایام کو مرغوب ہوا ہوں

احمد فراز

کسی جانب سے بھی پرچم نہ لہو کا نکلا
اب کہ موسم میں بھی عالم وہی ہُو کا نکلا
دستِ قاتل سے کچھ امیدِ شفا تھی، لیکن
نوکِ خنجر سے بھی کانٹا نہ گلو کا نکلا
عشق الزام لگاتا تھا ہوس پر کیا کیا
یہ منافق بھی ترے وصل کا بھوکا نکلا
جی نہیں چاہتا میخانے کو جائیں، جب سے
شیخ بھی بزم نشیں اہلِ سبو کا نکلا
دل کو ہم چھوڑ کے دنیا کی طرف آئے تھے
یہ شبستاں بھی اسی غالیہ مُو کا نکلا
ہم عبث سوزن و رشتہ لئے گلیوں میں پھرے
کسی دل میں نہ کوئی کام رفو کا نکلا
یارِ بے فیض سے کیوں ہم کو توقع تھی فرازؔ
جو نہ اپنا نہ ہمارا نہ عدو کا نکلا

ناصر کاظمی

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست
تو مصیبت میں عجب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل میں
پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا
تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مر رہیں گے اگر اب یاد آیا
حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رُخصت ہوا تب یاد آیا
بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصرؔ
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

نورالجمیل نجمی

ہو رہی ہے یہ گفتگو مجھ میں
کون پھرتا ہے بے وضو مجھ میں
اک طرف نور اک طرف ظلمت
جنگ جاری ہے چار سو مجھ میں
ایک مجذوب تیری یادوں کا
رقص کرتا ہے کُو بہ کُو مجھ میں
مِیل بہ مِیل دوڑتا جائے
کون ایسا ہے تُند خو مجھ میں
دیکھ کر آنکھ محو حیرت ہوں
کون بھرتا ہے یہ صبو مجھ میں
نیم شب ایک ہٹ دھرم آنسو
ہوئے بیٹھا ہے قبلہ رُو مجھ میں
مثلِ خوشبو ہے سانس میں شامل
یعنی مہکا رہا تُو مجھ میں
پہلے بس ایک زخم چیختا تھا
ہوگیا شور ہی شروع مجھ میں
ہورہی ہے شکست سے دوچار
جیت جانے کی آرزو مجھ میں
نفس آکاس بیل ہے نجمیؔ
جس سے ہوتی نہیں نمو مجھ میں

عبدالجلیل عباد جرمنی

اُسکے در کے فقیر ہیں صاحب
اس لئے ہی امیر ہیں صاحب
ہم بھی ہر روز بانٹتے ہیں
شعر اپنی جاگیر ہیں صاحب
عشق میں مبتلا ہیں ہم صاحب
گاتے ہر روز ہیر ہیں صاحب
پڑھ لو ہم کو کبھی بھی تم صاحب۔
جا بجا ہم تحریر ہیں صاحب
جن کو کرسی کی ہو پڑی صاحب
ہم نہیں وہ امیر ہیں صاحب
کجکلاہی میں جو پڑے صاحب
وہ انا کے اسیر ہیں صاحب
تلخیاں بھر گئیں بہت صاحب
لہجے اب تو چیر ہیں صاحب
رِستا رہتا ہے خون یہ صاحب
کیا کریں دل میں تیر ہیں صاحب
آپ سے پیار ہے بہت صاحب
آپ تو میرے پیر ہیں صاحب
چار سُو اندھیر ہے صاحب
روشنی کی لکیر ہیں صاحب
آنکھیں جو خواب دیکھتیں صاحب
آپ اُن کی تعبیر ہیں صاحب
قافلہ عشق کا جو ہے صاحب
عبادؔ اس کے اسیر ہیں صاحب

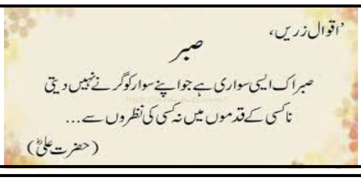
اقوالِ زریں،
صبر
صبر اک ایسی سواری ہے جو اپنے سوار کو گرنے نہیں دیتی
نا کسی کے قدموں میں نہ کسی کی نظروں سے...
(حضرت علیؓ)

ڈاکٹر محمد عقیل اظہر، امریکہ

میرے مولا یہ کیسی بستی ہے؟
زندگی یہاں کیوں سستی ہے؟
ایسی ہستی کی کوئی ہستی ہے
ہر طرف آگ سی برستی ہے
امن کو انسانیت ترستی ہے
جا بہ جا نفرتوں کے میلے ہیں
چند انساں ہیں جو اکیلے ہیں
میرے آقا میرے محمدؐ نے
صلح پیار کا پیغام دیا
موسیٰ عیسیٰ تو نے کہلایا
کرشن بھگوان نے بھی سمجھایا
پیار ہے زندگی، زندگی ہے پیار
جتنے آئے ہیں پیغمبر اوتار
سب کا پیغام سویرا ہے
ظلمتوں کا یاں بسیرا ہے
آج اتنا تو پوچھ لینے دو
کیا یہ قصور میرا ہے

جون ایلیا

تمہاری یاد سے جب ہم گزرنے لگتے ہیں
جو کوئی کام نہ ہو بس وہ ہی کرنے لگتے ہیں
تمہارے آئینۂ ذات کے تصور میں
ہم اپنے آئینے آگے سنورنے لگتے ہیں
تمہارے کوچۂ جاں بخش کے قلندر بھی
عجیب لوگ ہیں ہر لمحہ مرنے لگتے ہیں
ہم اپنے حالتِ بے حالئ اذیت میں
نہ جانے کس کو، کسے یاد کرنے لگتے ہیں
یہاں میں ذکر نہیں کر رہا مکینوں کا
کبھی کبھی در و دیوار مرنے لگتے ہیں

عدیم ہاشمی

پھر بھی بیٹھی ہے خزاں باغ کی دیوار کے ساتھ
جبکہ پتا بھی نہیں ہے کوئی اشجار کے ساتھ
تم بڑے لوگ ہو سیدھے ہی گزر جاتے ہو
ورنہ کچھ تنگ سی گلیاں بھی ہیں بازار کے ساتھ
مرے اشکوں پہ تجھے اتنا تعجب کیوں ہے
تو نے چشمے نہیں دیکھے کبھی کہسار کے ساتھ ؟
میں نے پہچان لیا دور سے گھر تیرا ہے
پھول لپٹے ہوئے دیکھے جہاں دیوار کے ساتھ
لفظ نشتر کی طرح دل میں اُتر جاتے ہیں
خط محبت کا بھی لکھتا ہے وہ تلوار کے ساتھ

ثمینہ راجہ

رو لیجئے کہ پھر کوئی غمخوار ہو نہ ہو
ان آنسوؤں کا اور خریدار ہو نہ ہو
کچھ روز میں یہ زخم چراغوں سے جل بجھیں
کچھ روز میں یہ گرمئ بازار ہو نہ ہو
عجلت بہت ہے آپ کو جانے کی جایئے
لوٹیں تو پھر یہ عشق کا آزار ہو نہ ہو
سو جائے تھک کے پچھلے پہر چشمِ انتظار
اور کیا خبر کہ بعد میں بیدار ہو نہ ہو
دل کو بہت غرور کشیدہ سری بھی ہے!
پھر سامنے یہ سنگِ درِ یار ہو نہ ہو

ساحر لدھیانوی

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے
ٹوٹا طلسم عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ رُوح کا ساماں نہ کر سکے

رُخسانہ رخشی

بچا کے رکھ لو میرا غم شگفتگی کی طرح
گزر نہ جائے یہ موسم بھی زندگی کی طرح
جو لوگ شہر کے ماتھے پہ جگمگاتے تھے
بھٹک رہے ہیں سرِ دشت چاندنی کی طرح
اگر تو اپنے دکھوں سے نواز دے مجھ کو
قبول ہے یہ عنایت بھی زندگی کی طرح
کسی سے ٹوٹ کر ملنا تو خیر کیا ہوگا
ہم اپنے آپ سے ملتے ہیں اجنبی کی طرح
ہزار مشعل رُخسار کو اُٹھائے ہوئے
گزر گیا وہ اندھیروں سے روشنی کی طرح
زمانہ ساز نظر کی سلیقگی رخشی
کبھی کسی کی طرح ہے کبھی کسی کی طرح

منیر نیازی

اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیئے
پھر اس کی خاک کو بھی اُڑا دینا چاہیئے
ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اُس زمین پر اُٹھا دینا چاہیئے
حد سے گزر گئی ہے یہاں رسمِ قاہری
اس دہر کو اب اس کی سزا دینا چاہیئے
اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو ان کے گھر میں ذرا آنا چاہیئے
گُم ہو چلے ہو تم تو بہت خود میں اے منیرؔ
دنیا کو کچھ تو اپنا پتہ دینا چاہیئے

سید ریاست عباس رضوی دہلوی

زندگی سب کی یادوں میں بسر ہوتی ہے
شام سے رات خیالوں میں سحر ہوتی ہے
ملک تقسیم ہوا لوگ بھی تقسیم ہوئے
اپنے بچھڑے تو گزر جانے کدھر ہوتی ہے
چھوٹے بہن بھائی ماں باپ اقارب سارے
اب تو غیروں میں صبح شام ادھر ہوتی ہے
خوش نصیبی کہ مرے ساتھ مرے اپنے ہیں
ورنہ پردیس میں غیروں سی بسر ہوتی ہے!!
بے لباسی پہ ریاست نہیں کوئی قدغن
شیروانی پہ مری سب کی نظر ہوتی ہے

زاہد عظمت

چاہا جسے وہ تھا کہیں انجم کے درمیاں
حائل خلا رہے مرے محرم کے درمیاں
دل سے اُٹھیں شعلے گریں اشک بن کے شبنم
میں جل گیا ہوں شعلہ و شبنم کے درمیاں
ملتا ہے تبسم سے مگر رکھتا ہے کدورت
اُلجھا پڑا ہوں دشمن و ہمدم کے درمیاں
حیراں ہوں تذبذب میں ہوں رووُں کہ یا ہنسوں
پائی حیات فرحت و ماتم کے درمیاں
عظمتؔ ہوا ہے اچھا یہی کہ دنیا تو گول ہے
بچھڑا ملے وہ شاید کسی سنگھم کے درمیاں

آغا محمد سعید

پھر رنگِ بہاراں میں تقدیر نظر آئی
زنداں جو نظر آیا زنجیر نظر آئی
بکھرے ہیں نشیمن کے تنکے جو گلستاں میں
تخریب کے پردے میں تعمیر نظر آئی
یوں محوِ تماشا ہوں اس حسن پری وش کا
جس سمت نظر اُٹھی تصویر نظر آئی
جب غور کیا میں نے تخلیق خدائی پر
ہر ذرّۂ فطرت میں تفسیر نظر آئی
دن رات حوادث کے رازوں میں سعیدؔ ہم کو
خود اپنے خیالوں کی تعبیر نظر آئی

کوئی جھوٹا نہیں شفیق مراد
سارے سچے ہیں کیا تماشہ ہے

عطاء الحق

دُکھ کے نشتر سہتا ہوں
پھر بھی ہنستا رہتا ہوں
میں جھوٹوں کی دنیا میں
سچی باتیں کہتا ہوں
جب بھی بارش ہوتی ہے
میں پیاسا ہی رہتا ہوں
اندھیاروں کی بستی میں
جگنو بن کر رہتا ہوں
کوئی کہہ دے پیاسوں سے
میں بھی پیاسا رہتا ہوں
حقؔ میں اپنے شعروں میں
دل کی باتیں کہتا ہوں

بہادر شاہ ظفر

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جاناں نہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا؟ نہ بنایا ہوتا!!
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا، ہوتا
شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اُس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

اسحاق عاجز جرمنی

تابشِ عشقِ محمدؐ ملی اُن کے دوارے
اور وہاں ہم نے کئے رحمتِ باری کے نظارے
ناقص و بے کس و بے علم تھا نادار تھا میں
روشنی پائی فقط مہرِ عربؐ کے سہارے
ہیں فقط آج بھی اپنا تو وہی سرمایہ
ہم نے لمحات جو قدموں میں گزارے پیارے
آپ کی چاہ میں گرفتار مرے روح و بدن
منتظر ہیں کہ ملیں دید کے دوبارہ اشارے
آرزو ہے کہ لپٹ کر تیری خاکِ پا سے
اشک آنکھوں چھپے ہیں جو بہالوں سارے
ہے شب و روز دعا قادرِ مطلق سے یہی
پھر وہ راہ میرے لئے بطحا کی سنوارے
حشر کے روز جو کر دیں گے شفاعت آقا
پھر تو عاجز کے بھی ہو جائیں گے وارے نیارے

نذیر قیصر

میں راکھ ہوتا گیا اور چراغ جلتا رہا
چراغ جلتا رہا آسماں پگھلتا رہا
میں بوند بوند جلا وصل کے کنارے پر
وہ لہر لہر بدن کروٹیں بدلتا رہا
لگی تھی آگ درختوں کے پار دریا میں
میں دیکھتا رہا اور آفتاب ڈھلتا رہا
بس ایک شام سرِ دشت کربلا اُتری
پھر اُس کے بعد گھروں سے علَم نکلتا رہا
گلاب بہتا رہا خواہشوں کے پانی میں
ہوائیں چلتی رہیں اور دیا مچلتا رہا
عجب سفر تھا مرے اس کے درمیاں قیصرؔ
غبار اُڑتا رہا اور ستارا چلتا رہا

سبینہ سحر

عاشقی جب سنوارتی ہے مجھے
زندگی تب نکھارتی ہے مجھے
موت دُلہن بنی ہے میرے لئے
دل کی دھڑکن پکارتی ہے مجھے
غمِ دوراں میں دن تو کٹ جائے
ہجر کی رات مارتی ہے مجھے
حسن کا ہے مجھے غرور بہت
تیری چاہت سہارتی ہے مجھے
موت کے پہلو میں جو زندہ رہوں
زندگی ہی گزارتی ہے مجھے
روشنی کا غرور ہوں میں سحرؔ
شب کی تنہائی مارتی ہے مجھے

ا۔ب۔ناصر

بیمار رو رہے ہیں مسیحا نہیں رہا
انسانیت کا خادمِ اعلیٰ نہیں رہا
ہمدرد خون بہہ گیا بستی کی خاک پر
دکھیوں کے درد بانٹنے والا نہیں رہا
ممکن نہیں ہے بہتے ہوئے اشک تھامنا
اب اختیار دل پہ ہمارا نہیں رہا

پیارے خدا نے چُن لیا تازہ حسین پھول
دنیا میں اب وہ آنکھ کا تارا نہیں رہا
وہ زندہ جاوداں ہے ملائک کی گود میں
کہنا نہیں اُسے وہ زندہ نہیں رہا
کیوں ڈالتے ہو ہاتھ کلیجوں کو ظالمو
کیوں تم کو کوئی خوفِ مولیٰ نہیں رہا
ظالم دلوں پہ لگ گئی ہے مہرِ بے حسی
اب کوئی سننے دیکھنے والا نہیں رہا
پتھر سی ہوگئیں ہیں زبانیں ہر ایک کی
بستی میں کوئی بولنے والا نہیں رہا
اپنا سب احتجاج ہے مولا ترے حضور
تیرے بغیر کوئی سہارا نہیں رہا
آئے نہ اور کوئی بھی ایسی خبر کبھی
اب اور درد سہنے کا یارا نہیں رہا

حفیظ جونپوری

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے
لُٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اِس طرح کی بھی کہیں راہ زنی ہوتی ہے
مے کشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے
پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظؔ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

مسلم سلیم

محبوب کے نام

یہ جسم کرتا ہے اکثر بہت سوال ترا
رگوں میں دوڑنے لگتا ہے جب خیال ترا
قدم بچا کے رکھوں میں اگر تو کیسے رکھوں
ہر ایک سمت تو پھیلا ہوا ہے جال ترا
قریب سے جو بچا کر نظر نکلتے ہیں
ذرا سنبھل، یہی پوچھیں گے حال چال ترا
چلا سفر پر جو تو اُن کی راہ سے ہٹ کر
تو آج دیکھ لے کیا ہو گیا ہے حال ترا

حبیب جالب

اے چاند یہاں نکلا نہ کر
بے نام سے سپنے دکھلا کر
یہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے
اس دیس میں اندھے حاکم ہیں
نہ ڈرتے ہیں نہ نادم ہیں
نہ لوگوں کے وہ خادم ہیں
ہے یہاں یہ کاروبار بہت
اس دیس میں گردے بکتے ہیں
کچھ لوگ ہیں عالیشان بہت
اور کچھ کا مقصد روٹی ہے
وہ کہتے ہیں سب اچھا ہے
مغرب کا راج ہی سچا ہے
یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا
اے چاند یہاں نکلا نہ کر

سائرہ بتول

نفرتوں کی دھوپ ہے اور سائباں کوئی نہیں
کارواں گمراہ، میرِ کارواں کوئی نہیں
کیا کہوں، کس سے کہوں، میں عجب مشکل میں ہوں
چاہنے والے ہیں بہت پر رازداں کوئی نہیں
پھول سب کملا گئے، کلیاں بھی سب مرجھا گئیں
ہے خزاں چھائی ہوئی اور باغباں کوئی نہیں
ہے بہت سی روشنی چاروں طرف میرے مگر
تیری آنکھوں کی طرح سے ضوفشاں کوئی نہیں
وقت کی گردش مجھے کس موڑ پہ لائی بتولؔ
لوٹنے والوں نے گھیرا پاسباں کوئی نہیں

نظیر اکبرآبادی

دُور سے آئے تھے ساقی سُن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے، افسوس! پیمانے کو ہم
مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگادیں آگ میخانے کو ہم
کیوں نہیں لیتا ہماری تُو خبر اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم
ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیّاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں، آب اور دانے کو ہم
طاقِ ابرُو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی
اب تو پُوجیں گے نہ اُس کافر کے بُت خانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم
کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیرؔ

دوسروں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا بہترین عبادت ہے۔(ابوداؤد)

سہیل احمد لون

ہم نے جتنے بھی خواب دیکھے ہیں
تیرے بارے جناب دیکھے ہیں
کھلی آنکھوں میں ہم نے صورتِ اشک
آسماں پر سحاب دیکھے ہیں
پتھروں کی طرح سرِ گلشن
ٹہنی ٹہنی گلاب دیکھے ہیں
ہم نے دیکھے ہیں کرب رستوں کے
ہجرتوں کے عذاب دیکھے ہیں
دریا دریا سہیلؔ دشت ملے
صحرا صحرا چناب دیکھے ہیں

ڈاکٹر رضیہ اسمٰعیل برمنگھم

ٹوٹا ہوا خوابوں کا نگر دیکھ رہی ہوں
اب دید کی خواہش نہیں، پر دیکھ رہی ہوں
چھپتی نہیں آنکھوں کی نمی لاکھ چھپائیں
ہر چہرے پہ میں دیدۂ تر دیکھ رہی ہوں
پنچھی ہے، قفس ہے، کہیں پرواز کی خواہش
میں پنجرے میں ٹوٹے ہوئے پر دیکھ رہی ہوں
اینٹوں سے مکاں بنتے ہیں، گھر پیار وفا سے
بازار میں بکتے ہوئے گھر دیکھ رہی ہوں
نالے مرے جا پہنچے ہیں اب عرشِ بریں پر
میں اپنی دُعاؤں کا اثر دیکھ رہی ہوں

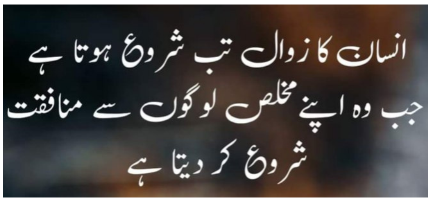

عامر امیر

دکھانے کو سجنا سجانا نہیں تھا
محبت تھی ملنا ملانا نہیں تھا
میں لوگوں کی باتوں پہ جو ٹھہر جاتا
تو لوگوں نے رُکنا رُکانا نہیں تھا
سیئے خود ہی دامن، گریباں وگرنہ
کہ پیشہ تو سینا سلانا نہیں تھا
وہ مجھ پہ محبت سے اک وار کرتا
تو میں نے بھی بچنا بچانا نہیں تھا
اے ساقی! ہمیں مل، کہ ملنے ہیں آئے
ارے ہم نے پینا پلانا نہیں تھا
وہ منت سماجت پہ اُترا تو میں نے
دیا دل جو دینا دلانا نہیں تھا
غزل میری جانے کہاں کو نکل دی
ارادہ تو جیا جلانا نہیں تھا

صفدر ہمدانی

اِس اُمت حضور کی غیرت کہاں گئی
اے کلمہ گو بتا تری جرات کہاں گئی
گلشن میں پھول کلیاں بھی محفوظ اب نہیں
کوئی بتائے مجھ کو حکومت کہاں گئی
قاتل سزا کے بعد کھڑے مسکراتے ہیں
شیطان پوچھتا ہے ندامت کہاں گئی
سب قائدین دین کے لب سر بمہر ہیں
ممبر نشین تیری خطابت کہاں گئی
ہمت ہے کس میں اسے دے کوئی جواب
بنت سوال کرتی ہیں عزت کہاں گئی
صفدرؔ قلم کا نوحہ ہے غیرت کا مرثیہ
اللہ کے رسولؐ کی اُمت کہاں گئی

اکبر حیدرآبادی

شہر میں نعرہ بلب غول لٹیروں کا رہا
رقص ہر سمت فضاؤں میں پھریروں کا رہا
چلنے والوں کی تھی غفلت کہ مسافت کی تھکن؟
جائے شبخوں پہ گماں رین بسیروں کا رہا
مچھلیاں موج مناتی رہیں پانی میں اِدھر
اور اُدھر پھیلا ہوا جال مچھیروں کا رہا
مُسکراتا تو رہا منہ پہ اُجالے مَل کر
چاند کی پیٹھ پہ اک بوجھ اندھیروں کا رہا
جب بھی اک دشت کی اک نہر کا آیا ہے خیال
منظران آنکھوں میں جلتے ہوئے ڈیروں کا رہا
دیکھنے والوں پہ طاری رہی حیرت اکبرؔ
سانپ تھے وجد میں اور رقص سپیروں کا رہا

باقر نقوی

لمحہ شوق بھی ہم رنگِ بلا ہوتا ہے
تم نہ ہو ساتھ تو موسم بھی خفا ہوتا ہے
دل وہی ہے کہ جسے غم کی سعادت ہو نصیب
درد وہ ہے کہ جو محروم دوا ہوتا ہے
اس کو دلدار کہوں یا اسے دشمن جانوں
درد کے بھیس میں جو دل میں چھپا ہوتا ہے
میں ہوں آئینہ صفت مجھ میں کہاں تابِ فریب
جو مرے دل میں ہو چہرے پہ لکھا ہوتا ہے
بار آور ہوئی یوں تازہ بہ تازہ کی تلاش
روز پلکوں پہ مرے اشک نیا ہوتا ہے

سادگی ایسی بھی اچھی نہیں ہوتی باقرؔ
وہی کہتے ہو جو لوگوں سے سُنا ہوتا ہے

ندیم اجمل عدیم

اُتر کے دل میں جو اشکِ رواں سے جاتا ہے
کیا اس طرح سے بھی کوئی مکاں سے جاتا ہے
میں ہونٹ سی کے ترے بام و در کی سنتا ہوں
کہ گھر ہو کوئی بھی آہ و فغاں سے جاتا ہے
جو مجھ میں رہتا ہے لڑکا؟ مرے خدا کی پناہ
جواں بھی ہوتا نہیں ہے نہ جاں سے جاتا ہے
میں ایسے شہر میں آباد ہوں جہاں کوئی
قدم جو رکھے تو جائے اماں سے جاتا ہے
عدیمؔ کہتے ہیں انساں ہمیشہ مسند پر
زباں سے آتا ہے لیکن بیاں سے جاتا ہے

خواجہ حنیف تمنّا

اک بے وفا سے پیار کیا ہائے کیا کیا
خود کو جہاں میں خوار کیا ہائے کیا کیا
اُس نے بھی مدعا نہیں کھل کر بیاں کیا
ہم نے بھی اختصار کیا ہائے کیا کیا
اس نے بھی دل لگی کو وفا کا دیا تھا نام
ہم نے بھی کاروبار کیا ہائے کیا کیا
ہر بات اس کے بعد خرد کی ہے مان لی
دل کا نہ اعتبار کیا ہائے کیا کیا
تھا تنگ حال کعبۂ دل پر بُتانِ حُسن
تم کو نہ واگزار کیا ہائے کیا کیا
تھا ہالۂ نظر میں مرے تنگ ماہ رُو
بس اُس کو بے حصار کیا ہائے کیا کیا
ترکِ وفا کے بعد تمنّاؔ تمام عمر
پھر اس کا انتظار کیا ہائے کیا کیا

ارشاد عرشی ملک

لغزش بہت بڑی ہے اگر رہ گئی نماز
پُرسش بہت کڑی ہے اگر رہ گئی نماز
چھوٹی لغزش نہ جان تو ترکِ نماز کو
سب سے یہی بڑی ہے اگر رہ گئی نماز

خالد ملک ساحل

پہلے تسخیر اپنی کرنی ہے
پھر زمانے سے جنگ لڑنی ہے
اِک تصور نے راکھ ہونا ہے
ایک تصویر اور جلنی ہے
میرے سر پر ہے بوجھ صدیوں کا
میرا سینہ ازل سے چھلنی ہے
حادثے نے خراج لینا ہے
جس گھڑی میں نے آنکھ ملنی ہے
میرا قاتل نہیں ملا مجھ کو
میری قیمت خدا نے بھرنی ہے
ڈھونڈ تا ہوں دکان دُنیا کی
میں نے تنہائی خرچ کرنی ہے

سلطانہ مہر

تخریب میں تعمیر کے پہلو ہیں نہاں اور
مٹتا ہے جہاں ایک تو بنتا ہے جہاں اور
تھک جائیں گے اک روز تو خود ظلم کے بازو
جتنے بھی ستم ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہاں اور
دیکھیں گے کسے لکھتا ہے گلستاں کا مورّخ
گلچیں کا بیاں اور ہے، بلبل کا بیاں اور
ہمت کے مطابق ہے منازل کا تعیّن
دیپک کا جہاں اور، پتنگے کا جہاں اور
اے مہرؔ مرے دل کی لگی رو کے بجھی ہے
چھینٹے جو دیئے جاتے ہیں اُٹھتا ہے دھواں اور

سلطان صابری

رات کے اندھیرے میں آرزو کا پھیرا ہے
چاند کے اُترنے پہ صبح کا بکھیرا ہے
ساتھ ساتھ نہ چلنے سے راہزن نہ لُوٹے گا
ہاتھ چھوڑ دینے سے ہر قدم کو ویرا ہے
اژدہوں کے رستوں پہ حرف بکھرے بکھرے ہیں
منزلوں کے سانپوں پہ لفظ کا سپیرا ہے
شام کی سیاہی میں لال چاند اُترا ہے
اُس کی قہر آنکھوں میں خوف اک بدھیرا ہے
بستروں پہ چاندی کی چادریں بچھائی ہیں
نیند آ نہیں سکتی آنکھ پہ گیرا ہے
خون کے تپاشوں کو کوئی کس طرح دیکھے
ہر طرف سے آنکھوں کو منظروں نے گھیرا ہے
ہانڈیوں کے پکنے کو پانیوں کو چھلے ہیں
لکڑیوں کے بالن میں دُھند کا بسیرا ہے

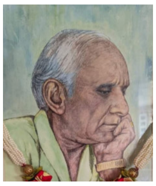

سوہن راہی

سمندر پار کر کے اب پرندے گھر نہیں آتے
اگر واپس بھی آتے ہیں تو لے کر پر نہیں آتے

میری آنکھوں کی دونوں کھڑکیاں خاموش رہتی ہیں
کہ اب ان سے سخن کرنے کے مرے منظر نہیں آتے
مری چاہت خلاؤں میں دھواں بن بن کے اُڑتی ہے
مگر اس خاک کے ذرے مرے در پر نہیں آتے
مرے آنگن کی چھتری کے کبوتر خوب ہیں لیکن
چلے جاتے ہیں تو واپس کبھی مڑ کر نہیں آتے
تمہارے شہر کے موسم، ہمارے شہر میں راہی
سنہری دھوپ کی لے کر کبھی چادر نہیں آتے

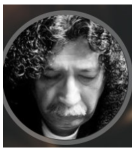

عارف امام

اس مسجد کے ساتھ ہی پیغمبر کا مزار ہے
اس مسجد کو بم سے اُڑانا واجب ہے
اس کا مسلک میرے مسلک سے ہے جُدا
اس کافر کو زندہ جلانا واجب ہے
میں نے مال کمایا فضلِ ربی سے
میرے لئے عمرے پر جانا واجب ہے
اندر کا بُت خانہ کس نے دیکھا ہے؟
سامنے والا چرچ گرانا واجب ہے
سب پر کیسے میری عبادت ظاہر ہو؟
ماتھے پر اک داغ لگانا واجب ہے

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کہے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے ہوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے راہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

محمد اسحق عاجز جرمنی

پنکھ ہوں گر مرے اُڑ کے پہنچوں وہاں
جس نگر جاکے ٹھہرا مرا یار ہو
بلبلوں کی طرح نغمے گاتا ہوا
جا میں پہنچوں جہاں گل کی مہکار ہو
ہے مری جان اب تمنا یہی
میرے جیون میں ہر سو ترا پیار ہو
تیری خوشبو سے مہکی مری زندگی
تیرے ابرِ کرم کی ہی بھر مار ہو
تیرے در سے ہمیشہ خزانے ملے
یوں ہی لطف و کرم تیرا ہر بار ہو
دھوپ غم کی مجھے گر ستانے لگے
مجھ پہ سایہ فگن تیری دیوار ہو
اُس کے فضلوں کی بارش ہی ہوتی رہے
یوں ہی صبح و مسا تیرا دیدار ہو
فخر سے ماروں ٹھوکر زمانے کو میں
کوچہ تیرا اگر میرا گھر بار ہو
رقص کیوں نہ کریں پھر بہاریں وہاں
میرے آقا جہاں تیرا دربار ہو
تیرے پہلو میں اسحٰق بیٹھا رہے
حُسن تیرا ہو اور یہ پرستار ہو

فرحت عباس شاہ

لاکھ دُوری ہو مگر عہد نبھاتے رہنا
جب بھی بارش ہو مرا سوگ مناتے رہنا
تم گئے ہو تو سرِ شام یہ عادت ٹھہری
بس کنارے پہ کھڑے ہاتھ ہلاتے رہنا
جانے اس دل کو یہ آداب کہاں سے آئے
اس کی راہوں میں نگاہوں کو بچھاتے رہنا
ایک مدت سے یہ معمول ہوا ہے اب تو
آپ ہی روٹھنا اور آپ ہی مناتے رہنا
تم کو معلوم ہے فرحت یہ پاگل پن ہے
دور جاتے ہوئے لوگوں کو بلاتے رہنا

عبدالکریم قدسیؔ امریکہ

طبیعت کو خوشامد کا ہنر اچھا نہیں لگتا
منافع بخش سودا ہے مگر اچھا نہیں لگتا
جو ہجرت کی تو اپنا دل پرانے گھر چھوڑ آئے
اب اچھے سے اچھا بھی ہو گھر اچھا نہیں لگتا
مجھے اپنی نگاہ اور زورِ بازو پر بھروسہ ہے
مگر پھر بھی اندھیروں کا سفر اچھا نہیں لگتا
پھلوں پھولوں کی خوشبو سے اگرچہ ہو لدا لیکن

پرندوں سے جو ہو خالی شجر اچھا نہیں لگتا
ہمیں تو صبر کی تعلیم ہے، تلقین ہے، ورنہ
یقیں جانو ہمیں خوف و خطر اچھا نہیں لگتا
یہ بہتر ہے کہ اپنے آشیانے میں رہوں بیٹھا
اُڑوں میں مانگ کر اوروں کے پر اچھا نہیں لگتا
فسادوں کے لئے مُلاں کو سر درکار ہیں لیکن
اسے وقتِ شہادت اپنا سر اچھا نہیں لگتا
مرا مُرشد ہی جس کا منزل و محور نہ ہو قدسیؔ
مجھے تو ان خیالوں کا سفر اچھا نہیں لگتا

اطہر شاہ خان

ادا کیا تھا میں نے اس کا ادھار آدھا
جبھی سے تو اس کو رہ گیا اعتبار آدھا
یہ ہم جو بیوی کو آدھی تنخواہ دے رہے ہیں
تو دال کو بھی دے رہی ہے بگھار آدھا
ضرور مٹی کا تیل ساقی پلا گیا ہے
جو پورے ساغر سے ہو رہا ہے خمار آدھا
اگر ترا ہاتھ دل پہ ہوتا تو کیا نہ ہوتا
کہ نبض دیکھی تو رہ گیا ہے بخار آدھا
وہ زہر میں ڈال کر وٹامن بھی دے رہا تھا
تو ظاہر ہے اس کی نفرت میں پیار آدھا

فہمیدہ منیر

قتل اور خون کا اک تانتا بندھا تھا لوگو!
کل جو گلزار تھا اب دشتِ بلا تھا لوگو!
شاہ رگ کاٹ دی اور رشتۂ جاں توڑ دیا
تم خدا ہو یہ تمہیں کس نے کہا تھا لوگو!
یوں مسلماں تو کبھی ظلم نہیں رکھتے روا
کیوں ہمارے لئے یہ ظلم روا تھا لوگو!؟
موت پران کی گلستانوں کے دل داغ ہوئے
دشت خاموش تھے سناٹا پڑا تھا لوگو!
لوگ ہنستے ہوئے کیوں جان پہ یوں کھیل گئے
سر کٹا دینے کا اک عزم تھا لوگو!
جھانک کر اپنے نہاں خانۂ دل میں دیکھو
قُفل اور وہ بھی بہت زنگ لگا تھا لوگو!
آہ جب لوٹ کے آئے گی تو جل جاؤ گے
بے زبانوں کا تو ہتھیار دُعا تھا لوگو!
تم کو پچھتاوے کی اک آگ میں جلنا ہوگا
وقت بتلائے گا کیا کس نے کیا تھا لوگو!
مرنے والوں سے عقیدت کا سماں تو دیکھو
آفتاب اپنی جگہ رُک سا گیا تھا لوگو!
چند باتیں مرے دل کی تمہیں سننا ہونگی
درد دل میں بہت روز سہا تھا لوگو!

مبارک مونگھیری

جنونِ عشق رفتہ رفتہ کامل ہوتا جاتا ہے
کہ دیوانہ خود ان سے بھی غافل ہوتا جاتا ہے
اثر انداز کس کا حسن کامل ہوتا جاتا ہے
کہ جو ذرّہ ہے ہستی کا وہی دل ہوتا جاتا ہے
نگاہوں سے حجاباتِ تعین اٹھتے جاتے ہیں
مبتلا عشق میں آئینۂ دل ہوتا جاتا ہے
چلے جاتے ہو بے پرواہ ذرا مڑ کر یہ دیکھو تو
کہ ہر نقشِ قدم سجدے کے قابل ہوتا جاتا ہے
ہوئی جاتی ہے کیوں بیزار مجھ سے خود بخود دنیا
مرے اللہ مجھ سے کون غافل ہوتا جاتا ہے
الٰہی خیر! وحشت میں کمی سی آئی جاتی ہے
مجھے کچھ امتیازِ حق و باطل ہوتا جاتا ہے
فلک کی حشر انگیزی ہی کیا کم تھی کہ اب اس میں
ارے ظالم ترا فتنہ بھی شامل ہوتا جاتا ہے
محبت ہے کہ ہے ہر سمت مصروف جنوں خیزی
"زمانہ ہے کہ دیوانوں کی محفل ہوتا جاتا ہے
کسی کے حسن کامل کا مبارک فیض ہے جس سے
مرا حسنِ تغزل آج کامل ہوتا جاتا ہے

نظیر اکبر آبادی

آگے تو پری زاد یہ کہتے تھے ہمیں گھیر
آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آگے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر
جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز سے ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
آگے تھے جہاں گلبدن اور یوسفِ ثانی
دیتے تھے ہمیں پیار سے چھلوں کی نشانی
مرجائیں تو اب منہ میں نہ ڈالے کوئی پانی
کس دُکھ میں ہمیں چھوڑ گئی ہائے جوانی
سب چیز سے ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے
وہ کون سے گل رو ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے میں ہوئے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے دُم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے
سب چیز سے ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا یار اُلٹ ہم سے گیا ہائے زمانہ
جو شخص کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانہ
چھیڑے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانہ
ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہو نانا
پوچھیں ہیں جسے کہتا ہے کیا پوچھے ہے بڈھے؟
دیکھیں ہیں جسے کہتا ہے کیا دیکھے ہے بڈھے؟
سب چیز سے ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بہادر شاہ ظفر

دِلفریبے، دِلنوازے، دِلربائے، دِلستائے
مست نازے، فتنہ سازے، تندخُوئے، جنگ جوئے
ظلم کیشی، ظلم کُوشی، ظلم خواہی، ظلم رانے
کج کلاہے، کج اَدائے، پُر فریبے، پُر دَغائے
بدطریقے، بدشعارے، بدمزاجے، بدزبانے
چشم مے گوں مبصّر وشے، پُرنگاہے، بادہ نوشے
خطِ عارض، سبزہ زارے، رُوئے گلگوں گلستانے
خوش نگارے، خوبروئے، بذلہ سنجے، نغز گوئے
ہوشیارے، حرف گیرے، نکتہ طبع، نکتہ دانے
خود پرستے، خودنمائے، خود پسندے، خودستائے
خودسرے، نا آشنائے، سرکشے، نا مہربانے
ہم ظفرؔ ہیں اس پہ مفتوں خوار و رُسوا دار و مخزوں
وہ یہ مانے، یا نہ مانے، وہ یہ جانے، یا نہ جانے

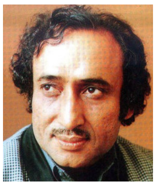

محسن نقوی

اُجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ ہوا کر
حالات کی قبروں کے یہ کتبے بھی پڑھا کر
کیا جانئے کیوں تیز ہوا سوچ میں گُم ہے
خوابیدہ پرندوں کو درختوں سے اُڑا کر
اس شخص کے تم سے بھی مراسم ہیں تو ہونگے
وہ جھوٹ نہ بولے گا مرے سامنے آ کر
اب دستکیں دے گا تو کہاں اے غمِ احباب!
میں نے تو کہا تھا کہ مرے دل میں رہا کر
ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کردے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر
وہ آج بھی صدیوں کی مسافت پہ کھڑا ہے
ڈھونڈا تھا جسے وقت کی دیوار گرا کر
برہم نہ ہو کم فہمیِ کوتہ نظروں پر
اے قامتِ فن اپنی بلندی کا گلا کر
اے دل تجھے دشمن کی تو پہچان کہاں ہے؟
تُو حلقۂ یاراں میں بھی محتاط رہا کر
میں مر بھی چکا، مل بھی چکا موجِ ہوا سے
اب ریت کے سینے پہ مرا نام لکھا کر
پہلا سا کہاں اب مری رفتار کا عالم
اے گردشِ دوراں ذرا تھم تھم کے چلا کر
اس رُت میں کہاں پھول کھلیں گے دلِ ناداں؟
زخموں کو ہی وابستۂ زنجیرِ صبا کر
اک روح کی فریاد نے چونکا دیا مجھ کو
تو اب تو مجھے جسم کے زنداں سے رہا کر
اس شب کے مقدر میں سحر ہی نہیں محسن
دیکھا ہے کئی بار چراغوں کو بجھا کر

مبارک صدیقی

وصال یار کو جانا تو ہوکے با وضو جانا
مجسم باادب رہنا، سراپا آرزو جانا
وصالِ یار کو جانا تو ہوکے باوضو جانا
نگاہِ یار وہ شے ہے جو ذرّے کو بھی زَر کردے
اُٹھائے خاک سے اور شہر بھر میں معتبر کردے
جسے وہ پیار سے دیکھے اُسے لعل و گہر کردے
خطائیں، لغزشیں، کوتاہیاں سب در گزر کردے
عقیدت کے جلائے دیپ اُسکے روبرو جانا
وصال یار کو جانا تو ہوکے با وضو جانا
یہ ممکن ہے کہ رستے میں کہیں پہ اِبتلاء آئے
کہیں لشکر مخالف ہو، کہیں ظالم ہوا آئے
اِدھر تیرِستم آئے، اُدھر سنگِ جفا آئے
یہ ممکن ہے کہ رستے میں کہیں پہ کربلا آئے
وہاں بھی سُرخرو رہنا، وہاں سے سُرخرو جانا
وصالِ یار کو جانا تو ہو کے باوضو جانا
جو دانہ خاک میں ملنے کو بھی تیار ہوتا ہے
وہی اک دن گلابوں کی طرح گلزار ہوتا ہے
جو عاشق جان دینے کے لئے تیار ہوتا ہے
اُسی کے بخت میں لکھا وصالِ یار ہوتا ہے
اگر دینا پڑے، جاتے ہوئے، دل کا لہو، جانا
وصال یار کو جانا تو ہو کے باوضو جانا

فاخرہ بتول

آپ جیسے فنکار بہت ملتے ہیں
جان و دل دینے کو تیار بہت ملتے ہیں
بھولی بھالی کسی صورت پہ نہ جانا صاحب
گُل کے پردے میں یہاں خار بہت ملتے ہیں
تیری ہاتھوں کی لکیروں میں کئی موڑ ملے
اور بدل جانے کے آثار بہت ملتے ہیں
مانا ہم جیسے بھی لاکھوں ہیں جہاں میں لیکن
آپ جیسے بھی تو سرکار! بہت ملتے ہیں
آنکھ کُھل جانے پہ اک بار کبھی آن ملو

خواب وادی کے تو اُس پار بہت ملتے ہیں
زندگی کو کوئی جانے بھی تو جانے کیسے
اس کہانی میں توکردار بہت ملتے ہیں
عدل ملتا ہی نہیں سارے زمانے میں کہیں
مسندیں ملتی ہیں دربار بہت ملتے ہیں

انورندیم علویؔ

سارے شہرنے پتھر مارے جسم تھا چکنا چورترا
پھربھی لب پرحق کا نعرہ کیا کہنا منصورترا
بستی بستی نگری نگری گیت ہمارے گونجے تھے
سازِوفااور چاندنی راتیں من بھی تھا مسحور ترا
آج وفاکےویرانےمیں پیاسی ہرنی جاں سے گئی
سورج بن گیا آنکھ اجل کی شعلہ بن گیانورترا
دریا دریا من ہے تیرا صحرا صحرانین ترے
اِک پل کا بنجارا ہےتُو سفر ہے کتنا دورترا
دھوپ کڑی میں کیوں آئے ہوپہلے کیوں نہ آئےایاز
نیم کا بُور بھی جھڑ گیا اب تومن بھی ہوامجبورترا

حکیم محمداسحٰق مرحوم

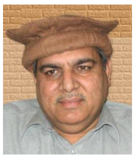

امیر شہر تک یارو جہاں بدنام ہو جائے
فقیہِ شہر کے بارے شکایت عام ہو جائے
غریبِ شہر کی ہمت جہاں ناکام ہو جائے
جہاں فتویٰ فروشی محکمانہ کام ہوجائے
جہاں سچ بات کرنا باعث الزام ہو جائے
جہاں حق کو چھپانا باعثِ اکرام ہو جائے
جہاں خوفِ خدا تک اک خیالِ خام ہو جائے
جہاں رسوائی ممبر تک لکھا پیغام ہو جائے
جہاں پر چور ڈاکو رہبرِ اسلام ہو جائے
جہاں پر غاصب و غماز میں افہام ہو جائے
جہاں پر راستی و وہم کا ادغام ہو جائے
جہاں پر مولوی کا نام اک دشنام ہو جائے
جہاں پر درسِ آخر صبر ہی جب عام ہو جائے
تو عارف لوگ کہتے ہیں یہی موسم ہے ہجرت کا
خموشی سے دعا کرکے وطن کو چھوڑ دینا تم
یہی حالات ہیں جن میں ہجرت فرض ہوتی ہے

عبیرابوذریؔ

(۱)

رویا ہوں تری یاد میں دن رات مسلسل
ایسے کبھی ہوتی نہیں برسات مسلسل
کانٹے کی طرح میں ہوں رقیبوں کی نظر میں
رہتے ہیں مری گھات میں چھ سات مسلسل
چہرے کو نئے ڈھب سے سجاتے ہیں وہ ہر روز
بنتے ہیں مری موت کے آلات مسلسل

(۲)

اجلاس کا عنوان ہے اخلاص و مروت
بد خوئی میں مصروف ہیں حضرات مسلسل
ہم نے تو کوئی چیز بھی ایجاد نہیں کی
آتے ہیں مگر ان کے کمالات مسلسل
کرتے ہیں مساوات کی تبلیغ وہ جوں جوں
بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں طبقات مسلسل
ہر روز کسی شہر میں ہوتے ہیں دھماکے
رہتی ہے مرے دیس میں شب رات مسلسل
ہر روز وہ ملتے ہیں نئے روپ میں مجھ کو
پڑتے ہیں مری صحت پہ اثرات مسلسل

رُوئیدادعرب
(نوراحمد شیخ)

سُنائیں کیا تمہیں عرب کا فسانہ
عرب اور عجم کا ہے قصہ پرانا
مگر تیل واں پہ کیا نکلا ہے یارو
شرافت ہوئی ہے عرب سے روانہ
سعودی عرب جس پہ رحمت خدا کی
بنا ہے تعیّش کا اک آستانہ
چلن فاخرانہ ادا شاطرانہ
نزاکت کے انداز ہیں دلبرانہ
پلٹ جیسے آیا ہو دورِ جہالت
ہوا دین و ایماں کا رُخصت زمانہ
حسب اور نسب کی پرستش وہی ہے
ازل سے وہی چال ہے آذرانہ
قوی تر کی پوجا ہے ایمان اُن کا
ہے سُلطانیت اُن کا قومی ترانہ
ہے امریکنوں پر عنایت کی بارش
ہیں انگریز بھی محرمِ راز خانہ
بغلگیر غیروں سے اپنوں سے برہم!
زمانے کا دستور ہے یہ پرانا!
وہ کیا درسِ یقیں دیں جہاں کو
بُتوں سے جنہیں عشق ہے والہانہ
اُنہیں دیکھ کر کون لائے گا ایماں
نظر عامیانہ، ڈگر سوقیانہ
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
ٹٹولا تو جیسے لگا تازیانہ

(نوشتہ دیوار)

عدیل زیدی

بزم میں تیرے نہ ہونے کا خیال آیا بہت
تو نہیں تھا آج تو تیرا خیال آیا بہت
دیکھتے ہی دیکھتے شاہوں کی شاہی چھن گئی
با کمالوں پر زمانے میں زوال آیا بہت
جہل کے سائے میں گہری نیند ہم سوتے رہے
ہاں اذاں دینے کو مسجد میں بلال آیا بہت
سایۂ آسیب ہے مت جانا تم چوتھی طرف
اس طرف جو بھی گیا، واپس نڈھال آیا بہت
تیری جانب آرہا ہوں روح کی تسکیں کو میں
حسرتیں دل کی میں دنیا میں نکال آیا بہت
ہم چٹانوں کی طرح باہر سے ساکت تھے عدیل
پھر بھی اکثر ذات میں اپنی اُبال آیا بہت

اقبال اشعر

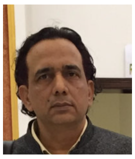

اردو مرا نام ہے میں خسرو کی پہیلی
میں میر کی ہمراز ہوں غالب کی سہیلی
دکن کے ولی نے مجھے گودی میں کھلایا
سودا کے قصیدوں نے مرا حسن بڑھایا
ہے میر کی عظمت کہ مجھے چلنا سکھایا
میں داغ کے آنگن میں کِھلی بن کے چنبیلی
اردو ہے مرا نام ہے میں خسرو کی پہیلی
غالب نے بلندی کا سبق مجھ کو سکھایا
حالی نے مروت کا سبق یاد دلایا
اقبال نے آئینۂ حق مجھ کو دکھایا
مومن نے سجائی مرے خوابوں کی حویلی
اردو ہے مرا نام ہے میں خسرو کی پہیلی
ہے ذوق کی عظمت کہ دیئے مجھ کو سہارے
چکبست کی الفت نے میرے خواب سنوارے
فانی نے سجائے مری پلکوں کے سہارے
اردو ہے مرا نام ہے میں خسرو کی پہیلی
کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں جانا
دیکھا تھا کبھی میں نے جو خوشیوں کا زمانہ
اپنے ہی وطن میں ہوں میں آج اکیلی
اردو ہے مرا نام ہے میں خسرو کی پہیلی

منظر ایوبی

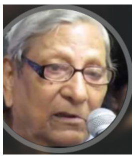

کس کس کو رزقِ خاک بنانا پڑا مجھے
نسلوں کا قرض تھا جو چکانا پڑا مجھے
بجھنے لگا چراغِ تمنا تو دوستو!
احسان آندھیوں کا اُٹھانا پڑا مجھے
پھر یوں ہوا کہ ہاتھ سے بندوق گر پڑی
اور دشمنوں کو سر پہ بٹھانا پڑا مجھے
جب بندگانِ حق پہ زمیں تنگ ہو گئی
پانی پہ بستیوں کو بسانا پڑا مجھے
نکلا نہ جب سپاہِ جنوں سے کوئی بشر
تنہا ستونِ دار پر جانا پڑا مجھے
منظرؔ یہ حادثہ بھی مقدر میں تھا لکھا
کہ خود قاتلوں سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

ساجد محمود رانا

دُکھ درد پہ رونے کی اجازت نہیں ہوتی
زنداں میں میسّر یہ سہولت ہیں ہوتی
ممکن تھا کہ صحرا سے پلٹ کر نہیں آتے
گر شہر منافق سے محبت نہیں ہوتی
حیرت ہے کہ سرِ صبح چراغوں سے ہوں لڑتا
حیرت ہے شبِ غم کی وضاحت نہیں ہوتی
ماتھے پہ سجاتا میں تیرے وصل کا جھومر
اے کاش ترے ہجر کی عادت نہیں ہوتی
جس دن سے مرے ساتھ دغا تونے کیا ہے
اس دن سے کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی
آئینے میں اب کوئی بھی ہنستا نہیں مجھ پر
اب مجھ کو مرے حال سے وحشت نہیں ہوتا
جس دل پہ ترے ہجر نے ڈھائی ہو قیامت
اُس دل پہ کبھی برپا قیامت نہیں ہوتی
تھم جائیں میری آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو
کیا عشق میں اتنی بھی رعایت نہیں ہوتی
اک میں جو ترے واسطے دنیا سے جدا ہوں
اک تو جسے دنیا سے ہی فرصت نہیں ہوتا
گر مجھ کو ترے ہجر کی دولت نہیں ملتی
اس طرح میرے نام کی شہرت نہیں ہوتی
اے دوست وضو اشک ندامت سے ہے لازم

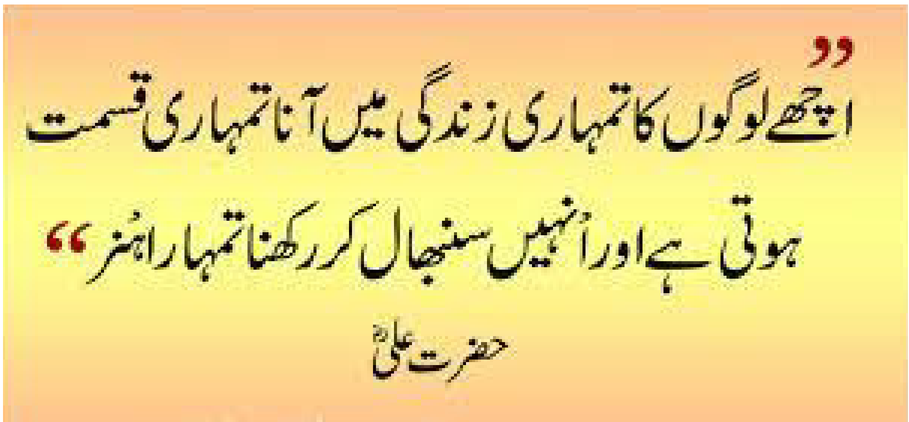

منظور وگرنہ یہ عبادت نہیں ہوتی
میں یاد کروں اور چلا آئے وہ ملنے
اس دور میں کیا ایسی کرامت نہیں ہوتی
جب تیز ہوا پیار کی آنکھیں ہیں دکھاتی
کمزور پرندوں سے بغاوت نہیں ہوتی

محمد فاروق نسیم (برمنگھم)

وہ دور اب کہاں رہا چنگ و رَباب کا
رہ رہ کے یاد آتا ہے عالم شباب کا
کیا جانے کیا زبان سے اس کے نکل گیا
تانتا لگا ہوا ہے سوال و جواب کا
جو کچھ بھی جس کو کہنا تھا، اُس نے تو کہہ دیا
ہے انتظار مجھ کو بس اُن کے جواب کا
کیا کھویا ہم نے عشق میں برباد کیا کیا
دھڑ کا لگا ہوا ہے حساب و کتاب کا
جاڑے کی سرد رات میں ہے چاندنی بہت
لیکن ہے انتظار ہمیں آفتاب کا
پانی کی جستجو میں تھے سب اہلِ کارواں
صحرا میں دلفریب تھا منظر سَراب کا
جیسے ہی آنکھ لگتی ہے آتے ہیں خواب بھی
اک سلسلہ طویل ہے راتوں میں خواب کا
اتنی حسین رات میں کیوں نیند آ گئی
ہم دیکھنے نہ پائے حُسن ماہتاب کا
بچھڑے جو کارواں سے تو منزل نہ مل سکی
پوچھا کسی نے حال نہ خانہ خراب کا
دنیا کی فکر چھوڑ نظر آخرت پہ رکھ
ہوتا نہیں زمیں پہ نشیمن عُقاب کا
بدمست زندگی تو مناسب نہیں نسیم
کیا تم کو ڈر نہیں ہے خدا کے عذاب کا

فرزانہ نیناں، نوٹنگھم)

روز دیکھا ہے شفق سے وہ پگھلتا سونا
روز سوچا ہے کہ تم میرے ہو، میرے ہونا
میں تو اک کانچ کے دریا میں، بہی جاتی ہوں
کھنکھناتے ہوئے ہمراز مجھے سن لو نا
کان میں میں نے پہن لی ہے تمہاری آواز
اب مرے واسطے بیکار ہیں چاندی سونا
میری خاموشی کو چپکے سے سجا دو آکر
اک غزل تم بھی مرے نام کبھی لکھو نا
روح میں گیت اتر جاتے ہیں جیسے خوشبو
گنگناتی سی کوئی شام مجھے بھیجو نا
چاندنی اوس کے قطروں میں سمٹ جائے گی
تیرگی صبح سویرے میں کہیں کھو دو نا !
پھر سے آنکھوں میں کوئی رنگ سجا لے نیناںؔ
کب سے خوابوں کو یہاں بھول گئی تھی بونا

ہما خان، برمنگھم

دل چھوٹا نہ کرنا ماں مجھ کو اسکول ہے جانا
میرے کھلونے تم رکھ لینا
جب میں واپس آجاؤں گا
تو بھائی سے مل کر ان سے کھیلوں گا
بہنوں کا میں مان بنوں گا
میں مجھ کو اسکول ہے جانا !!
ہاں یاد آیا پیاری ماں!
میں اسکول سے نہ آؤں تو
میرے کھلونے میرے بھائی کو دے دینا
مجھے خون میں ڈوبا دیکھو تو ہنس دینا اتنا سمجھنا
میں مٹی سے سرخ گلاب میں بدل گیا ہوں
میری خوشبو سے اس گھر کو مہکا لینا
دل چھوٹا نہ کرنا دل چھوٹا نہ کرنا

ارشد شریف کی نذر

عاصی صحرائی

جنت کی سمت چل دیے ارشد شریف آپ
مٹی میں مل گئے سبھی تیرے حریف آپ
لاؤں گا تجھ پہ نظم میں اچھا سا قافیہ
حیران ہو گی دیکھ کے اس کو ردیف آپ
جب تھے حیات تب تو بہاریں تھی آپ سے
آئی خزاں بہار پہ جو تھی لطیف آپ
گر ہو کسی کی موت کسی حادثے میں تو
کہتا ہے وہ شہید ہے دینِ حنیف آپ
جو تجھ سے اختلاف پہ آئی تھی وہ دلیل
جھک کر گری پڑی ہے دلیلِ نحیف آپ
جو چاہتے تھے تجھ کو بنائیں گے بدنصیب
اور مار کر وہ تجھ کو ہوئے بدنصیب آپ
ارشد شریف تجھ کو کِیا ہے شہید سو
موصوف قاتلین ہیں اپنے رقیب آپ

عبدالحمید عدم

ہم نے حسرتوں کے داغ آنسوؤں سے دھو لئے
آپ کی خوشی حضور بولئے نہ بولئے
کیا حسین خار تھے جو مری نگاہ نے

سادگی سے بارہا رُوح میں چھبو لئے
موسمِ بہار ہے عنبریں خمار ہے
کس کا انتظار ہے گیسوؤں کو کھولئے
زندگی کا راستہ کاٹنا تو تھا عدمؔ
جاگ اُٹھے تو چل دیئے تھک گئے تو سو لئے

عبدالحمید حمیدی کنیڈا

مسکائے میرا زخم جگر عید کہاں ہے
گھائل ہوئی ہے شوخ نظر عید کہاں ہے
افسردہ سے ہیں بام اور در عید کہاں ہے
اب پوچھتے ہیں شام و سحر عید کہاں ہے
ویران ہوئے مسجدوں کے ممبر و محراب
کیا اُن کو عبادت کی فکر عید کہاں ہے
انساں پہ روا ظلم ہے انصاف کے ہاتھوں
انسانیت کا جھک گیا سر عید کہاں ہے
حقدار تھے جس چیز کے سب سائل و محروم
تم لے گئے اپنے ہی گھر عید کہاں ہے
یہ عید کہاں کھوئی ذرا تم کو بتادوں
تم چھوڑ چکے اللہ کا درعید کہاں ہے
دیکھو تو ذرا خود کو حمیدیؔ کی نظر سے
کچھ بھی نہیں پیر نہ سر عید کہاں ہے

آفتاب شاہ

نظریں کوئی ملاتا نہیں جھانکتا نہیں
کرتا ہوں میں جو منّتیں وہ مانتا نہیں
بگڑا ہے مجھ سے یوں کہ مجھے جانتا نہیں
کرتا ہے مجھ سے باتیں کسی غم گسار کی
گویا کہ مجھ کو ہجر میں پہچانتا نہیں
اپنوں کا وار ہو تو تڑپتا ہوں رات دن
غیروں کا وار ہو تو جگر تھامتا نہیں
رکھتا ہوں گر میں مان سدا اسکی بات کا
وہ بھی تو بات میری کبھی ٹالتا نہیں
مارا ہو جس کو یار کی الفت نے ہر گھڑی
چاہت کو ایسا شخص کبھی جانچتا نہیں

ڈاکٹر فرزانہ فرحت

لے چلو مجھ کو صنم اُن آسمانوں سے پرے
میں نے دیکھا ہے اجالا دو جہانوں سے پرے
اے مرے صیّاد اس کمرے کی کھڑکی کھول دے
میں نے دیکھا ہی نہیں ہے ان مکانوں سے پرے
میری کشتی کے لیے کوئی نہیں ہے ناخدا
اک کھڑا طوفان ہے اِن بادبانوں سے پرے
باغباں تیرے چمن میں ہے بہار آئی ہوئی
ہیں مگر سوکھے شجر بھی گلستانوں سے پرے
سوچتی ہوں دیکھ کر میں سنگِ مرمر کے مکاں
بے مکاں بھی لوگ ہیں اونچے مکانوں سے پرے
آہنی پنجرے کے اندر قید ہیں پنچھی کئی
ہیں کئی پرواز میں اُن آشیانوں سے پرے
کس طرف فرحتؔ نکل آئی میں یوں چلتے ہوئے
کڑکڑاتی دھوپ ہے اُن سائبانوں سے پرے
قید میں رسموں کی جکڑے ہیں دیوانے کیسے
بند ہیں خواب کواڑوں میں بیگانے کیسے

ادا جعفری

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی بر سر الزام ہی آئے
حیران ہیں لب بستہ ہیں دلگیر ہیں غنچے
خوشبو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے
لمحات مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے
تاروں سے سجا لیں گے رہ شہر تمنا
مقدور نہیں صبح چلو شام ہی آئے
کیا راہ بدلنے کا گلہ ہم سفروں سے
جس رہ سے چلے تیرے درو بام ہی آئے
تھک ہار کے بیٹھے ہیں سر کوئے تمنا
کام آئے تو پھر جذبہ ناکام ہی آئے
باقی نہ رہے ساکھ اداؔ دشت جنوں کی
دل میں اگر اندیشہ انجام ہی آئے

مسافرانِ غزل کے لیے

غفران کامل

مری دعا سے نمٹ کر کہیں چلے جائیں
اب آپ بات پہ ڈٹ کر کہیں چلے جائیں
بغیر ہاتھ ملائے یہاں کے لوگوں سے
ہوا کے ساتھ لپٹ کر کہیں چلے جائیں
دراصل عکس نہیں ہے خلا کسی کا ہے
خلا کو ڈانٹ ڈپٹ کر کہیں چلے جائیں
وگرنہ یاد امربیل کھا ہی جاتی ہے
مرے خیال سے کٹ کر کہیں چلے جائیں
اسے بھی دھوپ لگے اور جینے لگ جائے

کبھی تو سائے سے چھٹ کر کہیں چلے جائیں
یہاں پہ آنکھ کسی کام کی نہیں رہتی
وفورِ نور سے ہٹ کر کہیں چلے جائیں
عروج آپ کے ہاتھوں غضب ہوا پہلے
سو اب زوال جھپٹ کر کہیں چلے جائیں
یہاں رہے تو شفایاب ہو بھی سکتے ہیں
دوانگی سے چمٹ کر کہیں چلے جائیں
لباس میں بھی لباسِ حیا مناسب ہے
ذرا سا اور سمٹ کر کہیں چلے جائیں
یہاں سے خوف کھلے راستے نہیں دیتا
سو فرد فرد میں بٹ کر کہیں چلے جائیں
زمانے بھر سے مؤقف رہے گا پوشیدہ
اگر ہم ایسے پلٹ کر کہیں چلے جائیں
جہاں بھی جائیں مگر آج دل میں آئی ہے
زمین کو بھی الٹ کر کہیں چلے جائیں

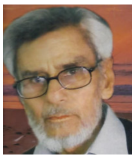

رئیس الدین رئیس

کہیں نہ دھوپ، نہ بارش، ہے سائبان اُداس
نظر جھکائے ہوئے لوگ، آسمان اُداس
شکار کرکے پرندہ، شکاری خوش
لہو کے داغ اُٹھائے ہوئے چٹان اُداس
گھروں میں بھوک سے بچے بڑے فسردہ سب
نگر میں کرفیو نافذ ہر اِک دکان اُداس
یہ سوچ کر میں ادھورے سفر سے لوٹ آیا
کہ ہجر ساعتیں کردیں نہ میری جان اُداس

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مدثر عباس

اے خوشی تیرے کئی باب تھے لکھنے والے
جانے کس خوف سے سیراب تھے لکھنے والے
میں نے اُس وقت ترے حُسن کا انکار کیا
جب ترے سحر میں غرقاب تھے لکھنے والے
ایک ترتیب کی ترویج میں بکھرا ورنہ
ذہن مضبوط تھا اعصاب تھے لکھنے والے
میرے کردار کو تاریخ کے پنوں میں نہ دیکھ
میرے بارے میں بھی احباب تھے لکھنے والے
اولیں بات تھی جو بات نہیں لکھی گئی
ثانوی بات بھی کذاب تھے لکھنے والے
اک طرف خیر کی تاویل ابھی باقی تھی
ایک جانب بڑے بیتاب تھے لکھنے والے
وہ جو آنکھوں کے علاقے میں کبھی آئے نہیں
سچ یہی ہے کہ وہی خواب تھے لکھنے والے
لکھنے والوں کی وہاں بھیڑ لگی رہتی تھی
اور اس بھیڑ میں کمیاب تھے لکھنے والے

عاصی صحرائی

محبت کے حوادث کو میں دل میں سہہ نہیں پایا
مگر پھر بھی تمہیں میرا ٹھکانہ کہہ نہیں پایا
مجھے عمرِ رواں کے دور کو لکھنا تھا کاغذ پر
نجانے کیوں قلم کی نوک سے وہ بہہ نہیں پایا
مجھے وہ دوستوں کی مستیوں کے یاد ہیں سب دور
جہاں جی بھر کے ان کے ساتھ کیوں میں رہ نہیں پایا
جوانی شوخیوں میں تھی مجھے تحریر کرنی ہے
دلِ مجبور کے قرطاس پر تصویر کرنی ہے
مجھے اب اشکِ محبوب گزشتہ پر بہانے ہیں
اداسی خوارگی اس کے وہاں تقدیر کرنی ہے
مجھے فرقت میں دورِ رفتگاں جب یاد آئے گا
اسے خوابیدہ شب کی آنکھ پر زنجیر کرنا ہے
تمہارے ساتھ گزری شام لوٹ آئے گی لیکن کب
لحد میں بام بن جائے گا تو تنہا وہاں ہو جب

عامر حسنی

اسے دل میں بسانا چاہتا ہوں
یونہی پھنسنا پھنسانا چاہتا ہوں
اڑا لوں نیند راتوں کی میں جس سے
کوئی ایسا بہانہ چاہتا ہوں
محبت ہوگئی ہے دشمنوں سے
یہی لوگو بتانا چاہتا ہوں
کدورت ختم ہو جائے یہاں سے
دلوں کو یوں ملانا چاہتا ہوں
خدایا میری طاقت تو بڑھانا
میں گرتوں کو اٹھانا چاہتا ہوں
جھلس جائے نہ کوئی آگ سے پھر
پتنگوں کو بچانا چاہتا ہوں
بجاؤں امن کی بنسی جہاں پر
بس اک ایسا ٹھکانہ چاہتا ہوں
جو اوروں کے لیے خود کو مٹا دے
میں ہاتھ اس کا بٹانا چاہتا ہوں
جہاں فصلیں محبت کی پھلیں بس
میں اک ایسا زمانہ چاہتا ہوں
مجھے نفرت کسی سے کیوں ہو عامرؔ؟
اسے میں کیوں گرانا چاہتا ہوں؟

عطاءالمجیب راشد

کیوں نہیں لوگو تمہیں خوفِ خدا
کیوں بھلا بیٹھے ہو تم روزِ جزا
جو لگایا میرے مولا نے شجر
کاٹ ڈالو گے اسے کیسے بھلا؟
شاہد و مشہود کے انکار پر
روبرو مولیٰ کے تم بولو گے کیا؟
ظلم کرتے ہو عبث تم رات دن
کیوں بنے پھرتے ہو تم خود ہی خدا
سوچ لو کہ ظلم کی پاداش سے
کوئی بچتا تم نے دیکھا ہے بھلا؟
خوں شہیدانِ وفا کا ظالمو!
رنگ لائے گا یقیناً جا بجا
یاد رکھنا جب پکڑتا ہے خدا
نقش دھرتی سے وہ دیتا ہے مِٹا
آج ہر اِک ملک میں ہر احمدی
کر رہا ہے اپنے مولیٰ سے دُعا
”کچھ نمونہ اپنی قدرت کا دکھا
تجھ کو سب قدرت ہے اے ربّ الوریٰ“

خواجہ عبدالمومن

دیکھے ہیں حسیں میں نے زمانے میں ہزاروں
پر حسن ترا سارے حسینوں سے سوا ہے
کیا نور ہے جو تجھ کو ملا ماہِ مبیں سے
کیا رنگ ہے جو سارے زمانے سے جدا ہے
لب کھلتے ہی پھولوں کی مہک آتی ہے تجھ سے
ہر دل پہ ترے نطق کا جادو سا چلا ہے
سوتا ہوں تو خوابوں میں نظر آتا ہے مجھ کو
حیراں ہوں تو خانۂ ویراں میں بسا ہے
کچھ روشنی جو مجھ میں سدا رہتی ہے روشن
یہ تیرا کرم تیری محبت کی ضیاء ہے

انیس رئیسؔ

آنکھ کو اشکبار ہونے دو
خُوب سینہ فِگار ہونے دو
جی جلانے دو آج فرقت میں
حالتیں آشکار ہونے دو
اشکِ نادم سے چاک داماں تک
بس فقط سوگوار ہونے دو
اول اول جو خواب دیکھے تھے
تم انہیں تار تار ہونے دو
بھول جاؤ سبھی حسیں لمحے
دو گھڑی بے قرار ہونے دو
ہم پہ گزرا فراق کا محشر
سانحے اب ہزار ہونے دو
چند یادیں ہیں مونس ہجراں
بس انہیں مشکبار ہونے دو
صبح ہونے کا انتظار انیسؔ
کچھ فضا سازگار ہونے دو

راشد

جسم سے جان جا رہی ہوگی
جب تُو مُجھ سے جُدا رہی ہوگی
موت تنہا نہ ہوگی رَقصِ کُناں
زندگی ساتھ گا رہی ہوگی
چاند کی چاندنی دَرَخشاں ہے
جان بے پردہ آرہی ہوگی
کرکے محصُور مُجھ کو زُلفوں میں
مُجھ کو خود میں چُھپا رہی ہوگی
بیٹھ دو زانوں سر جھکائے جاں
کرب دل کا سُنا رہی ہوگی
جُھول کر سَربَسَر وہ دار پہ یُوں
کوئی وعدہ نبھا رہی ہوگی
جس کا چہرہ ہے غم زدہ اُس کی
یاد کوئی ستا رہی ہوگی
رِند ہُوں پر میں ہوش میں ہُوں یہاں
مے کشی ڈگمگا رہی ہوگی
اَشک کب ہیں عذاب دل کا ہے یہ
آنکھ بس بوجھ اُٹھا رہی ہوگی
آتشِ عشق سے جلا کے لہو
خاک سر پر اُڑا رہی ہو گی
پہلے راشد وہ دل کی حسرت تھی
کیا کہوں پھر وہ کیا رہی ہو گی

اکرم جاذب

کچھ بھی دنیا میں کہاں دوستو،حسرت سے ملا
عیش تو عیش مجھے رنج بھی محنت سے ملا
آگہی، تجربے، خوش فہمیاں، امید نئی
کیا سے کیا کچھ نہ مجھے ترکِ سکونت سے ملا
کتنا مکروہ لگا قیمتی ملبوس اس کا
ایک نادار سے جو شخص کراہت سے ملا
فکر و تحقیق و طلب اور عمل کو چھوڑیں
وہ دکھائیں کہ خدا جس کو عبادت سے ملا
دسترس میں جو نظر آیا تھا پہلے پہلے
وہ خزانہ مجھے برسوں کی ریاضت سے ملا

دیکھنا چھین بھی سکتا ہوں اسے آپ سے میں
تاجِ سلطانی اگر میری حمایت سے ملا
وہ جو مشکل سے لگا ہاتھ، لگایا دل سے
کھو دیا میں نے بھی جاذب جو سہولت سے ملا

عبدالرحمان واصف

ہو گیا عشق والہانہ مجھے
اب سنبھالے گا کیا زمانہ مجھے
چشم و دل میں چراغ جلتے ہیں
سوچتا ہے وہ دلبرانہ مجھے
اس کی تصویر ہاتھ کیا آئی
مل گیا ہے کوئی خزانہ مجھے
بے گھری ختم ہوگئی ہے مری
آ گیا راس دوستانہ مجھے
یہ مری ذات اک حقیقت ہے
تو سمجھتا ہے کیوں فسانہ مجھے
یہ تعلق بھی کیا تعلق تھا
فرق تجھ کو کوئی پڑا نہ مجھے
سوکھتا جا رہا ہے میرا بدن
تُو نے رکھا ہرا بھرا نہ مجھے
ایک بگولا بنائے رکھتا ہے
نارسائی کا تازیانہ مجھے
کر گیا اک جہان کا دشمن
ایک اندازِ دوستانہ مجھے
میں ترے خال و خد اُچک لوں گا
اس قدر شوق سے بنا نہ مجھے
دیکھ تجھ کو نہ بھول جاؤں کہیں
اتنا میرے قریب لا نہ مجھے
میں نے دل سے طلب نکالنی ہے
مشورہ دے مدبرانہ مجھے
عقل سے پھر نباہ کیا ہوتا
اس کو مجھ پہ یقین تھا نہ مجھے
اب مرا انتظار بھی کرنا
کر کے اپنی طرف روانہ مجھے

آفتاب مضطر

عجیب راز مری گفتگو کے فن سے کھلا
میں پہلی بار جو اس شوخ گل بدن سے کھلا
نکلتی کیسے ہے گل کے حصار سے خوشبو
یہ راز کل تری خوشبوئے پیرہن سے کھلا
بس ایک بند میں پابند تھا لباسِ بہار
یہ ایک بند مگر ناخنِ چمن سے کھلا
کسے مجال، کہ ہشیار بن کے اُس سے کھلے
سو جان بوجھ کے میں لا اُبالی پن سے کھلا
فسونِ حلقۂ شب ٹوٹنے کا واقعی حال
بہ وقتِ صبحِ طرب اولیں کرن سے کھلا
کٹھن تھا کھولنا اُردو کی زلف کا ہر پیچ
کھلا ضرور، مگر میرؔ کے سخن سے کھلا
کھلا، کہ وہ بھی ہے تنہا مری طرح مضطرؔ
میں کنجِ بزم میں جب جانِ انجمن سے کھلا

دوستی گزرتا سال ہے

اور سال کا یہ آخری دن ہے
ابھی کچھ دھوپ ہے لیکن
ذرا سی دیر کو طے ہے کہ آخر شام ہونی ہے
حقیقت یا کہانی جو بھی ہے انجام ہونی ہے
اگر طے ہے یہی ہونا تو پھر کس بات کا خدشہ؟
تو پھر کس بات کا رونا؟
چلو مل بیٹھ کر اپنے خسارے بانٹ لیتے ہیں
سبھی رنگ اور جگنو اور ستارے بانٹ لیتے ہیں
گزرتا سال ہے اور سال کا یہ آخری دن ہے
ابھی کچھ دھوپ ہے لیکن
ذرا سی دیر کو طے ہے کہ آخر شام ہونی ہے
اگر طے ہے یہی ہونا
تو کیوں نہ شام سے پہلے کسی انجام سے پہلے
بھلا کر ہر پریشانی جھٹک کر ہر تکلف کو
جو کچھ گھڑیاں میسر ہیں انہیں میں زندگی کر لیں
کسی احساس کی شمع جلا کر ان اندھیروں میں
کوئی دم روشنی کر لیں چلو ہم دوستی کر لیں

ارشد ملک

دل و جاں سے عقیدت ہوگئی ہے
مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے
میں قسمت کو بدلنا چاہتا تھا
جدائی میری قسمت ہوگئی ہے
تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں
اکیلے پن سے وحشت ہوگئی ہے
میں اب پھولوں کو رکھتا ہوں چھپا کے
بکھرنے کی جو عادت ہو گئی ہے
یہ سوچا تھا کہ تم کو بھول جاؤں
مرے اندر بغاوت ہوگئی ہے
اندھیری زندگی میں روشنی بھی
تمہاری ہی بدولت ہوگئی ہے

جان کاشمیری

وہ پھول جو تقسیم لطافت نہیں کرتا
کھلتا ہے مگر کھل کے قیامت نہیں کرتا
تم اور کسی دیس کی مخلوق ہو شاید
انسان تو انسان سے نفرت نہیں کرتا
اک نقطے کی تفریق کو سمجھی نہیں دنیا
رحمت کے لیے بھی کوئی زحمت نہیں کرتا
آپس میں الجھنے کے سزاوار ہیں عاقل
پاگل کبھی پاگل کی شکایت نہیں کرتا
ہر شخص پہ اللہ کی رحمت نہیں ہوتی
ہر شخص ستم سہہ کے بغاوت نہیں کرتا
تم اپنی بڑائی کے لیے مجھ سے نہ الجھو
دریا کی، سمندر تو اطاعت نہیں کرتا
اے جانؔ سدا دل کے اشارے پہ چلے کیوں
کافر تو مسلماں کی امامت نہیں کرتا

اسد اعوان

مقتل سے کبھی جرأت اظہار سے نکلا
پندارِ وفا بندۂ خوددار سے نکلا
خود اپنی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا ہم نے
اک دشمن جاں کل جو درِ یار سے نکلا
جس کو نہ کبھی اہل محلہ نے بھی دیکھا
صد حیف وہی دوستو ، بازار سے نکلا
ہم نے تو تیرے عیب کو لوگوں سے چھپایا
یہ راز مگر حلقۂ اغیار سے نکلا
دشمن کے لیے موت کا پیغام بنا تھا
میدان میں جو عکس بھی تلوار سے نکلا
چھینٹے ہیں اسدؔ جس کے لبادے پہ لہو کے
یہ شخص کسی کوچۂ سنگ بار سے نکلا

تنویر پھول

برائے نام ہی رسم وفا نبھانے کو
چلے بھی آؤ کہ چین آئے اس زمانے کو
تلے جو بیٹھے ہو تم زندگی لٹانے کو
کہا تھا کس نے تمہیں اس سے دل لگانے کو
تمہارے طرزِ تغافل کا یہ کرشمہ ہے
ملا ہے اک نیا عنوان اس فسانے کو
ستم یہ برق کا دل سے بھلا نہیں سکتے
لگا دی آگ بہاراں میں آشیانے کو
زبانِ اشک نے لمحوں میں داستاں کہہ دی
رہا نہ لب پہ کوئی ماجرا سنانے کو
چمن میں علم و ادب کے ہیں ایسے لعل و گہر
نہ کوئی لوٹ سکا پھولؔ اس خزانے کو

سید اذلان شاہ

کچھ پھول ہیں، تتلی بھی ہے گلدان پڑا ہے
یہ میں پڑا ہوں یہ مرا نقصان پڑا ہے
دُشمن کا تعاقب کوئی کیوں کر لگا کرنے
انسان کے پیچھے یہی انسان پڑا ہے
پہلے کبھی دنیا سے محبت نہیں مانگی
یہ قحط ترے ہجر کے دوران پڑا ہے
خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا ہے تو اک دم
پیروں پہ مرے کون یہ اب آن پڑا ہے
ہر بار گزرنا مجھے پڑتا ہے الجھ کر
بکھرا ہوا گھر کا سبھی سامان پڑا ہے

تنزیلہ ظفر

اے کاش میں بھی کہہ سکوں
میں عاشقِ رسولؐ ہوں
مجھے عشق ہے رسولؐ سے
یارب مجھے سکھا دے تُو
آداب کیا ہیں عشق کے
واقف نہیں ہوں جن سے میں
بدلے میں اک درود کے
ملتا ہے دس گنا یہاں
یہ عشق ہے متاعِ جاں
اس عشق میں سرور ہے
اے کاش میں بھی کہہ سکوں
میں عاشقِ رسولؐ ہوں
مجھے عشق ہے رسولؐ سے

حسن عباسی

تیری مشکل نہ بڑھاؤں گا چلا جاؤں گا
اشک آنکھوں میں چھپاؤں گا چلا جاؤں گا
اپنی دہلیز پہ کچھ دیر پڑا رہنے دے
جیسے ہی ہوش میں آؤں گا چلا جاؤں گا
مدتوں بعد میں آیا ہوں پرانے گھر میں
خود کو جی بھر کر رلاؤں گا چلا جاؤں گا
چند یادیں مجھے بچوں کی طرح پیاری ہیں
ان کو سینے سے لگاؤں گا چلا جاؤں گا
خواب لینے کوئی آئے کہ نہ آئے کوئی
میں تو آواز لگاؤں گا چلا جاؤں گا
آج کی رات گزاروں گا مدینے میں حسنؔ
صبح تلوار اٹھاؤں گا چلا جاؤں گا

افضل گوہر

اچھا ہوا کنارا کٹاؤ میں آ گیا
دریا رُکا ہوا تھا بہاؤ میں آ گیا
کروٹ بدل کے سانس لیا تھا زمین نے
اور آسمان یوں ہی تناؤ میں آ گیا
حیرت ہے چند برف کے پھولوں کے بوجھ سے
کس طرح یہ پہاڑ جھکاؤ میں آ گیا
چوپال کی بھڑکتی کہانی کے شوق میں
کیا جانے کون کون الاؤ میں آ گیا
سوچا تھا اب کی بار کنارے پہ جاؤں گا
دریا بھی میرے ساتھ ہی ناؤ میں آ گیا

ذوالفقار احسن

یہ شام کا بڑھتا ہوا سایہ ہے کہ میں ہوں
تا حدِ نظر آنکھ میں صحرا ہے کہ میں ہوں
آخر تجھے یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا
تیرے لیے بہتر تری دُنیا ہے کہ میں ہوں
تصدیق جو تُو نے مرے ہونے کی ابھی کی
یہ دیکھ کے میں نے بھی یہ سوچا ہے کہ میں ہوں
جھلمل کبھی احساس میں بکھری تو یہ سوچا
مہتاب کسی جھیل میں اُترا ہے کہ میں ہوں
ایسے ہی تذبذب میں پڑا سوچ رہا ہوں
بادل ہی بہت ٹوٹ کے برسا ہے کہ میں ہوں
منظر جو یہ دیکھا ہے تو دل کانپ اٹھا ہے
یہ شاخ سے ٹوٹا ہوا پتا ہے کہ میں ہوں
اُن آنکھوں میں کیا جانیے، کیا بات ہے احسنؔ
دیکھا جو کسی نے یہی سمجھا ہے کہ میں ہوں

رفیع الدین راز

جب تری یاد دل و دیدہ میں در آتی ہے
رنگ تو رنگ ہے خوشبو بھی نظر آتی ہے
درد خود راہ بنا لیتا ہے جسم و جاں میں
روشنی بند دریچوں سے بھی در آتی ہے
شاید اس راہ سے جگنو کوئی گزرا ہے ابھی
تیرگی رات کی خائف سی نظر آتی ہے
ضبط کی حد سے نہ گزرو کہ بکھر جاؤ گے
پیاس کو ہونٹوں تک آنے دو اگر آتی ہے
روشِ عجز پہ اک سجدۂ دستارِ اَنا
دھوپ دیوار سے نیچے بھی اتر آتی ہے
قلب کے روزن و در راز ابھی وا رکھنا
بے اثر ہو جو دعا لوٹ کے گھر آتی ہے

زیب النساء زیبی

کربِ جدائی، قرب کی سرشاریوں کے بعد
غم دے کے چل دیا کوئی غم خواریوں کے بعد
مجھ کو رُلا رُلا کے ہنسانے کی کوششیں
دل جوئی کر رہے ہیں دل آزاریوں کے بعد
راہ طلب میں ٹھوکریں کھا کر کھلا یہ راز
آسانیوں کا لطف ہے دشواریوں کے بعد
میں جانتی ہوں اس کی محبت فریب ہے
وہ مطمئن ہے اپنی اداکاریوں کے بعد
مدت کے بعد نیند جو آئی تو یوں لگا
قسمت کو رحم آ گیا ہے بیداریوں کے بعد
زیبیؔ یہ دل لگی تو نہیں ہے نصیب کی
عہد وفا کسی کا، جفاکاریوں کے بعد

سید شاہ اختر غزالی کاکوی

دل کی لگی ہے یا کہ تری بے رخی سے ہم
کتنے فریب کھائیں بتا سادگی سے ہم
ہم سے تمام عمر گریزاں رہی ہے جو
ناراض ہوگئے ہیں اُسی زندگی سے ہم
احوال پوچھتے ہو کسی اجنبی کے طور
احوال کیا کہیں گے کسی اجنبی سے ہم
رہتا ہے چاند چہرہ خیالوں میں خواب میں
اے یار جی رہے ہیں تری روشنی سے ہم
سچی محبتوں میں ہمارا بھی ہو شمار
واقف ہے ہم سے عشق، غمِ عاشقی سے ہم
وعدہ خلاف بن کے کرے انکساریاں
عاجز سے آ گئے ہیں تری عاجزی سے ہم
مہر و نجوم و ماہ غزالی کے دوست ہیں
پھر کیوں ڈریں گے رات تری تیرگی سے ہم

شاعر علی شاعر

پھول، کلیاں، شاخ، پتے ٹہنیاں ہوتے ہوئے
رونقِ گلشن نہیں ہے تتلیاں ہوتے ہوئے
اس شجر پر سانپ کوئی چڑھ کے بیٹھا ہے کہیں
تار پر بیٹھی ہیں چڑیاں آشیاں ہوتے ہوئے
کس نے رکھا ہے یہاں انسانیت کے منہ پہ ہاتھ
شہر اتنا چپ ہے کیوں سرگوشیاں ہوتے ہوئے
یہ ہیں میرے عہد کے دہقاں انہیں سمجھائے کون
بیج ضائع کر رہے ہیں کھیتیاں ہوتے ہوئے
باپ کو فرصت نہیں ہے پوچھ لے اولاد سے

کون سا کالج کھلا ہے چھٹیاں ہوتے ہوئے
زندگی کرنا ہنر ہے جان لیوا ! مجھ کو دیکھ
کتنا ثابت لگ رہا ہوں کرچیاں ہوتے ہوئے
شاعرؔ دل گیر بھی ہے اس زمانے کا ولی
کتنا میٹھا بولتا ہے تلخیاں ہوتے ہوئے

شاکر کنڈان

میں نہیں جانتا کتنا تجھے دیکھا تھا کہ بس
عکس اک آنکھ کی دہلیز پہ اترا تھا کہ بس
ہو گئے ذہن میں سب سوچ کے خلیے جامد
کوئی خوشبو کی طرح پاس سے گزرا تھا کہ بس
پھر نہ قرطاس و قلم سے رہا رشتہ باقی
کون سا ایسا وہ اک لفظ جو لکھا تھا کہ بس
بعد ازاں پھر نہ کبھی رتجگے جانے پائے
ایک شب خواب میں کوئی نظر آیا تھا کہ بس
پھر نہ تصویر کسی طور مکمل دیکھی !
دل کا آئینہ تری یاد میں چٹخا تھا کہ بس
مجھ کو جو اڑتے ہوئے شام ہوئی ہے شاکرؔ
خواہشِ رزق میں کیا میں بھی پرندہ تھا کہ بس

شاہدہ لطیف

اک غم زدہ سی رات ہے تارے اداس ہیں
لگتا ہے اس زمین پہ سارے اداس ہیں
کیسا یہ کھیل وقت نے کھیلا ہے دیکھئے
جیتے اگر اداس تو ہارے اداس ہیں
لگتا ہے آسمان بھی رویا ہے رات بھر
اشکوں کے یہ رواں دواں دھارے اداس ہیں
اب چاند جھانکتا رہے بادل کی اوٹ سے
ایسی نظر کے سارے نظارے اداس ہیں
ہیں پیش جی کو ہجر کی لمبی مسافتیں
وہ قسمتوں کی موت کے مارے اداس ہیں
خونِ جگر سے لکھے ہیں اشعار شاہدہؔ
وہ شاہکار فن کے وہ پارے اداس ہیں

شفیق آصف

آرزوئے جاں کے جب سے رابطے کم ہو گئے
ایسے لگتا ہے کہ اپنے حوصلے کم ہو گئے
ہم نے منظر کی کشش کو اپنی آنکھیں سونپ دیں
صورتوں کی بھیڑ میں جب آئینے کم ہو گئے
چل رہی ہیں دشتِ جاں میں دوریوں کی آندھیاں
جانے کیسے چاہتوں کے سلسلے کم ہو گئے
پھر فصیلِ جاں سے اُبھرا اک مکمل آفتاب
روشنی بڑھنے لگی تو حادثے کم ہو گئے
شہر میں بپھری ہوئی تھی بدگمانی کی ہوا
اور چراغِ عزم سے کچھ واہمے کم ہو گئے
اب مسافر سے سفر آغاز ہوتا کیوں نہیں
اب تو آصفؔ راستوں کے وسوسے کم ہو گئے

صائمہ ملک

کہیں پہ ٹوٹا ستارا تو آنکھ بھر آئی
خیال آیا تمہارا تو آنکھ بھر آئی
محبتوں کے شب و روز یاد آنے لگے
کہیں ملا وہ دوبارہ تو آنکھ بھر آئی
تمہارے خواب مری ملکیت میں ہوتے تھے
ہوا کسی کا اجارہ تو آنکھ بھر آئی
تمہارے بعد کسی بھی خوشی کے موقع پر
کبھی جو خود کو سنوارا تو آنکھ بھر آئی
گئے دنوں کے جھروکے سے یاد کر کے مجھے
کسی نے یونہی پکارا تو آنکھ بھر آئی
تمام عمر اکیلے گزار دی اور اب
ملا کسی کا سہارا تو آنکھ بھر آئی
میں صائمہ کبھی لہروں کبھی بھنور میں رہی
نظر جو آیا کنارا تو آنکھ بھر آئی

فوزیہ مغل

نہ میں خیال میں تیرے نہ میں گمان میں ہوں
یقین دل کو نہیں ہے کہ اس جہان میں ہوں
خدایا رکھئے گا دنیا میں سرفراز مجھے
میں پہلے عشق کے پہلے ہی امتحان میں ہوں
وہ جس کو دیکھ کے بچے بھی سارے چھوڑ گئے
میں ایک ٹوٹا کھلونا کسی دُکان میں ہوں
یہ اور بات نہ چھت ہے نہ اس میں دروازے
خدا کا شکر ہے اپنے ہی میں مکان میں ہوں
بڑا طویل سفر تھا یہ زندگی کا میری
فرشتوں سونے دو مجھ کو کہ میں تھکان میں ہوں
اب ان سے کیا کہوں فوزیہؔ کہ میں تو اب بھی
کبھی میں ناں تو کبھی ہاں کے درمیان میں ہوں

سید مرتضیٰ حسن

آخری سطروں میں یہ ہونا بھی ہے
اس کہانی میں تجھے کھونا بھی ہے
رتجگے بھی سامنے ہیں خواب بھی
جاگنا بھی ہے ہمیں سونا بھی ہے
اتنی بے پروائیاں اچھی نہیں

ایک دن تجھ کو مرا ہونا بھی ہے
مسکرانا ہے کسی کو دیکھ کر
پھر اسی کو دیکھ کر رونا بھی ہے
آج میلا کر رہے ہو کیوں اسے
کل اگر تم نے اسے دھونا بھی ہے
آنسوؤں کی فصل کی خاطر حسنؔ
درد آنکھوں میں کوئی بونا بھی ہے

ڈاکٹر اختر ہاشمی

تسکین کے لمحات کو آنے نہیں دیتا
پیاسا ہوں مجھے پیاس بجھانے نہیں دیتا
ہر روشنی پہ جیسے اسی کا ہو تسلط
اک شمع مجھے گھر میں جلانے نہیں دیتا
یہ کون ہوا ہے نگراں میرے چمن کا
بچوں کو میرے باغ میں جانے نہیں دیتا
دیکھو یہ ذرا منتظم شہر کا کردار
لقمہ بھی کوئی ہونٹ تک آنے نہیں دیتا
ہے اتنا ہواؤں پہ زمانے کا تصرف
دیوار میں اک در بھی بنانے نہیں دیتا
اللہ رے ماحول کی یہ کرب نوازی
آنسو جو بہاؤں تو بہانے نہیں دیتا
کچھ اس کا خلا پر بھی اثر ہے کوئی اخترؔ
یادوں کو جو سر پر میرے آنے نہیں دیت

مجھے مایوس مت کرنا ہے

مجھے مایوس مت کرنا ِ مجھے مایوس مت کرنا
میری برسوں سے خواہش ہے تمہیں
اپنا بنانے کی تمہارے پاس آنے کی
سو اب موقع ملا مجھ کو کہ دل کی بات کہہ ڈالوں
تیرے نزدیک آ جاؤں میں تیری دھڑکنیں بن کر
تیرے دل میں سما جاؤں مجھے مایوس مت کرنا
تمہیں احساس ہو جائے میری بے لوث چاہت کا
اور تم سے بے دھڑک کہہ دوں
میں تم سے پیار کرتا ہوں
مگر پہلے یہ کہنے سے میرے سالک میں ڈرتا تھا
نہ کوئی بات کرتا تھا
مجھے مایوس مت کرنا مجھے مایوس مت کرنا
جو کہنی تھی وہ میں نے بات دل کی تم سے کہہ ڈالی
مجھے مایوس مت کرنا ِ مجھے اپنا بنا لینا

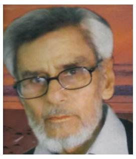

رئیس الدین رئیسؔ علی گڑھ

جو چھپ گیا ہے کہیں وہ ستارہ ڈھونڈتا ہے
عجیب شخص ہے جلوہ دوبارہ ڈھونڈتا ہے
وہ کود پڑتا ہے پہلے بپھرے دریا میں
پھر اس کے بعد مسلسل کنارہ ڈھونڈتا ہے
کہاں یہ تاب کوئی اور ماہ صورت ہو
مرا یہ دل تو وہی ماہ پارہ ڈھونڈتا ہے
دیا جلاتا ہے سورج کے سامنے کیوں وہ
جو شب میں صبح کا اکثر نظارہ ڈھونڈتا ہے
بلندیوں سے اندھیرے برستے رہتے ہیں
وہ پستیوں میں انا کا منارہ ڈھونڈتا ہے
تلاشِ جاں نہیں اس کو تو اور کیا ہے رئیسؔ
کہ راکھ میں بھی وہ روشن شرارہ ڈھونڈتا ہے

حبیب سیفی (نیو دہلی انڈیا)

شجر سے زرد پتوں کا جدا ہونا ضروری ہے
تقاضا وقت کا گر ہے ادا ہونا ضروری ہے
وہ کر اعمال جن سے ہو خدا راضی پڑوسی بھی
تو چاہے گر ہر اک حامی ترا ہونا ضروری ہے
تری زندہ دلی کا میں بھی قائل ہو ہی جاؤں گا
زباں سے بات حق کی بس ادا ہونا ضروری ہے
تغیر اور تبدل ہے اگر انسان کی فطرت
مری بھی خواہش ہے نیا ہونا ضروری ہے
مرصع غزلوں کی وقعت تمہاری کون جانے گا
اگر شاعر ہے کہلانا گلا ہونا بھی ضروری ہے
شفا دینا نہ دینا تو خدا کے بس میں ہے سیفیؔ
مرض کیسا بھی ہو لیکن دوا ہونا ضروری ہے

شیر محمد گمنامؔ نصیر آبادی

ہر اک انساں سے انساں کی طرح گفتار کرنا ہے
محبت بھائی چارے کی فضا ہموار کرنا ہے
مٹا دو ظلم دنیا سے رہے امن و اماں قائم
قلمکار و قلم کو اب ہمیں تلوار کرنا ہے
وہ جس نے کر دیا ہے دور بھائی سے بھائی کو
ہمیں نفرت کی اُس دیوار کو مسمار کرنا ہے
ہر اک اہلِ ادب اہلِ بصیرت کا ہے یہ کہنا
ادب کے واسطے ہم کو بھی کچھ ایثار کرنا ہے
ہمارا ازم محکم ایک دن ساحل پہ لائے گا
ہمیں ٹوٹی ہوئی کشتی سے دریا پار کرنا ہے
نہ ہو جاؤں کہیں گمنامؔ آ جاؤ عیادت کو
مریضِ عشق کا تم کو اگر دیدار کرنا ہے

خالد قیصر (خیری انڈیا)

اپنی نظروں میں گنہگار سے ہو جاتے ہیں
دور ہوں تجھ سے تو بیمار سے ہو جاتے ہیں

منزلیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں مگر خود ہم لوگ
اپنی ہی راہ میں دیوار سے ہو جاتے ہیں
غم چھپانا کوئی آساں ہے اس کوشش میں
غم کے مارے بھی اداکار سے ہو جاتے ہیں
خوف و دہشت کا وہ عالم ہے کہ ہر آہٹ پر
بے خبر لوگ بھی ہشیار سے ہو جاتے ہیں
میں نے رکھا ہے وہ معیارِ عداوت خالدؔ
میرے دشمن مرے غمخوار سے ہو جاتے ہیں

قطعہ۔امتہ الباسط آیاز

ملازم نے صاحب سے رو کر کہا
کہ میڈم نے مارا ہے سوتے ہوئے
کہا سن کے صاحب نے تو کیا ہوا
کہا مجھ کو دیکھا ہے روتے ہوئے

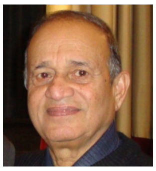

امجد مرزا امجد

عاشقِ حُسنِ تاب ہم ہی نہیں
اِک اسیرِ شَباب ہم ہی نہیں
اور بھی درد ہیں زمانے میں
باعثِ اِضطراب ہم ہی نہیں
کچھ خطا آپ کی بھی ہے شامِل
صِرف مجرم جناب! ہم ہی نہیں
بات برَجستہ تم بھی کرتے ہو
ایک حاضر جواب ہم ہی نہیں
تم بھی اپنا محاسبہ کرو امجدؔ
قابلِ احتساب ہم ہی نہیں

منا بھی لوں گا گلے بھی لگاؤں گا میں علیؔ
ابھی تو دیکھ رہا ہوں اسے خفا کر کے

پروفیسر مبارک عابدؔ

تمام عمر یہی ایک کام کرتے رہے
کہ ہم نے جو بھی لکھا اس کے نام کرتے رہے
وہ جن درختوں نے رستے میں دی پناہ ہمیں
ہم ان کے سایوں کا بھی احترام کرتے رہے
ملیں گے تجھ کو کہاں دوست ہم سے دیوانے
جو تیرے نقشِ قدم سے کلام کرتے رہے
انا کہ اپنی ہی تصویر سامنے رکھ کر
وہ بار بار اسے ہی سلام کرتے رہے
وہاں کی مٹی میں خود رو گلاب اُگتے ہیں
وہ خوش خرام جہاں پر خرام کرتے رہے
کچھ ایسے ہی دن بھی ہیں آئے حیاتِ انساں میں
کہ جب صبح کے اُجالے بھی شام کرتے رہے
گلاب رُت کی بھی کچھ ایسی ہے بے خودی عابدؔ
کہ ہم گلابوں سے لبریز جام کرتے رہے

عبدالکریم قدسیؔ

اِک تازہ واردات بڑی دیر جاگ کر
لکھی غزل ہے رات بڑی دیر جاگ کر
آساں نہیں ہے قافیہ پیمائی کا صبر
بنتی اٹکل ہے بات بڑی دیر جاگ کر
کمزور ہیں نہتے اکیلے سہی مگر
ظالم کو دیں گے مات بڑی دیر جاگ کر
نیندیں شہید ہوں گی تو تب جا کے آئے گی
کی۔۔۔ یہ بارات بڑی دیر جاگ کر
اِک شُبھ گھڑی میں کرتے آپس میں بات چیت
کاغذ قلم دوات بڑی دیر جاگ کر
رنگین کرتا رہتا ہوں تازہ بیان کے
سب کورے کاغذات بڑی دیر جاگ کر
پیشِ حضور صبح جو قدسیؔ میں کر سکوں
لکھتا ہوں ۔۔بڑی دیر جاگ کر

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

خوش گماں نہ ہو میاں ذرا بھی خوش گماں نہ ہو
جو کیا ہے زندگی میں دیکھ رائیگاں نہ ہو
اس طرح گزار اِس حیاتِ مستعار کو
احتیاط کر کہیں قریب ہی خزاں نہ ہو
شخصیہ اگر لکھوں تو تیرے خدو خال میں
زیورِخصال ہو جبیں پہ کہکشاں نہ ہو
بزمِ حسنِ خوش جمال نعرہِ فلک شگاف
پاوں میں زمیں رہے تو سر پہ آسماں نہ ہو
جس طرح گلاب کھِل کے خوشبوئیں بکھیر دے
بھید دل کا دوسروں سے یوں کبھی بیاں نہ ہو
او قضا یہ سجدہِ خروشِ دل میرے خدا
تو اگر نہ ساتھ ہو نگاہ مہرباں نہ ہو
یہ کس نے لکھ دیے سرِ جبیں نقوشِ رفتگاں
شہرِ دل میں اب کوئی بھی شخص رفتگاں نہ ہو
آپ نے غزل کہی ہے خاص ذوق وشوق سے
محفلِ سخن میں کوئی آپ سا بیاں نہ ہو

ڈاکٹر رویندر کور بھاٹیہ

یہ سوچ کے بہت دور وہ منزل کا نشاں ہے
زخمی ہے بدن پھر بھی میرا عزم جواں ہے
شہروں کی فضاوں میں بھی رکھتا ہے مرے لفظ
صحرا کی زمیں پر بھی رقم میری زباں ہے

اترو تو کبھی اس میں میری آنکھ کے رستے
قدرت کا کرشمہ ہے یہ دلِ حسنِ جہاں ہے
آ پھر سے ملیں اس کی گلی زخم سجا کے
جو راحتِ دل روح بدن محورِ جاں ہے
اک یاس کا صحرا ہے کہ پھیلا ہوا ہر سُو
اک آس کا دریا ہے کہ ہر طرف رواں ہے
جس دیش کی تاریخ لکھی خون سے ہم نے
سنتے ہیں کہ وہ دیش گلابوں کا جہاں ہے
کس طرح یقیں اوڑھ کے سوچ تجھے روتی
بیٹھی ہے ترے پاس مگر پھر بھی کہاں ہے

اسد اللہ خان غالبؔ

درد مِنت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں سن کے بے مزہ نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا
رہ زنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

سہیل ساجد اسٹونز آبادی

مَیں دل میں تجھے لانے کی کوشش تو کروں گا
اِس سال تجھے پانے کی کوشش تو کروں گا
اَب چھوڑ کے اِس دُنیا کی یادوں کے سہارے
قربت میں تری آنے کی کوشش تو کروں گا
ہر سال یہی کہہ کے گزارے ہیں کئی سال
اِس سال بدل جانے کی کوشش تو کروَ ں گا
سچ سچ کو مگر جھوٹ کو اَب جھوٹ لکھوں گا
کڑوا ہے مگر کھانے کی کوشش تو کروں گا
مَیں مان کے خود اَپنی خطا اَپنے گناہ کو
خود خود سے سزا پانے کی کوشش تو کروں گا
ہو جاؤں تیرے فضل کے تابع اِے خداوند
قدموں میں تیرے آنے کوشش تو کروں گا
جس شہر سے بوجہ گناہ نکلا ہُوں ساجدؔ
اُس شہر میں پھر جانے کی کوشش تو کروں گا

نیلم بھٹی مشی گن

دشت میں بحر کے میزان کی تشکیل بھی ہو
درد قائم بھی رہے اور کبھی تحلیل بھی ہو
کون کہتا ہے کہ ہر حکم کی تعمیل بھی ہو
کیا ضروری ہے کہ وعدہ بھی ہو، تکمیل بھی ہو
آنکھ ہی آنکھ میں کرتے ھیں اشارہ اکثر
کیا ہی اچھا ہو اگر ساتھ میں تفصیل بھی ہو
اس فسانے میں لکھو سارے حسیں وعدوں کو
اور وعدے سے مُکر جانے کی تاویل بھی ہو
تم میری آنکھ میں رہتے ہو مسلسل لیکن
اچھا ہوتا ہے کہ منظر کبھی تبدیل بھی ہو
میرے احساس میں زندہ ہے سراپا جس کا
کاسہ ِ خاک میں اس شخص کی تشکیل بھی ہو
بھاگتے پھرتے ہیں سانسوں کا بھرم رکھنے کو
فکرِ دوراں میں کسی روز کی تعطیل بھی ہو
نیند آئے تو فقط نرم سا تکیہ ہی نہیں
آنکھ میں خواب کے امکان کی قندیل بھی ہو
نامہ بر آج سنے بات بھری محفل میں
لطف آجئے، جو قرآن ہو، جبریل بھی ہو
حرف و معنی کا سفر ہے تو ضروری ہو گا
ہاتھ میں فکر کے سامان کی زنبیل بھی ہو
معجزہ علم کا ہوتا ہے جنوں میں نیلمؔ
اس کو لازم ہے صورت بھی ہو تمثیل بھی ہو

مظفر حنفی

لائقِ دید وہ نظارہ تھا
لاکھ نیزے تھے سر ہمارا تھا
ایک آندھی سی کیوں بدن میں ہے
اس نے شاید ہمیں پکارا تھا
باد باں سے اُلجھ گیا لنگر
اور دو ہاتھ پر کنارہ تھا
شکریہ ریشمی دلاسے کا
تیر تو آپ نے ہی مارہ تھا
صاحبو ! بات دسترس کی تھی
ایک جگنو تھا اکِ ستارہ تھا

آساں بوجھ ہی کچھ ایسا ہے
سر جھکانا کسے گوارہ تھا
اب نمک تک نہیں زخموں پر
دوستوں سے بڑا سہارا تھا
آپ منسوب ہیں مظفّر سے
پھول خوشبو کا استعارا تھا

مومن خاں مومن

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو رُوبرو تو اشارتوں میں ہی گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بُری لگی
کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

عبدالحمید حمیدی

سمندر پر سکوں کتنا لگے طوفان سے پہلے
لبوں پر سسکیاں کتنی زرا مسکان سے پہلے
یہ تیری بولتی انکھوں میں جو پیغام رکھا ہے
وہ کہ دیتا ہے ساری بات مجھ کو بیان سے پہلے

نہ جانے جس طرح گوندھا ہے کوزہ گر نے مٹی کو
بڑی بے چینیاں رکھ دی ہیں اسمیں جان سے پہلے
تراشا ہے بڑی فرصت میں مالک نے تجھے جاناں
کہ دیدہ ور نشّے میں ڈوبتا ہے دھیان سے پہلے
یہ زلفوں کے گھنے بادل یہ منظر شام کا مہکا
بنا ڈالا ہمیں کافر زرا ایمان سے پہلے
یہ جگ مگ نور کا ہالا، پریشاں چاند تھوڑا سا
گلے ملنے چلا آیا تجھے آسمان سے پہلے
یہ آنکھیں جھیل کا منظر بسے خوابوں کا مسکن ہیں
نظاروں نے انہیں دیکھا کسی انسان سے پہلے

نجمہ محبوب نجمہ

دو قدم چلنا بھی اب دشوار ہے
ہر طرف گردِ خیالِ یار ہے
توڑ دیجے خدا کے واسطے
درمیاں اپنے جو یہ دیوار ہے
وقت کیا سانسوں پہ اپنا بس نہیں
واقعی انساں بہت لاچار ہے
کیجیے کس پر بھروسہ دوستو
ہر کوئی تو اجکل ہشیار ہے
آبھی جاو نا! عیادت کے لئے
کچھ دنوں سے دل بہت بیمار ہے
اس کی فطرت ہے بہت ہنگامہ خیز
اور مجھ کو خامشی سے پیار ہے

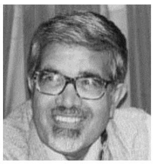

ڈاکٹر پرویز پروازی

وقت ناوقت ہوا، جاں بنی رہتی ہے
سر پہ چادر کی اداسی کی تنی رہتی ہے
دل بھی قابو میں نہیں آنکھ بھی قابو میں نہیں
اور ان دونوں میں ہر وقت ٹھنی رہتی ہے
کام ہی اسکو نہیں زہر اُگلنے کے سوا
شیخ کے منہ میں کوئی ناگ پھنی رہتی ہے
لاکھ نکلا کریں ارماں بھی دلوں کے، پھر بھی
ایک حسرت ہے کہ اللہ غنی، رہتی ہے
کچھ نہیں کھلتا سینے کے نہاں خانے میں
سانس رہتی کہ نیزے کی انی رہتی ہے

محبوب عالم طارق اوکاڑہ

پِیا وچھوڑا رُت ایسے موج بہاراں دی
غوطے کھاندی بیڑی قول قراراں دی
یار ملن تے دل دروازہ کھول دیاں
نِت ای رہندی حسرت چنگے یاراں دی
دل دی چھٹی ہنجواں نال اے پوچ لئی
پیڑ اجے نہ مُکی گھجیاں ماراں دی
موتی پیار خزانے دے انمول بڑے
بے قدرے کی کرن قدر پیاراں دی
ذہن لیاواں کتھوں چنگی سوچ لئی
اجڑی دیکھی دنیا روپ خماراں دی
انّھے ترسن جگ دے رونق میلے نوں
اکھاں والے کردے دید ہزاراں دی
بند زبان کدی نہ دیندی بول پیا
سُنی پیندی گل بات لچاراں دی
کرم کرے رب طارقؔ ادب خزانے تے
رہوے سلامت محفل ادبی یاراں دی

مولانا رومیؒ
خاموش رہو!
صرف خدا ہی
تمہارے دل کا بوجھ
ہلکا کرسکتا ہے۔

محترمہ اسماءصبا خواج کا انٹرویو

جناب محمد سوز علی سوز صاحب

ہندوستان سے اسماءصبا خواج کا انٹرویو پاکستان کے اردو ادب چینل جناب محمد سوز علی سوز صاحب کے ساتھ گلستانِ ادب میں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں جنہوں نے اپنی خوشبو سے ادب کو معطر کیا ہے اسی سلسلے میں ہندوستان کی نئی نسل کی معصوم کلی وہ پھول جو اسماءصبا خواج کے نام سے اردو ادب کا غیر معروف نام بن چکا ہے۔ جن کا تعلق ایک مجاہد آزادی کے گھرانے سے ہے۔ دنیا کے تمام غم و آلام، روزمرہ کے ہونے والے انقلابات کو اپنی فکر و احساسات میں نظم و نثر کا جامہ پہنایا ہے انہوں نے مشاعرے کی دنیا میں قدم تو نہیں جمایا لیکن عالمی سطح پر اخباروں، رسالوں اور سوشل میڈیا کے ذریعے یہ اپنے بہترین افسانوں، غزلوں اور نظموں کے سبب اردو ادب میں جانی و پہچانی جاتی ہیں ان کا مشہور افسانہ مایوسی جو ایک تمثیلی تشویقی و ترغیبی افسانہ ہے۔عشقِ حقیقی ان کے نزدیک وہ شے ہے جس میں انسان رچ بس کر جو سکون حاصل کرسکتا ہے وہ دنیا کے کسی گوشے سے حاصل نہیں کرسکتا ان کا ایک شعر کچھ اسی بات کی ترجمانی کرتا ہے۔

مضطرب دل نے یہ گواہی دی
روح کو چین بندگی سے ملے

آیئے اس غیر معروف شاعرہ وادیبہ سے گفتگو کے آداب کو صفحہ قرطاس پر قلم بند کیا جا تا ہے۔

*۔اپنا خاندانی پس منظر بتایئے۔ آداب سلام، مسنون۔

میں ایک ادنیٰ سی شاعرہ اور مصنفہ ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے سر پر ماں باپ کا سایہ بھی سلامت ہے،ہم صرف دو بہنیں ہیں چھوٹی بہن بیسک اسسٹنٹ گورمینٹ ٹیچر کے ساتھ کاؤنسلنگ سائیکولوجسٹ (مشاورت نفسیات) ماہر تعلیم ہیں۔اس بات پر فخر کرتی ہوں کہ میرے نانا جان (والد محترم کے) جناب کفایت اللہ شیخ منصوری صاحب مجاہد آزادی تھے۔عوام میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے والے مرحوم نانا جان نے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کروائی،غریب مسلم اور غیر مسلم بیٹیوں کی شادیوں میں بھی امداد فرمائی۔اس کے علاوہ بہت سے کارناموں کو بھی انجام دیا تھا۔

*۔آپ نے شاعری میں اصلاح کس سے لی اور پہلا مشاعرہ کب پڑھا؟

میں نے شاعری کی جب شروعات کی،تو میں قافیہ، ردیف مطلع اور مقطع کے علاوہ بحر وارکان کا علم نہیں رکھتی تھی۔لیکن کوشش کرنے کے باوجود اسکے شاعری کی شروعات نعت کے اشعار سے ہوئی۔ بعد میں ایک بزرگ شاعر جناب نسیم مینائی صاحب نے کچھ کلام پر اصلاح فرمائی علم عروض کا معمولی سادرس بھی حاصل ہوا لیکن استاد محترم نسیم مینائی صاحب کے کافی علیل ہوجانے کی وجہ سے بقیہ کلام رہ گیا۔اس کے بعد نایاب شفق صاحب نے اصلاح فرمائی لیکن یہاں بھی سلسلہ زیادہ دن تک نہیں چل سکا۔اور پھر میں نے علم عروض کی کتابوں کی مدد سے خود سیکھنے کی کوشش کی۔کچھ ایسے لوگ جنہوں نے حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے طنز کرتے ہوئے کہا آپ اس میدان کو نہ آزما کر بلکہ نثر میں طبع آزمائی کیجئے۔لیکن میں نے اتنی آسانی کے ساتھ ہمت نہیں ہاری میری بھی ضد تھی کہ اس میدان میں بھی انشاء اللہ فتح حاصل کرنی ہے۔بس پھر سے سلسلہ شروع ہوا اور پھر طبع آزمائی کرتے ہوئے اشعار کہنے شروع کیے۔اللہ کے فضل و کرم سے بیرون ممالک کے جزبی انسٹی ٹیوٹ سے باقاعدہ سند یافتہ علم عروض کی تعلیم حاصل کی اور استاد محترم عقیل صاحب سے اصلاح لینا شروع کیا۔اب خدا کے کرم سے اشعار کہتے ہوئے ان کو جانچ پرکھ کر آخر میں استاد محترم عقیل احمد صاحب یا تو صیف صاحب سے نظر ثانی کروالیتی ہوں۔اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس خاکسار کو اردو ادبی رسائل اور اردو اخبارات کے گوشوں تک یہاں تک کہ ہندی کے رسائل اور اخبارات میں بھی جگہ نصیب ہوئی۔مشاعروں میں شرکت کرنے کی زیادہ دلچسپی نہیں ظاہر کی لیکن یہ میری خوش قسمتی ہے کہ سب سے پہلا بین الاقوامی مشاعرہ جہاں عظیم نامور شعرا کی طویل فہرست تھی وہاں پڑھنا نصیب ہوا۔

*۔اپنے ادبی سفر کے بارے میں کچھ بتایئے؟

مجھے درسی غیر درسی مطالعہ کا شوق بچپن سے رہا خواہ وہ نثری ہوں یا شعری، اردو اور دینوی تعلیم مرحومہ دادی جان کی آغوش میں ہوئی۔لیکن

آگے کی تعلیم اسکول اور کالج سے ہوئی۔ مرحومہ دادی جان ایک اسکول میں مدرس تھیں اپنی علمی و ادبی کاوشوں اور سرگرمیوں سے اہل ذوق میں ایک خاص عزت ومقبولیت کی حامل تھیں۔ صبر کی انتہا یہ تھی جب آخری عمر کا پڑاؤ ہوا تو کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگئیں اور اس موذی مرض کو اللہ کی نعمت قرار دیا۔علم و ادب کے میدان میں میری جو بھی شناخت ہے اسمیں میری دادی جان کا اہم کردار ہے۔ دادی جان شاعرہ تو نہیں تھیں لیکن شاعری کے ذوق وشوق کیساتھ سمجھنے کی بھی صلاحیت رکھتی تھیں۔ جب میں چھوٹی تھی تو اکثر دادی جان مجھے پاس بٹھا کر حفیظ جالندھری صاحب کی مثنوی شاہنامہ اسلام پڑھکر سنایا کرتی تھیں۔ اسی دوران دادی جان نے مثنوی شاہنامہ اسلام اور نثر میں تاریخ فرشتہ کی کتابیں مجھے ہدیہ میں عطا کیں۔ بس یہیں سے ہی مجھے شاعری کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ اور میرا رجان شاعری کی طرف مائل ہوا۔ آہستہ آہستہ طبع آزمائی کرتے ہوئے میں نے اشعار کہنے شروع کیے پھر سب سے پہلے میں نے نعت کے اشعار کہے۔ زور قلم کو مضبوط بنانے کے لئے استاد کی ضرورت محسوس ہوئی کچھ عرصہ بعد استاد محترم نسیم بینائی صاحب سے رابطہ ہوا لیکن انکی زندگی نے زیادہ دن وفا نہیں کی۔ پھر جو سلسلہ چلا وہ میں پچھلے سوال میں کر چکی ہوں۔

***۔آپ کے خیال میں شاعری کی کون سی صنف معتبر صنف سخن ہے؟**

میرے خیال میں شاعری میں غزل معتبر صنف سخن ہے یہ ایک ایسی صنف ہے ایک طرف جہاں یہ سازگار فضا میں پروان چڑھی وہیں دوسری طرف ناسازگار اور مخالف فضا میں بھی اس کا چراغ روشن رہا۔ ہر زمانے میں ہر دور کے شعراء نے غزل کو قبول کیا اور اردو شاعری کا بہت بڑا سرمایہ بھی غزل کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ غزل کی خوبصورتی ہے اس کا ہر ایک شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور کسی خاص جذبہ وخیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کبھی ایک شعر ہی ہماری تہذیبی زندگی کی پوری تصویر پیش کرتا ہے۔ سب سے پہلے غزل کے نقوش حضرت امیر خسرو کے کلام میں ملتے ہیں۔ خسرو کے علاوہ دکنی شعراء میں قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی، صنعتی اور شوقی وغیرہ نے غزل کی ترقی میں کردار ادا کیا لیکن غزل کو مکمل طور پر سنوارنے اور صحیح سمت دینے میں ولی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ولی نے غزل کے مضامین کو وسعت دے کر اس میں نیا انداز ایجاد کر کے غزل کو نیا لب ولہجہ عطا کیا تصوف اور روحانیت کے مسائل بھی غزل میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیے۔ ولی ہی اردو غزل کے پہلے ایسے شاعر ہیں جس کے کلام کو بنیاد بنا کر بعد کے شعراء نے غزل گوئی شروع کی یعنی جب ولی 1700 میں دہلی آئے اور غزل کے بارے میں ولی نے بتایا تو لوگوں نے ان کی مذمت کی، ہنسی بنائی لیکن 1719 میں ولی کے انتقال سے ایک سال قبل ولی کا دیوان دہلی پہنچا تب لوگ چونکے دیوان جب پڑھا تو سوچا کہ غزل جیسی بھی کوئی صنف ہے جس میں ہم طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ یعنی غزل میں بھی ہم اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ اور پھر 1719 کے بعد سے ہی اردو غزل پروان چڑھنے لگی جن میں میر تقی میر، سودا، درد، غالب، مومن وغیرہ وغیرہ نے طبع آزمائی کرتے ہوئے اردو غزل کو وقار بخشا۔ آج بھی اردو غزل زمانے کی تیز رفتار کا ساتھ دینے میں پوری طرح کامیاب نظر آتی ہے۔ رشید احمد صدیقی بھی کہتے ہیں۔ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔

***۔موجودہ دور کے ادیب وشاعر نے ادب کی ترویج کیلئے کوئی نمایاں کام کیا؟**

اردو ادب کی ترویج میں نئے کارناموں سے اردو ادب میں اضافہ ہوا ہے ابھی حال میں ہی انتقال فرما گئے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا نام سر فہرست ہے۔ ہندوستان کے مشہور ومعروف شاعر محترم انور جلال پوری نے بھی اردو میں گیتا کا ترجمہ کرتے ہوئے اردو ادب میں بڑا اضافہ کیا ہے اور بھی ایسے معتبر نام ہیں جو ابھی حیات ہیں جیسے وسیم بریلوی صاحب، منور رانا صاحب صاحب اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

***۔سوشل میڈیا کی شاعری کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں؟**

سوشل میڈیا پر شاعری کا کچھ مقام ہے لیکن زیادہ اہمیت شاید نہیں دی جا سکتی، اس طریقے سے سوشل میڈیا کی شاعری دو حصوں میں تقسیم ہے ایک طرف اوپن مائک پر شاعری تو دوسری طرف ریختہ جیسی ویب سائٹ پر اردو ادب کا تمام ذخائر بھی موجود ہے جیسے بہت سے اردو میں مقابلے کے امتحانات کے تحت بہت کچھ ایسا مواد بھی آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے جو مالی حیثیت سے کمزور ہونے کی وجہ سے اردو کی تمام کتابیں نہیں خرید سکتے۔ تو ایسے طلباء کے لئے یہ ویب سائٹ بہت بہتر ہے یہاں سے طلباء کو مواد با آسانی دستیاب ہو جاتا ہے اور ابھی حال میں لاک ڈاؤن کے وقت بہت کچھ اچھے مشاعروں کا انعقاد بھی کیا گیا، اردو کانفرنس بھی ہوئیں، ویبنار سیمینار بھی ہوئے جیسے حیات اور بلند پرواز کے نام سے مشاعرے بھی ہوئے اس طرح ان مشاعروں میں بہترین عمدہ شاعری اپنے معیار پر

اتری،لیکن ایک طرف جو اوپن مائک پر شاعری ہورہی ہے اس کا کوئی مقام نہیں بنتا۔

*** ۔ہندوستان اور پاکستان میں کہاں معیاری شاعری ہورہی ہے؟**

آج کل زیادہ تر لوگ غیر معیاری شاعری کررہے ہیں صرف چند ہی معیاری شعراء باقی ہیں جو معیاری شاعری کرتے ہوئے ادب کی خدمت کر رہے ہیں جبکہ غیر معیاری شاعری کو ادب میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان میں بھی چند جگہوں پر جیسے لکھنؤ حیدرآباد وغیرہ میں معیاری شاعری کرنے والے چند شعراء موجود ہیں پاکستان میں میرے خیال میں کراچی اور لاہور میں بھی چند معیاری شعرا موجود ہوں گے۔

*** ۔اردو شاعری کا مستقبل کیا دکھائی دیتا ہے؟**

آج کل فلحال اردو پڑھنے والے بہت کم افراد ہیں اردو کی کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے کم افراد نظر آتے ہیں۔لیکن تھوڑی سی امید کی کرن نظر آتی ہے تعلیم کے میدان میں اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والوں کی تعداد نظر آتی ہے اس کے علاوہ ہمارے یہاں ہندوستان میں آئی اے ایس، پی سی ایس، آئی آر ایس کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد بھی کافی ہوچکی ہے۔اور باقاعدہ بڑے بڑے افسران اردو سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے عہدوں پر فائز ہوکر سرکاری کاموں کو انجام دے رہے ہیں۔اور بے شمار مصنف و ادیب بھی اپنے ادبی کارناموں سے منزل مقصود تک پہنچ رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اردو کا چراغ کافی روشن ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا مستقبل انشاء اللہ موجودہ حال میں بھی روشن ہوگا۔

*** ۔آج کی نسل کتاب اور شعر و ادب سے دور کیوں ہے؟**

آج کی نسل کتاب اور شعر و ادب سے دور ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کیونکہ آج کا زمانہ ڈیجیٹل کا زمانہ ہے اس کے علاوہ گھروں میں بھی اردو کا ماحول بہت کم ہے یہی وجہ ہے کہ سوشل میڈیا پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے ہی آج کی نسل کتاب اور شعر و ادب کو توجہ نہیں دیتی۔

*** ۔آپ نے کن کن اصناف میں شاعری کی ہے اور کیا نثر پہ بھی طبع آزمائی کی ہے؟**

میں نے حمد، نعت، منقبت، قطعات، نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اصل میدان غزل ہے۔ وقت مل جانے پر افسانے مضامین، تبصرے وغیرہ بھی صفحہ قرطاس پر قلم بند کرتی ہوں۔

*** ۔آپ کی نظر میں اچھے شعر کی کیا تعریف ہے؟**

میرے خیال میں بہترین شعر کہنے کے لئے بلند خیال اور بہترین الفاظ کا ہونا ضروری ہے اور یہ قوت شاعر میں جس قدر بلند درجہ کی ہوگی اتنا ہی شاعر بھی بلند درجے کا شعر کہنے کا حقدار ہوسکتا ہے۔البتہ شاعر میں یہ ادنیٰ درجے کا ہوگا تو قدر لحاظ سے اس کی شاعری بھی ادنیٰ درجے کی ہوگی۔لیکن یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے جبکہ یہ اکتساب سے نہیں حاصل کیا جاسکتا چونکہ شاعر کی ذات کو یہ قدرت کی طرف سے ملا ہوا تحفہ کسی میں ذرہ برابر بھی موجود نہیں ہے، اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضے میں ہو، تو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ بشرطیکہ شاعر کے پاس اعلیٰ درجے کا تخیل اور عمدہ الفاظ کا ہونا ضروری ہے اور اسی کی بنیاد پر ہی وہ معیاری شعر کہہ سکتا ورنہ شاعر کمال کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا کہ گھٹیا قسم کی شاعری سے زبان و ادب کا فتنہ اور نقصان ہی نقصان ہے۔

*** ۔جدید شاعری کے بارے میں کیا کہیں گے؟**

اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے کم ہوگا جدیدیت کے زیر اثر اردو شاعری کے موضوع، اسلوب اور ہیئت تینوں سطح پر واضح تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہیئت میں نیاپن لانے کیلئے آزاد نظم، نثری نظم، آزاد غزل اور نثری غزل کے امکانات پر غور کیا گیا تھا۔جدید شاعروں نے شاعر کا رشتہ اپنی زمین سے مضبوط کرتے ہوئے تخلیقی سطح پر ایسی علامتیں اور وضع کئے جن میں صداقتوں کے لئے گوشے بھی ضم ہوجائیں۔ بیان کی تہہ داری اور پہلوداری بھی موجود ہے۔ سورج، چاند رات، اندھیرا، اجالا، دھند، سمندر، جھیل، دریا، کشتی، ریت، راکھ، درخت، مچھلی وغیرہ ایسے الفاظ جن میں مختلف معنی میں بالتکرار استعمال کیا گیا ہے۔ جدیدیت پسند شعراء میں ندا فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، پروین شاکر، بشیر بدر، شہر یار وغیرہ ایسے تمام شعراء ہیں جنہوں نے نئے کارناموں کو انجام دے کر ادب میں اپنا مقام بنایا ہے۔

*** ۔اپنے مجموعے کی طرف کبھی دھیان گیا؟**

میری کوئی مجال و بساط نہیں ادنی سی شاعرہ اور مصنفہ کی حیثیت رکھتی ہوں۔ابھی جستجو اور سیکھنے کے میدان میں دوڑ لگا رہی ہوں فی الحال ابھی تو اس بارے میں کچھ خیال نہیں ہے۔اشاعت کا جب وقت ہوگا انشاء اللہ مجموعہ بھی منظر عام پر آئے گا۔

***۔ہمارے ہاں جو ادبی گروہ بندیاں ہیں انہیں آپ کس نظریہ سے دیکھتے ہیں؟**

اگر ہم گروہ بندی کے ساتھ چلیں گے تو ہمیں یہ لگتا ہے کہ ادب کا خسارہ ہی خسارہ ہے کیونکہ یہ گروہ بندیوں کا یہ مسئلہ ہے جیسا کہ آپ مشاعروں کو ہی دیکھئے اس میں اگر اچھی آواز ہے بھلے ہی وہ متشاعر ہے اور ان کا ایک گروپ بنا ہوا ہے تو گروپ کا ایسے لوگوں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ بندے یہی آئیں گے اور یہی پڑھیں گے جس سے ایسے شاعروں کو بھی موقع نہیں ملتا جو واقعی بنیادی شاعر ہے ورنہ اتنے اچھے اچھے معتبر شعراء وہیں کے وہیں زمین پر ہی رہ گئے۔یعنی جو بنیادی شاعر ہیں انہیں منظر عام پر آنا چاہئے تو انہیں کوئی پلیٹ فارم نہیں حاصل ہوتا لیکن جو بالکل ہی متشاعر و متشاعرات شاعر کی حیثیت سے اُبھر رہے ہیں تو انھیں اچھا خاصہ مقام ملا ہوا ہے یا تو وہ اپنی پکڑ کے بل بوتے پر، یا تو اپنی آواز کے بل بوتے پر، یا پھر اپنی خوبصورتی پر اچھا خاصہ مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ہاں لیکن میں ایک چھوٹی سی گزارش تو ضرور کروں گی کہ جو واقعی بنیادی شاعر ہے اس کو سرکاری غیر سرکاری باقاعدہ رجسٹرڈ اردو ہندی اکیڈمیوں سے سند یا کوئی سرٹیفکیٹ دینا لازمی کیا جائے اور باقاعدہ ان کو وظیفہ کے طور پر ماہانہ کچھ رقم پیش کی جائے تو اس لحاظ سے انشاءاللہ متشاعر و متشاعرات میں کمی آسکتی ہے۔

***۔آپکی نظر میں محبت کیا ہے؟**

ویسے محبت کے کئی پہلو ہیں اور محبت کرنے کے کئی رنگ ہیں لیکن محبت ایک پاکیزہ لفظ ہے اور اس لفظ کی تشریح بھی عمدہ ہے واضح ہے محبت، جیسے ماں باپ سے، بھائی بہنوں سے، قوم وملت سے، وطن سے، عزیز دوستوں بچوں سے، بیوی یا خاوند سے وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہ پہلو بھی مجازی دنیاوی پہلو ہیں۔بے شک اگر ہم دنیا میں مل جل کر نہیں رہیں گے آپس میں محبت نہیں کریں گے تو ہم تنہا ہی رہ جائیں گے نہ ہمیں کوئی جانے گا نہ ہم کسی کو پہچانیں گے۔لیکن سچی محبت خدا رسولؐ اور اولیاء کرام سے کی جائے تو بے شک زندگی بہت خوبصورت اور آسان ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ کا نام لیا جائے تو یہ محبت بھی ضرور تھی لیکن یہ عشقِ مجازی میں رہتی زندگی تک باقی رہی۔اور عشقِ حقیقی میں انسان جب محبت میں لبریز ہو جاتا ہے پھر آخر میں وہ کامیاب ہو کر اپنی اصل منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔لیکن ایک صورت میں عشقِ مجازی کا ہونا بھی ضروری ہے جب انسان عشقِ مجازی میں کسی طرح کی چوٹ کھا کر ٹوٹ جائے تب اسے اپنا رب ہی یاد آتا ہے بشرطیکہ دنیا کی عیش وعشرت میں انسان خدا کو بھول جاتا ہے۔آخر میں جب چوٹ کھا کر بکھر جاتا ہے یعنی جسکا کوئی نہیں زمانے میں اس کا پروردگار ہوتا ہے۔پھر جب وہ پریشان حال ہوتا ہے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہوتا تب وہ خدا کی طرف رجوع ہوتا ہے البتہ دنیا میں رہتے ہوئے بے بنیادی محبت ضروری ہے لیکن کسی حد تک نہیں۔فی الحال عشقِ حقیقی ہی منزل مقصود تک پہنچنے کا کامیاب راستہ ہے۔

***۔شعوری کوشش لکھنے کے لئے کس حد تک ضروری ہے؟**

یہ ایک لامحدود سمندر ہے زندگی کی آخری سانس تک بنیادی شاعر حق کی بنیاد پر حق گوئی کے ساتھ اپنی کوششوں سے کچھ نہ کچھ ردعمل کرتا رہتا ہے۔

***۔آزاد نظم اور نثری نظم کا ادب میں کیا مقام ہے؟**

آزاد نظم کو ایک طرح سے خیال ہی کہا جاسکتے اس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں کی جاتی، مصرے بھی چھوٹے بڑے ہوتے ہیں پھر بھی آزاد نظم اور نثری نظم کی ہئیتوں کو تقویت اور استحکام کا صحیح سطح پر اپنی حسیت کا جادو جدید کے شاعروں نے جگایا ہے۔جیسے ن م راشد، میراجی ہیں۔میراجی نئی شاعری کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں ان کی ایک نظم ہے۔کلرک کا نغمہ۔سب رات میری سپنوں میں گزر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں، پھر سب کی دیوی آتی ہے۔اپنے بستر سے اٹھتا ہوں منہ دھوتا ہوں، لایا تھا کل جو ڈبل روٹی اس میں سے آدھی کھائی تھی، باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ ہے۔اس نظم سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم باتیں کر رہے ہیں۔

***۔ شاعری کیا ہے؟**

اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ میں پرونے کا نام شاعری ہے انسانی زندگی میں شاعری کا ایک مقصد ہے بعض لوگ اس کا استعمال غلط طریقے پر کرتے ہیں۔لیکن جو شعور لوگ اس عطانے الٰہی کو فطرت کے موافق کام میں لائیں گے ممکن نہیں کہ اس سے معاشرے کو کچھ فائدہ پہنچے۔لٰہذا شاعری کسی بلند مقصد اور اچھے کام کیلئے استعمال ہونا چاہیے۔اس کا مقصد ہے شعر کے ذریعے سماج کو فائدہ پہنچانا۔بیرا ابن ابی سلمہ کا قول ہے کہ سب سے بہترین شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہ اٹھیں کہ سچ ہے۔دنیاوی مشاغل میں مصروفیت ومحویت کے سبب جو قوتیں سو جاتی ہیں

شعران کو جگاتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے جو کہ شعر کی تائید میں کہی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ معاشرے کے دبا دیا (گڑا ہوا، ڈرا ہوا، دنیا کا ماضی مطلق) کے زمانے اقتضاء (خواہش کرنا، ضرورت) سے شعر پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ وہ بجائے اس کے کہ قوی اخلاق کی اصلاح کرے، نہ کہ اس کے بگاڑنے اور برباد کرنے کا ایک زبردست آلہ بن جائے۔ محض خیالی تصورات میں انسان کھو جائے۔ اور معاشرے کا ماحول خراب ہو جائے آیئے قرآن نے بھی ایسی شاعری کی مذمت کی ہے۔

واشعراء یتبعھم الغاون (آیت 424 پارہ 19)

الم ترا انھم فی کل وادیھیمون (آیت 425 پارہ 19)

وانھم یقولون مالا یفعلون (آیت 426 پارہ 19)

لیکن ساتھ میں ایسے شاعروں کی تعریف بھی فرمائی جو اپنے شعرو شاعری کے مقصد میں نیک بناتے ہیں ان کی شاعری بامقصد ہوتی ہے بامقصد شاعری سے مخالفین کو جواب دیا جاتا ہے ایسی شاعری کی پذیرائی بھی قرآن نے کی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (الشعر:228)

حضرت حسان بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن رواحیہ اسلام کے عظیم شاعر گزرے ہیں نبی ﷺ کریم ان کو داد دیا کرتے تھے مسجد نبوی میں ممبر سجایا کرتے تھے ان کو شعروشاعری کی دعوت دی جاتی تھی۔ البتہ شاعری کرنے کے لیے گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اچھا شاعر ہونے کے لئے مولانا حالی بھی تین شرطوں کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

1۔ بلند تخیل، 2۔ کائنات کا مطالعہ، 3۔ تفحص الفاظ ان تینوں شرائط پر شاعری کا معیار اور ادب کا وقار زندہ رہتا ہے۔ یعنی مطالعہ کے بغیر ہماری زندگی ادھوری ہے۔ ملٹن کے نزدیک بھی شاعری میں سادگی، حق، اصلیت اور جوش کا ہونا ضروری ہے۔

*۔شاعری کے مقابلے میں تخلیقی کام کم ہوا ہے وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غزل بلند معیار تک پہنچ چکی ہے۔ غزل کے بعد نظم ہے لیکن اور جو صنف ہیں جیسے رباعی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ کا کوئی معیار نہیں رہا تو غزل ان ساری صنف کے سامنے کافی حد تک عروج پر ہے۔ اور غزل کو عروج پر ہوتے ہوئے انسان نے اور صنف میں طبع آزمائی بہت کم کی۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اب لوگ مطالعہ نہیں کرنا چاہتے اور جب مطالعہ کریں گے تبھی ان کو پتہ چلے گا کہ اردو ادب میں اور بھی اصناف موجود ہیں۔ لیکن آج کل انسان اتنا مصروف ہو چکا ہے کہ مطالعہ کر ہی نہیں سکتا اور جب مطالعہ نہیں تو نئے نئے کارناموں کو کیا تخلیق کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے مقابلے میں تخلیقی کام کم ہو رہا ہے۔

*۔آپ شاعرہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟

یہ ضروری نہیں تھا کہ میں شاعرہ بن ہی جاتی یہ میری خوش نصیبی ہے یہ قدرتی ہنر میرے حصے میں آیا لیکن اس کی وجہ بھی اردو سے دلچسپی ہونے کی، اور اردو سے دلچسپی ہوتے ہوئے اردو میں ہی تعلیم مکمل کی۔ گھر میں بھی اردو کا ماحول تھا پہلی بات مجاہد آزادی مرحوم نانا جان کو اردو سے بے انتہا محبت تھی۔ کہیں زمین پر بیٹھ جاتے تو اردو کے شعر زمین پر بار بار لکھتے مٹاتے، یعنی رگ رگ میں اردو پیوست تھی۔ دوسری بات دادی جان نے مجھے لکڑی کی تختی پر لکڑی کے قلم سے اردو لکھنا سکھایا۔ تیسری بات اردو نصاب میں اردو شاعروں کو پڑھا اور علامہ اقبال کو پسند کیا۔ لیکن شاعری کہنے کا جوذوق وشوق پیدا ہوا وہ دادی جان کے مثنوی شاہنام اسلام کو پڑھ کر سناتے ہوئے شوق بڑھا۔ حالانکہ شاعری ورثہ میں نہیں ملی لیکن ذوق وشوق ضرور ورثہ میں حاصل ہوا۔ بعد میں شاہنام اسلام مجھے بطور ہدیہ دیا گیا اور یہیں سے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سب سے پہلے نعت کے کچھ اشعار کہنے کی زحمت ہوئی جو اس طرح ہیں۔

نعت گوئی کا شوق اے خدا مل گیا
مجھ کو عشقِ نبی کا صلہ مل گیا
اپنی منزل کا مجھ کو پتہ مل گیا
جب ملے مصطفیؐ تو خدا مل گیا
کیوں نہ ہو اپنی بخشش کا دل سے یقیں
مجھ کو بھی دامنِ مصطفیؐ مل گیا
جستجو میں رہی آنکھ بھی میری نم
ہر خوشی غم کا پھر فیصلہ مل گیا
عشقِ احمدؐ تبسمؔ بڑی چیز ہے
یہ ملا جس کو اس کو خدا مل گیا

*۔ آپ نے تبسمؔ سے صبا تخلص کیوں کیا؟

بے شک میں پہلے تبسم تخلص کرتی تھی لیکن بعد میں استادمحترم نے صبا تخلص کرنے کا مشورہ اس لئے دیا ان کا کہنا تھا پہلی بات شاعری میں تین حرفی یا دو حرفی تخلص، کلام میں خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔ تین حرفی یا دو حرفی تخلص کا شاعری میں نباہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ دوسری بات بہترین تخلص شاعری کے لیے اچھی پہچان بھی ہوتا ہے۔ تیسری بات صبا یعنی مشرقی ہوا البتہ صبا یعنی مشرقی ہوا زہریلی ہواؤں کے ساتھ مل کر صبا یعنی مشرقی ہوا پر امن وامان میں رہ کر گنگا جمنی تہذیب کو برقرار رکھتے ہوئے بھائی چارے کی فضا بنا کر محبت کی مشعل جلا کر زہریلی ہوا میں ضم ہو کر خود زہریلی ہوا کو صبا یعنی مشرقی ہوا ہر چند بنانے میں کامیاب رہے۔ یہی وجہ ہے تبسم سے صبا تخلص رکھنے کی۔

***۔ آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے اور تعلیم کتنی ہے؟**

میری اردو دینی تعلیم محترمہ دادی جان کی آغوش میں ہوئی اور اردو سے ایم اے، اردو معلم اور اردو سے ہی ماس کمیونیکیشن، الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا کی تعلیم حاصل کی۔ پھر آئی جی ڈی ٹیکنیکل ڈرائنگ کی تعلیم مکمل کی۔ اور ابھی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ بشرطیکہ ذریعہ معاش ابھی کوئی نہیں ہے۔

***۔ آجکل متشاعروں متشاعرات کی ایک کھیپ نظر آتی ہے آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟**

یہ ادب کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے بیشک جو بنیادی شاعر نہیں ہیں وہ بھی ابھرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور بڑے یقین و مدعی کے ساتھ خود شاعر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ادب کو برباد کر رہے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ کچھ نہیں ہے پھر بھی دم بدم بڑھتی جا رہی ہے یہ دوسروں کے سہارے اپنی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں صرف انہیں چند لوگوں کی وجہ سے ہی مشاعروں کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ اور ادب بھی زوال کی جانب بڑی رفتار کے ساتھ چلا جا رہا ہے یعنی یہ اپنی ناکام کوششوں کو کامیاب بنانے میں لگے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مشاعروں کو مشاغل کا سامان بنایا گیا ہے با ادب جس پر بے ادبی پھیلی ہوئی ہے اور خواتین کو شور و غل دھوم دھڑ کا سیٹی بازیوں کیساتھ بے ادب ماحول پیدا کر ڈیکوریشن کا سامان بنایا گیا ہے۔ جہاں مشاعرے ادب سے بیٹھ کر کلام سننے اور غور وفکر کرنے کی جگہ تھی وہیں اسمیں بے ادب ماحول کے ساتھ بے ادب ہو کر گویوں کو شور و غل کے ساتھ سنا جانے لگا۔ یہ بات حق ہے با ادب با نصیب، بیادب بدنصیب، تو کچھ ان لوگوں کے حق میں بدنصیبی ہی میسر ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے یعنی یہ بناوٹی شاعر، متشاعر و متشاعرات کی بھی غلطی نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو با قاعدہ کلام کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ایسے لوگ ہی ان متشاعر و متشاعرات کو کلام پڑھنے کے لئے دے رہے ہیں یا یوں یہ بناوٹی شاعر ان سے کلام لکھوا کر پڑھ رہے ہیں۔ بیشک دونوں طرف سے ہی ادب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے لہٰذا ایسے لوگوں سے میری مخلصانہ گذارش ہے تھوڑی بہت اپنی عزت و ادب کے وقار کے لیے بھی خیال رکھیں آپ کو جو ورثہ میں ملا ہے اس کی قدردانی کیجیے اور وہ بھی جو بنیادی شاعر ہیا سکے لیے تو یہ لازمی ہے کہ ادب کی خدمت کے لیے جی جان لٹانے کی۔ اور ان کے لئے بھی لازمی بنتا ہے جو باقاعدہ مشاعرے کروانے کا خود ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں انہیں چاہیے کہ بنیادی شاعروں کو بھی دعوت دیکر ان کا حق پورا کریں۔ اور جو متشاعر و مشاعرات بن کر ابھر رہے ہیں ان کے لئے بھی ایک مشورہ ہیا گر وہ تھوڑا سا بھی شعر کہنے کی صلاحیت و جرأت رکھتے ہیں تو اپنے اندر جذبہ پیدا کر کے اچھے شعر کہنا سیکھیں با قاعدہ ایک اچھے سے استاد کا انتخاب کریں۔ لیکن بناوٹی شاعر بن کر اس طرح دنیا بھر میں جلوہ گر ہونے اور محفلیں جمانے کی کوئی ضرورت نہیں بنتی۔ بعض کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تھوڑا سا شعر کہنے کی جرأت رکھتے ہیں پھر انہوں نے شعر کی اصلاح اپنے استاد سے کروالی میں نے ان سے جاننا چاہا اس کے ارکان کیا ہیں ان کا جواب ہوتا اس بارے میں معلوم نہیں بلکہ اس بارے میں تو کبھی استاد نے بتایا ہی نہیں ایسا کرنا بھی غلط ہے۔ اور ادب کے ساتھ ناانصافی ہے اگر کوئی بھی اس علم وفن میں ماہر ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں آپ اپنے علم کو پوشیدہ رکھیں بلکہ لوگوں کو سکھا پڑھا کر اپنے علم میں اضافہ کریں۔ میرے خیال میں اگر مشاعرے مصرعہ طرح پر ہونے لگ جائیں تو بہتر ہوگا اس سے ادب کا وقار بنا رہیگا اور مشاعروں کا معیار بھی بچا رہے گا اور ادب کے ساتھ کسی طرح کا سانحہ نہیں ہوگا۔

***۔ کیا شاعری کے لیے محبت کرنا ضروری ہے؟**

بے شک شاعری کے لیے محبت ضروری ہے مثال کے طور پر حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحؓ یہ اسلام کے عظیم شاعر گزرے ہیں۔ ان کو اپنے آقا سرکارِ دو عالمؐ سے بے پناہ محبت تھی کہ وہ آپؐ کی تعریف اپنے اشعار میں کیا کرتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں میر کے والد میر تقی میر سے کہتے تھے کہ بیٹا عشق کرو عشق ہی اس کارخانہ ہستی کو

چلانے والا ہے۔

نظیرا کبرآبادی عوامی شاعر تھے، علامہ اقبال کو قوم وملت سے محبت تھی قوم کے درد میں انہوں نے شاعری کے ذریعے پیغام دیا۔ حال میں حیات شاعر منور رانا صاحب نے زیادہ تر شاعری ماں کی محبت میں ہی کی۔ ابھی گزشتہ سال انتقال فرما گئے راحت اندوری صاحب وطن سے محبت کرتے ہوئے کہتے کہتے یہ کہہ گئے۔

میں جب مر جاؤں میری الگ پہچان لکھ دینا
لہو سے میری پیشانی پر ہندوستان لکھ دینا

راحت صاحب کا نعتیہ اشعار بھی بے پناہ محبت سے بھرا ہوا ہے۔

زم زم و کوثر و تسنیم نہیں لکھ سکتا
یا نبیؐ آپ کی تعظیم نہیں لکھ سکتا
میں اگر سات سمندر بھی نچوڑوں راحت
آپ کے نام کی ایک میم نہیں لکھ سکتا

وغیرہ وغیرہ یہ سب کی اپنی اپنی ہیئت اسکی بناوٹ کے حساب یا اس کے اخلاق ومجاز کے حساب سے انسان تقسیم ہے۔ تو سب کا اپنا اپنا نظریہ ہے محبت کرنے کا، اس لیے شاعری کے لیے محبت ضروری ہے۔

*۔قدیم دور اور جدید دور کی شاعری میں کیا فرق ہے؟

قدیم دور میں سب سے پہلے غزل کی شروعات امیر خسرو نے کی۔ دکنی شعراء میں گولکنڈہ کے شعراء میں بہت سے شعراء ہوئے۔ لیکن غزل کو صحیح سمت دینے والے ولی ہی ہیں۔ اس کے بعد سے غزل ایسی پروان چڑھی جو آج بھی زندہ و جاوید ہے۔ ولی کے بعد اردو ادب میں تین بڑے شعراء ہوئے اٹھارویں صدی کے میر تقی میر کا خوبصورت شعر ہے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر کی شاعری میں ہندی عناصر کے اثرات صاف نظر آتے ہیں جنہوں نے میر کی شاعری کو عظیم اور مقبول بنا دیا۔ میر کے بعد انیسویں صدی غالب کی ہے اور بیسویں صدی کے علامہ اقبال ہیں۔ غالب پہلے فارسی میں شاعری کرتے تھے لیکن بعد میں اردو میں شاعری شروع کی غالب کا مشہور شعر ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اور یہیں سے ہی جدید کی شاعری شروع ہوجاتی ہے اور جدید شاعری کے موضوع پر اسلوب ہیئت تینوں سطح پر واضح تبدیلی آئیں جدید شاعری میں کچھ ایسے الفاظ سننے کو ملے ایسی ایسی ردیف استعمال ہو رہی ہیں جو کہ اس سے پہلے کبھی نبھائے گئے ہوں میں نے اپنی سمجھ میں اب تک جتنا مطالعہ کیا ہے ایسی ردیف نہیں سنی جو آج کل جدید کے شعرا نئی ردیف ایجاد کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار پیش ہیں۔ غزل کی آگ قلم کی گھٹن برائے فروخت۔ لکی فاروقی ہندوستان اور آپ کے پاکستان سے بھی کئی ایسے شعرا ہیں جو جدید شاعری میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہی ایک مدعا، حجاب شکن نہیں ہوتا، فدا حجاب شکن، ڈاکٹر اعجاز کشمیری پاکستان۔

*۔خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کلام کسی سے لکھواتی ہیں آپ کی کیا رائے ہے؟

بے شک یہ بات کس حد تک سچ ہے کچھ خواتین اس طرح کی ہیں جو ایسا کر رہی ہیں اور یہ بھی ادب کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے متشاعر و متشاعرات یا کچھ خواتین جو ادب میں بہت جلد پہچان بنانا چاہتی ہیں میں نے پچھلے سوال میں بھی اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جبکہ ایک معیاری شعر کو سلیقے کے ساتھ پورا کرنے میں میرے خیال میں بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے تب جا کر کہیں ایک شعر اپنی مکمل صورت اختیار کرتا ہے۔ لیکن ایسے بناوٹی شاعر و شاعرات جنہیں شعر کہنے کا کوئی سلیقہ نہیں، وہ قافیہ ردیف کی پہچان سے ناواقف ہیں بحر و ارکان کی سمجھ سے باہر ہیں لیکن پھر بھی ان کو مقبولیت حاصل ہے مشاعرے ان کے اعزاز میں کیے جاتے ہیں ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی اردو ادب کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اور یہ طنز صرف خواتین کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ ان مرد حضرات کو بھی اس بات سے آشنا کیا جا رہا ہے کہ جو حضرات طبع آزمائی کرتے ہیں وہی ادب کے ساتھ کھلواڑ یا پھر ان ناسمجھی خواتین کو باقاعدہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ مشاعروں کی زینت بنا رہے ہیں۔ یہ ایک دلبرداشتہ سانحہ ہے ایسے لوگ بھی خواتین کو باقاعدہ کھلونا سمجھ کر ادب کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں۔ لہذا ایسے خواتین و مرد حضرات سے پرخلوص گزارش ہے کہ ادب کو ردی کی نظر نہ کرتے ہوئے ادب کو بے بنیادی مقصد کو کامیاب نہ بنائیں۔؟

*۔آج کل نئی نئی اصناف آرہی ہیں ادب میں اس کا کیا مقام ہے ہے؟

نئی اصناف کا ادب میں مقام اتنا شاید نہیں ہیکہ جتنا غزل کا ہے یعنی غزل

ہمیشہ سے قائم و دائم رہی جبکہ اور صنف ضرور آئیں لیکن ان کی زندگی غزل جیسی نہیں ہے اس لئے غزل کے علاوہ کوئی بھی صنف کا ادب میں اتنا مقام نہیں ہوسکتا جتنا کہ غزل کا ہے جیسا میں نے پچھلے سوال میں غزل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

***۔ہائیکو کے بارے میں کیا کہیں گی؟**

ہائیکو قدیم جاپانی صنف ہے جس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں اس میں موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔ اردو ادب میں ہائیکو میں حمد اور نعت بھی کہیں جانے لگی ہیں۔ ہائیکو اپنی بناوٹ کے اعتبار سے پہچانی جاتی ہے ہائیکو کے تینوں مصرعوں کے جملہ ارکان 17 ہوں یا اس کی بناوٹ پانچ، سات اور پانچ کے وزن پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی اس نظم کے تینوں مصرعوں میں پہلا مصرعہ پانچ کے وزن پر، دوسرا مصرعہ سات کے وزن پر اور تیسرا مصرعہ پانچ کے وزن پر قائم ہوتا ہے۔ ہائیکو کو پہلے جاپانی میں ہائی کائی یا ہکوئی کہا جاتا تھا۔ اردو میں یہ تکونی نظمیں یعنی ہائیکو کو پہلے ثلاثی یا تثلیث کہا جاتا تھا۔ جاپان میں ہائیکو کا موجد دتا کا ہاما کوشی کو مانا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں ہائیکو کا موجد بلخی کو مانا جاتا ہے

***۔ادب میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کا رجحان کم ہے کیا وجہ ہے؟**

ایک عرصہ تک خواتین کو لکھنے پڑھنے کے مضامین یا شاعری کرنے کی اجازت تو نہیں تھی اور شعر چھپوانے کی اجازت بالکل ہی نہیں تھی۔ جیسے واجد علی شاہ کے دور میں جو خواتین شاعری کرتی تھیں لیکن انہیں اپنی شاعری پڑھنے یا چھپوانے کا حکم نہیں تھا اس لئے کئی شاعرات نے اپنے نام مردوں جیسے تخلص کیے تھے کہ مرد لوگ انہیں قبول کرسکیں۔ مسعود حسین رضوی ادیب نے اپنی کتاب ہماری شاعری میں لکھا ہے۔ ہمارے یہاں عورتوں کو شاعری کرنا دور کی بات ہے یہاں گھر سے دیوار کے باہر ان کی آواز کا جانا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے 80 برس کی ضعیفہ بھی سر سے پاؤں تک پردہ کرتی تھیں اس وقت یہ معاشرہ تھا خواتین کو شاعری کرنے کا معاشرے میں کوئی رواج نہیں تھا معاشرتی پابندی تھی، پردے کا حد درجہ اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ علامہ اقبال کو کمشنر بنا کر انگریز ساؤتھ امریکہ بھیجنا چاہتے تھے لیکن اقبال اس لیے نہیں گئے تھے انکی بیگمات کے ساتھ ہماری بیگمات کو بھی ان سے ملنا ہوگا چونکہ ان کی عورتیں بے پردہ اور رقص کرنے والی تھیں۔ اور ان عورتوں کے ساتھ ہماری عورتیں پردہ کا اہتمام نہیں کر پائیں گی لہٰذا علامہ اقبال نے جانا قبول نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی ایسے ماحول میں کوئی عورت ادب میں کیسے دلچسپی لے سکتی تھی۔ ڈرامہ نگار انارکلی کے مصنف امتیاز علی تاج کی بیگم حجاب امتیاز علی تاج ایک بلند پایہ کی عورت تھیں، جو پائیلیٹ تھیں اور مصنفہ بھی، لانگ ڈرائیو پر تنہا جاتی تھیں، لیکن سماج تو قبول نہیں کرتا فی الحال ادب میں ان کی حیثیت ہے۔ اسی لیے معاشرتی پابندیوں کے سبب ادب میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کا رجحان کم ہے۔

***۔مسلم سماج میں عورتوں لڑکیوں کی تعلیم بہت کم ہے، اور جو مسلم عورتوں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے سے روکتے ہیں انکے بارے میں آپکی کیا رائے ہے؟**

یہ بہت اچھا سوال ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلم سماج میں عورتوں، بچیوں، لڑکیوں کی تعلیم بہت کم ہے۔ اور جن کی یہ سوچ بنی ہوء ہے کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ بس انہیں تو صرف دوسرے گھر جا کر گھر کا کام ہی کرنا ہے اور نہ ہی انہیں نوکری مل سکتی۔ لیکن یہ سوچنا تو بالکل غلط ہے اور یہ ایسے لوگ لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں جب کہ تعلیم یافتہ لڑکی اپنے گھر کا چشم و چراغ ہوتی ہے اپنی تعلیم و تربیت سے اپنے گھر کے ماحول کو اچھا کرسکتی ہے اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ یہ سوچ کر کہ لڑکیوں کو صرف گھر کا کام ہی کرنا ہے یا نوکری نہیں کرنی ہے تو ایسے حضرات کی یہ گھٹیا سوچ ہے۔ بہرحال میں تو ایسے حضرات سے صرف یہی کہوں گی کہ اپنی سوچ کو بدل کر اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب کو برقرار رکھیں۔ کیونکہ ایک بہترین اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ عورت اور مرد سے ہی مل کر یہ سماج بنتا ہے۔ اسی لیے لڑکیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوشش کریں۔ پاکستان سے اردو ادب چینل سے میں محمد سوز علی سوز آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ صبا صاحبہ آپ نے ہمارے ہر سوال کا جواب بہترین، عمدہ اور پرخلوص طریقے سے دیا ادب کی خدمت میں انشاءاللہ آپ سرگردہ ہیں اللہ آپ کے علم میں اور بھی اضافہ کرے۔ سدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین ثم آمین، جزا کم اللہ

فقط والسلام۔

محمد سوز علی سوز۔ پاکستان اردو ادب چینل

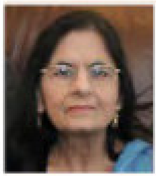

آہ کوثر علی!

امجد مرزا امجدؔ

پچھلے دنوں لندن کے معروف شاعر ڈرامہ نگار، ڈرامہ ڈائیریکٹر رفعت شمیم صاحب نے بتایا کہ محترمہ کوثر علی انتقال کر گئی ہیں۔ بہت دکھ ہوا کہ آپ نہایت خاموش طبع مخلص معروف ڈرامہ نگار جن کی ایک کتاب ''آئینہ حیات'' شائع ہو چکی ہیں۔ آپ اسکول کے بچوں کے لئے ڈرامہ لکھتی تھیں اور ان کے بے شمار ڈرامے ان کے اسکول کے بچوں نے اسٹیج بھی کئے۔ مجھے افسوس اس بات پر بھی ہوا کہ آپ کا انتقال کو ایک دو ماہ ہو چکے ہیں مگر افسوس کہ سینکڑوں شعرا ادبا سے واٹس اپ پر رابطہ ہے مگر کسی نے بتانا بھی مناسب نہ سمجھا۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ کل کلاں ہماری بھی باری ہے تو کتنے دکھ کی بات ہوگی کہ کسی کو کوئی خبر بھی نہ ہو۔ میرا یہ معمول ہے کہ میں بھرپور مضمون لکھتا ہوں مرحومین پر اور واٹس پر تمام گروپوں میں بھیج دیتا ہوں اور یقین کیجئے کہ اسی دن درجنوں نہیں سینکڑوں احباب افسوس کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کرتے ہیں۔ اس طرح کئی لوگ مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو یقین کیجئے مرحوم کے لئے کس قدر اہم ہے۔ یہ تو ہمیں مرنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔۔!!!!

مسز کوثر علی صاحبہ 1962 میں پاکستان کراچی سے برطانیہ تشریف لائیں۔ لندن یونیورسٹی سے بچوں کی تعلیم کا ہائر ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۷۴ سے تعلیمی شعبے میں داخل ہوئیں، اور لندن کے کئی مین سٹریم سکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ سال تک ایسیٹ لینگوئجز کیمبرج کے ساتھ بھی کام کیا۔ اے۔ ایل۔ ایل کی ممبرشپ کے علاوہ وہ انگلی ورلڈ لینگوئجز کے سٹیرنگ گروپ کی ممبر بھی تھیں جس کا کام تمام زبانوں کی ترقی کیلئے جدوجہد کرنا ہے اور کسی اہم کمی کو درست کرنے کیلئے تعلیمی محکمے میں نمائندگی کرنا، تعلیمی پالیسیوں پر نظر رکھنا اور برطانیہ کی اقلیتی زبانوں کو جن میں اردو بھی شامل ہے ان کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی اداروں میں فروغ دینے کی کوشش کرنا، اور زبانوں کے اساتذہ کو ہنر نئ اور کارآمد تعلیمی سکیم سے بہرہ ور کروانا، یہ کام جاری رکھا۔ کوثر علی نے ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری جو نہایت مقدس پیشہ ہے انہوں نے اردو تعلیم رضا کارانہ پڑھانے سے ابتدا کی اور پھر اپنی قابلیت اور محنت سے مین اسٹریم میں ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے برطانیہ میں اپنے طویل تجربات سے اردو زبان کی آب یاری کی اور ایشین بچوں میں اردو زبان کو فروغ دیا۔ انہوں نے کمیونٹی کے لئے اور اردو زبان کی ترقی ترویج کا وہ وہ کام کیا جو کم ہی لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ یہ ننھی سی جان جو اندر سے کسی پہاڑ سے کم نہیں بلا کی ہمت رکھتی تھیں۔ اور قابل تعریف ہیں ایسے لوگ جو بغیر کسی تعریف و توصیف کی طمع اور نمائش کے اپنی کمیونٹی کی خدمات میں مصروف ہیں وہ قابل احترام ہیں۔ انہوں نے اپنے کام کے متعلق ابتدائیہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جسے پڑھ کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسے مخلص لوگ بہت کم دیکھے گئے ہیں جنہوں نے ایک گمنام ہیرو بن کر ایشین کمیونٹی کی خدمات کی۔ کوثر علی پہلی خاتون تھی جنہوں نے میرے علم کے مطابق ڈرامے کی صنف میں اتنا کام کیا جسے انہوں نے کتابی شکل میں دنیائے اردو کو دیا جو قابل تعریف ہے۔ گو ان کے یہ ڈرامے ان کے اسکول کے لیول کے تھے جو انہوں نے اپنی کلاس کے بچوں سے پلے کروائے۔ مگر ان میں جن جن موضوعات پر لکھا گیا وہ نہایت اہمیت کے حامل تھے۔ تمام کہانیاں مغربی اور مشرقی معاشرے کے تصادم کے تناظر میں لکھی گئیں اور تمام کی تمام کہانیاں کسی نہ کسی سچے واقعات کے خمیر سے اٹھیں۔ انہوں نے اردو کی ایک بے جان ہوتی ہوئی صنف میں نئی جان ڈال کر اردو کے قلمکاروں کو احساس دلایا کہ اردو میں صرف شاعری، افسانہ ہی نہیں ڈرامہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ آٹھ ڈراموں کے اس مجموعہ کا نام ''آئینہ حیات'' ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں تدریس کا نصابی گائیڈ (پہلی جماعت سے اے لیول تک) جو گولڈسمتھ یونیورسٹی آف لندن کے زیر ہدایت بھی شائع ہوا۔ 1978 سے مضامین اور کہانیاں لکھنا شروع کیں اور پھر اردو انگریزی میں شعر و شاعری بھی کرنا شروع کی۔ نثر اور شاعری دونوں اصناف میں لکھا۔ چند سال پہلے ان کے ریٹائیر ہونے سے پہلے ایک خیراتی ادارے 'کِڈز آؤٹ' نے ایک تعلیمی پروجیکٹ شروع کیا جس میں برطانیہ کی بیس مقبول زبانوں کے بولنے والوں (جنکی مادری زبان ہو) سے اپنے ملک کی تہذیب اور روایات کے بارے میں کہانیاں لکھنے کی درخواست کی، جو کہ انگریزی میں بھی ہوں اور جن میں اخلاقی پہلو نمایاں ہو۔ کوثر علی نے اردو زبان کی پانچ کہانیاں انہیں لکھ کر ہدیہ کے طور پر دیں جنہیں بی بی سی نے بھی ریکارڈ کیا ہے۔ یہ پروجیکٹ نہایت منفرد تھا جس کی وجہ سے ۱۰۵ کہانیاں بیس زبانوں میں اور ہر کہانی انگریزی میں بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ آج تک ہزاروں سکول ان سے مستفید ہو رہے ہیں اور بیشمار بچے انہیں سن کر اور پڑھ کر دنیا کے مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن اور وہاں کے حالات سے آگاہ ہو رہے ہیں۔۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ آمین

اقبال مجیدی

رودادِ ذات

نام: اقبال مجیدی۔ والد: مبارک مونگیری (مرحوم) پیدائش: 10 جون 1955 تعلیم: ایم۔اے (اردو) کراچی یونیورسٹی 1985

ملازمت: شعبۂ انجیرنگ اے۔سی۔ای پرائیوٹ لمیٹڈ۔کراچی

شریک حیات: پروین مجیدی

اولاد: رامز مجیدی، امامہ جبین، رفعت جبین

اعزازات:

The passionate poet award presented by Oil educator course.
Solidarity award at clyde Cameron college Australia in1994.

۳) گیلیکسی ایوارڈ برائے شاعری (نظم منشیات۔۱۹۹۲) کراچی

۴) گولڈ میڈل جشن عالی برائے ادبی خدمت، پیش کردہ امارات اردو سوسائٹی ۱۹۸۹۔ابوظہبی

ادبی مصروفیات:

(۱) سابق معاون مدیر عالمی ڈائجسٹ کراچی ۱۹۸۵۔۱۹۸۷

(۲) سابق معاون مدیر علامت کراچی ۱۹۸۵۔۱۹۸۸

(۳) سابق ایگزیکٹو ایڈیٹر۔ ینگ چینل کراچی ۱۹۹۰۔۱۹۹۳

(۴) ۲۰۰۷ میں حکومت پاکستان کے جانب سے ملی نغمے پر ایوارڈ سے اور ایک لاکھ سے نوازا گیا۔

بین الاقوامی:

(۱) امریکہ: مشاعرہ بہ سلسلہ ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ یوم پاکستان نیو یارک۔ مشاعروں میں شرکت: نیوجرسی، میریلینڈ، واشنگٹن، کیلی فورنیا، اور سان فرانسکو۔ ۲۔ پاکستان: سکنان شہر قائد عالمی مشاعرہ ۱۹۷۹ کراچی۔ ۳۔UAE: مشاعرہ بہ سلسلہ جشن عالی زیر اہتمام۔امارات اردو سوسائٹی دبئی اور ابوظہبی ۱۹۸۹۔عالمی مشاعرہ محبان پاکستان دوحا۔قطر ۱۹۹۵۔ مشاعرہ بہ سلسلہ جشن پیر زادہ قاسم قطر، دبئی ۱۹۹۶۔(۴)۔ بھارت: مشاعری جنگ آزادی (۱۸۵۷) کی یاد میں دہلی ۱۹۹۰۔سالانہ مشاعرہ شام بہار ٹرسٹ انبالہ بھارت ۱۹۸۹۔انجنیر نگ۔۱۔آسٹریلیا: IFBWW کی ایجوکیٹر سیمینار آسٹریلیا میں ۱۹۹۴۔۲۔ملائیشیا: کوالا لمپور ۱۹۹۷ پنا نگ ۱۹۹۸۔ بھارت: آگرہ۔۱۹۹۹۔ نیپال ۲۰۰۰۔ تنظیمی وابستگی: ۱۔جنرل سیکریٹری ''حلقۂ فکر جدید'' کراچی ۱۹۷۷ تا حال۔ ۲۔سیکریٹری جنرل مبارک مونگیری میموریل اکیڈمی ۱۹۸۹ تا حال۔ ۳۔رکن آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی ۱۹۹۴ تا حال۔ شعری مجموعے: ۱۔''ذات'' مجموعہ غزلیات ۱۹۹۶ کراچی۔ ۲۔''تمازت کا سفر'' مجموعہ غزلیات و نظم ۲۰۰۵ کراچی ۳۔''آسٹریلیا کا سفر نامہ'' زیرِ طبع ۔''مبارک کدہ'' آر، ۲۷۳ سیکٹر ۱۴ بی شادمان ٹاؤن۔ مستقل سکونت: آف شارع مبارک مونگیری۔ نارتھ کراچی۔ میرے بہارے پن کو اختیار کرنے کا انجام دیکھنے کے باوجود اپنے بہاری پن سے باز نہیں آ ؤ گے؟۔۔

یہ غزل حضرت شاہ عظیم آبادی کی اس شہرہ آفاق غزل کی زمین میں کہی گئی ہے جس کا قیامت خیز مطلع یہ ہے۔

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں

اس زمین میں حضرت حفیظ جالندھری نے بھی غزل کہی ہے اور بڑے بھائی (حضرت رئیس امروہوی) نے بھی۔ بڑے بھائی کی غزل اپنی ماہیت میں غزل نہیں بلکہ ایک طویل نظم ہے۔ ان دو شاعروں کے سوا میں نے اس زمین میں کسی اور شاعر کی غزل نہیں پڑھی۔ اقبال کی یہ غزل پڑھ کر میں گم ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں یعنی جون ایلیا۔ آپ بھی یہ غزل پڑھئے، پوری غزل۔

جب اس محفل میں بلوایا گیا ہوں
میں لے کر جاں کا سرمایہ گیا ہوں
نشاط انگیز سی دھڑکن ہے دل میں
میں شاید یاد فرمایا گیا ہوں
جدائی ہو توجہ ہو ادا ہو
بہر صورت میں تڑپایا گیا ہوں
تری محفل سے کیا شکوا ہے مجھ کو
نہ بیٹھا ہوں نہ اٹھوایا گیا ہوں
مرا قصہ ہی کیا میں زندگی بھر

فقط باتوں سے بہلایا گیا ہوں
ہے یکسر خواب کا عالم مجیدی
میں اس محفل میں بلوایا گیا ہوں

تو یہ ہے اقبال مجیدی ولد حضرت مبارک مونگیری اور اس کی شاعری۔اچھی یا بری شاعری۔لیکن ایک بات ہے اور وہ یہ کہ اس کی شاعری کے بارے میں ہرایرے غیرے کو کوئی فیصلہ صادر کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔میں اپنی بات تمام کو پہنچا چکا تھا کہ اچانک اس کی ایک غزل میرے سامنے آ گئی ہے۔یہ غزل اس نے مجھے نہیں دکھائی تھی۔اس کو پڑھنے کے بعد میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔یہ غزل اردو کی صفِ اول کی غزل کی زمین میں کہی گئی ہے۔اگر وہ اس زمین میں غزل کہنے کا آغاز کرنے سے پہلے مجھ سے یہ کہتا کہ جون بھائی میں اس زمین میں غزل کہہ رہا ہوں تو میں اس سے اپنی انتہائی محبت اور شفقت کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہتا کہ بوہک ہو گئے ہو، بولیا گئے ہو، دماغ چل گیا ہے کیا۔

قریشی داؤد احمد ساجد

اک ذرا سی بات پہ رستہ بدل جاتے ہیں لوگ
جانے کیسے ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتے ہیں لوگ
زر کے ہاتھوں بِک رہا ہے آج انساں بھی یہاں
گو عدو کے گھر میں ہو دولت بہل جاتے ہیں لوگ
خاک میں عزت ملا لیتے ہیں دولت کے لئے
یوں زمانے کے نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
سوچتا ہوں دیکھ کے بے لوث الفت کا صلہ
چکنے برتن کی طرح کیسے پھسل جاتے ہیں لوگ
اک زماں ہوتا ہے کندھے پہ اُٹھا لیتے ہیں سب
پھر لحد میں رکھ کے خود باہر نکل آتے ہیں لوگ
کیوں کریں کس پر کریں ساجدؔ بھروسہ دہر کا
شفقتوں کے ہاتھ نیچے بھی مسل دیتے ہیں لوگ

آفتاب شاہ صاحب کا انٹرویو

جبیں نازاں

سوال: سب سے پہلے آپ اپنا مختصر تعارف قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

جواب: بندۂ ناچیز کا مکمل نام پیرزادہ محمد آفتاب شاہ ہے۔والد صاحب کا نام سید حمید الحسن شاہ ہے والدہ کا نام شمشاد اختر ہے۔ہندوستان سے ہجرت کر کے میرے آباؤ اجداد پاکستان آ کر لاہور بسے۔کچھ عرصہ یہاں پر رہنے کے بعد فیصل آباد منتقل ہوئے اور وہاں سے میرے والد صاحب (جو واپڈا میں ملازم تھے) گوجرانوالہ منتقل ہو گئے۔اس کے بعد ڈسکہ اور ڈسکہ سے سمبڑیال منتقل ہو گئے۔اور پچھلے 42 سال سے سمبڑیال سیالکوٹ میں ہی رہائش پذیر ہیں۔کسی ایک جگہ مستقل رہائش نہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب کی جہاں جہاں ٹرانسفر ہوتی گئی وہ وہاں وہاں منتقل ہوتے گئے۔

سوال: آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں، اور کس زباں میں حاصل کی؟

جواب: میری ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل سکول سمبڑیال سے ہے اس کے بعد گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے میں نے 1995ء میں میٹرک کیا۔

سوال: آپ نے شاعری کی ابتدا کس عمر سے کی ؟

جواب: میری شاعری کی ابتدا تو نوجوانی سے ہوئی لیکن اس کو شاعری کہنا شاعری کے ساتھ زیادتی ہوگی۔کچھ الٹے سیدھے خیالات تھے جو میں نے جوڑ لیے۔ایک استاد میری نظر میں موجود تھے انہیں دکھایا تو پہلے انہوں نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر میری کاوش کو دیکھا اور میرے کان میں کہا۔میاں کوئی کام دھندا کرو یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔

2018 میں شاعری کے کیڑوں نے باقاعدہ جب مجھے کاٹنا شروع کیا تو میں نے دوبارہ قلم سنبھالا اور میدان میں اتر گیا اور ناقدین نے بھی مجھے اٹھا کر پٹخا۔

سوال: آپ کے خاندان میں آپ سے قبل بھی کوئی شاعر گزرا ہے؟

جواب: میرے دادا سید مولوی عبدالوہاب پنجابی کے شاعر تھے۔اور میرے بڑے بھائی سید طاہر احمد زاہد بھی شاعر ہیں۔

سوال: آپ نے سب سے پہلا مشاعرہ کب اور کہاں پڑھا؟ میں نے

سب سے پہلا مشاعرہ 2018 میں پڑھا اور یہ سیالکوٹ کا ایک گاؤں موترہ تھا جہاں پر یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔

سوال: مشاعرہ اردو ادب کی تہذیب اور روایت کہی جاتی ہے۔لیکن سنجیدہ طبقہ زوال آمادہ مشاعرہ سے بیزار نظر آتا ہے۔مشاعرے کی سیاست اور پھر متشاعرہ، متشاعر کو اولیت دینا اردو ادب کے لیے کتنا سودمند ثابت ہو رہا ہے؟

جواب: پہلے تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مشاعرہ کیوں ضروری ہے اور کیوں ضروری نہیں ہے۔ میرے خیال میں مشاعرے جب کسی زمانے میں تہذیب کی علامت ہوا کرتے تھے تو تب بھی کہیں نہ کہیں اقرباء پروری کے عناصر موجود ہوتے تھے۔لیکن جو طوفانِ بدتمیزی اب نظر آتا ہے ایسا پہلے سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔اب تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ جو صاحب مشاعرہ پڑھ رہے ہیں ان کا شاعری سے زیادہ تعلق ہے یا مشاعرہ کروانے والے صاحب سے زیادہ تعلق ہے۔میں تو سمجھتا ہوں آج کے مشاعرے اس بس کی مانند ہیں جو بغیر روٹ کے ہرایرے غیرے کو اپنے اندر جگہ دینے کو تیار کھڑی نظر آتی ہے۔اب جب شاعری اور شاعر کا معیار ہی برقرار نہ رہے تو بھائی کیسی شاعری اور کہاں کا شعر؟ موجودہ مشاعروں نے سب سے بڑا ظلم کمرشل ازم کو ہی شاعری کا نام دے کر کیا ہے۔اب مشاعرے دیہاڑی دار مزدور کی شکل نظر آتے ہیں۔تو کیا کوئی دیہاڑی دار شاعر بھی کبھی تخلیقی صلاحیت کا استعمال کرسکتا ہے؟ ماضی میں بھی اچھی اور ادبی شاعری کبھی بھی ان مشاعروں میں اس لیے پروان نہیں چڑھی کیونکہ مشاعرے کا مزاج داد کے بندھن سے وابستہ ہوتا ہے اور سنایا جانے والا ہر شعر داد لیکر ہی ٹلتا ہے چاہے اس میں دم ہو یا نہ ہو۔اسی طرح اچھی اور خالص ادبی شاعری کو ان مشاعروں پڑھنے والے ہوٹنگ اور بے توجہی کا شکار ہوتے ہیں۔ پھر کس طرح اردو ادب کی خدمت کا راگ یہ شاعر و متشاعر گا سکتے ہیں؟ جدید مشاعروں سے واقفیت بڑھائی جاسکتی ہے۔جیب وزنی کی جاسکتی ہے۔بیتکی اور بے وزن شاعری کا فروغ کر کے ادب کا خون کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے ادب کی خدمت کا کوئی بھی طریق تلاش نہیں کیا جاسکتا۔اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ہر طرح کے مشاعروں کے خلاف ہوں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے میں صرف ان مشاعروں کے خلاف ہوں جو ذاتی تشہیر اور مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر منعقد کروائیں جائیں۔شاید اسی لیے اہل عقل وشعور ان مشاعروں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔رہی بات ان مشاعروں کے سودمند ہونے کی تو اس طرح کے مشاعرے ادب سے بیادبی تو پیدا کرسکتے ہیں لیکن ادب کا فائدہ ہونا عبث ہے۔

سوال: موبائل اور سوشل میڈیا نے جہاں تن آسانیاں فراہم کی وہیں کئی مشکلات بھی اپنے ساتھ لائی مطلب یہ کہ موبائل اور سوشل میڈیا نے اردو قاری کو غائب کر دیا۔جبکہ دیگر زباں کے قاری موجود ہیں۔

جواب: اصل مسئلہ ہی وہ عمدہ قاری ہے جو کہیں گم ہوگیا ہے۔موبائل کے بہت بڑے نقصانات میں سے ایک نقصان کتاب کی اہمیت کا خاتمہ ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادب کا ذوق اور شوق کتنے لوگوں کو ہے؟ جتنے لوگ پورن فلمیں دیکھتے ہیں اس کا ایک فیصد بھی شعروشاعری سے شغف نہیں رکھتا۔میرا جواب تھوڑا سخت اور شاید کچھ لوگوں کو غیر مناسب لگے لیکن آپ اعداد وشمار نکال کر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ جتنی بھی سوشل سائٹس اور ایپس ہیں ان پر مقبول ترین چیز رقص، فحش پن، گھٹیا گانے، لچر پن اور بیہودہ لباس پہنے خواتین ہونگیں۔ جب عوام کی پسند ہی چیزیں ہونگی تو شاعری بھی تو وہ ہی پسند آئے گی جس کا نہ سر ہوگا نہ پاؤں ہوگا۔ان سائٹس کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ کسی بھی شعر پر کسی بھی شاعر کا نام چپکا کر مشہور کر دیتی ہیں جس شاعر کا شعر ہوتا ہے وہ لاکھ چیخے لیکن تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے۔دوسری اقوام کو کیوں کہ اپنے کلچر اور تہذیب وتمدن کا خیال ہے اس لیے ان کے ہاں ابھی بھی روایات سے وابستگی موجود ہے۔ ہمارا تو یہ حال ہے ہم ڈھنگ سے ایک اردو کی ویب سائٹ تخلیق نہیں کر سکے۔ یہ اللہ بھلا کرے ہندوستان کے تخلیق کاروں کا جنہوں نے ریختہ کو جنم دے کر ادبی اثاثے کو محفوظ کرنا شروع کیا ہے۔

سوال: اردو ادب کے حوالے سے فی الوقت صرف اردو غزل کا بول بالا نظر آرہا ہے۔نثری ادب (افسانے، کہانیاں، ناولز سفرنامے وغیرہ) کی مانند دوسری شعری اصناف (رباعی خمسہ، مسدس، وغیرہ) مثنوی، مرثیہ کی مانند ازکاررفتہ ہونے کے آثار نظر آرہے ہیں؟

جواب: پہلے تو سمجھنا ضروری ہے کہ غزل کا عروج کیونکر ہے؟ تب جا کر باقی اصناف کے زوال کا سبب معلوم ہوگا۔معاشرتی رویے شاعری پر گہرے

اثرات مرتب کرتے ہیں۔حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں اچھی اور بری سوسائٹی کے شاعری پر اثرات کا ذکر اسی لیے کیا تھا اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بری سوسائٹی سے ذوق سلیم تباہ ہوجاتا ہے۔کوئی اس بات کو مانے یا نہ مانے لیکن موجودہ عہد میں غزل کو آسان ترین صنف سمجھ کر اختیار کیا جارہا ہے۔وہ صنف جس کے لیے استاد کا ہونا لازم ہے اب اس کے لیے بس الٹے سیدھے خیالات اور چند تماش بین ہونا ضروری ہیں۔میں یہ نہیں کہتا کہ اچھی غزل نہیں لکھی جارہی لیکن جب ہر شاعر ایک سمت متوجہ ہوگا تو معیار میں فرق آنا لازم ہے اور اسی کو بھیڑ چال کہتے ہیں۔ایک اور وجہ غزل کے عروج اور باقی اصناف کے زوال کی میری نظر میں یہ ہے کہ طبیعت کی جلد بازی دوسری اصناف کی طرف توجہ نہیں ہونے دیتی۔لوگ راتوں رات مشہور ہونا چاہتے ہیں۔آپ بتائیں مثنوی لکھ کر کون مشہور ہوگا؟ اور اگر لکھ بھی لے تو اس کو پڑھے گا کون؟ اور اگر دو چار نے پڑھ بھی لی تو اہمیت کیا ہوگی؟ اسی طرح جب عوامی سطح پر پذیرائی نہ ہو تو وہ اصناف خاتمے کی جانب گامزن ہوجاتی ہیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ. موجودہ عہد میں کتنے نئے شعراء کو علم ہے کہ مسدس کی ہیئت کیا ہے؟ خمسہ کہتے کس بلا کو ہیں؟ مرثیہ کو بھی مذہبی اہمیت حاصل نہ ہوتی تو کبھی کب کا دم توڑ چکا ہوتا۔اس لیے میرا ماننا ہے جب معاشرتی انحطاط شروع ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے کمزور حصے کو ہڑپ کرتا چلا جاتا ہے۔کیونکہ ادب کی خدمت کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے اس لیے بظاہر کمزور اور کم اہمیت کی اصناف زوال پزیر ہیں جبکہ نئی اصناف ان کی جگہ لینے کو تیار کھڑی ہیں۔

سوال: مستقبل میں سوشل سائیٹ پہ ہونے والی شاعری اردو غزل کا معیار بنے گی؟

جواب: اس بات کا جواب دینا کافی تکلیف دہ ہے کیونکہ ان سائٹس نے کتاب کی موت میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔لیکن میرا جواب اقرار میں ہوگا کہ مستقبل میں یہی سائٹس غزل کو زندہ رکھنے میں معاونت کریں گی۔شاید کوئی معجزہ نہ ہوجائے تو قاری واپس لوٹ کر کتاب سے وابستگی کا اظہار کردے۔بصورتِ دیگر غزل کا مستقبل یہی سائٹس ہوں گیں۔

سوال: ایک وقت تھا اردو زباں طبقہ اشرافیہ کی زباں کہی جاتی تھی، آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی مسلمان کی زباں ٹھہرانے کی سیاسی کوششوں کے پس پردہ بہت کچھ ہوا پھر یہ مدرسہ اور خانقاہوں کی زباں بتائی گئی، اب صورت حال یہ ہے کہ خانقاہوں اور اہل مدرس کے بچے بھی انگریزی میڈیم سے تعلیم پا کر سجادہ بن رہے ہیں گو کہ خانقاہ میں مدرسہ چل رہا ہے لیکن اس میں انتہائی غریب یعنی کی خط افلاس سے نیچے طبقے کے بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں یہ کڑوی حقیقت ہے یعنی کی اردو زباں اب خط افلاس سے نیچے آگئی ہے؟ (یہ سوال بھارت میں اردو کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں ہے)

جواب: اردو کی بدنصیبی کہیں یا المیہ کہیں ہمیشہ اس زبان کے ساتھ ناانصافی ہی ہوئی ہے۔پاکستان بننے سے پہلے اس کو اگر مسلمانوں کی زبان کہا جاتا تھا تو پاکستان بننے کے بعد تو اس کو اس کا حق مل جانا چاہئے تھا؟ لیکن پاکستان بنا تو سیاسی چپقلش نے اس زبان کو مزید راندہ درگاہ بنا دیا۔اس وقت پورے پاکستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد 9 فیصد ہے۔پنجابی زبان بولنے والوں کی تعداد 36 فیصد ہے۔اب جو ملک بنا اس لیے ہو کہ وہاں پر اپنی زبان بولی جائے گی تو جب سرکاری سطح پر اس کو حق نہیں مل رہا تو عوام اس زبان کو اختیار کیوں کریں؟ پھر زبان کی وسعت معاشرتی تنوع سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔وقت کے دھارے نے اردو کو اس مقام پر لا کھڑا کردیا ہے کہ انگریزی کے الفاظ کی اکثریت اب اس زبان کا حصہ بن چکی ہے۔جدت پسند اس کو زبان کی وسعت کہتے ہیں اور میں اس کو زبان کو زوال کہتا ہوں۔میرا ماننا ہے کوئی زبان بھی غریب یا امیر نہیں ہوتی بلکہ معاشرتی عمل سے زرخیز یا بانجھ قرار پاتی ہے۔یہ معاشرتی رویے اصل میں انسانوں کے سوچنے سمجھنے اور عمل کے اظہار سے وابستہ ہیں۔اردو کا دامن آج بھی روایات کے عظیم ذخیرے سے وابستگی کا اعلان کرتا ہے لیکن جدت پسندی زبان کو نہ عام فہم بنا سکی ہے اور نہ ہی اس کو خواص کی سند حاصل رہی ہے۔موجودہ عہد کی زبان تو سوقیانہ پن کا شکار ہوچکی ہے۔کسی زمانے میں طبقاتی تقسیم میں زبان بھی اعلیٰ، متوسط اور کمتر قرار دی جاتی تھی لیکن اب تو حال یہ ہے کہ نثر کے چند جملے لکھنے کے لیے بھی احباب کو لغت کی ضرورت پیش آتی ہے۔زوال زبان پر نہیں سوچوں پر مسلط ہو چکا ہے۔

سوال: ہماری سمجھ ایک بات نہیں آتی وہ یہ کہ ہم جدید ایجادات کے اس قدر دیوانے ہوجاتے ہیں کہ سابقہ ایجاد کو یکسر فراموش کردیتے ہیں۔میری

یہ فکر مطالعہ کی روایت کو ترک کرنے کی روش کے تناظر میں ہے عام قاری کے سلسلے میں بات کر رہی ہوں۔ ہمارے یہاں کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تحفتاً تقسیم کرنا پڑتی ہے۔ جبکہ ہیری پوٹر کتاب شائع ہونے سے قبل اس کی ایڈوانس بکنگ ختم ہو جاتی ہے۔ اس جانب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: معاشرے کے اہداف اور قدریں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ جس معاشرے سے آپ مثال دے رہی ہیں وہاں آج بھی کتاب لکھنے والے کو بہترین انسان خیال کیا جاتا ہے اور کتاب کو موبائل سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ برطانیہ میں اگر آپ کو بس یا ٹرین کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو ہر چار میں سے تین افراد کتاب بینی میں غرق نظر آئیں گے۔ اور اگر موبائل ہاتھ میں ہوگا تو گود میں کتاب رکھی ہوگی۔ ہمارے ہاں تو سلیبس کی کتابیں نہیں پڑھی جاتیں پھر شاعری اور نثر کی باقی اصناف کو کیوں پڑھا جائے؟ کونسا سکول یا کالج لائبریری کا درست استعمال کرتا ہے؟ کونسا استاد بچوں کو کتاب کی اہمیت کا درس دیتا ہے؟ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں 30 سال تک کی عمر افراد نے نصاب کے علاوہ ایک یا دو کتابیں پڑھی ہوتی ہیں اور وہ بھی ناول یا افسانہ نہیں ہوتیں۔ جب ہم معاشرے میں کتاب کی اہمیت کی وضاحت ہی نہیں کر سکتے تو اس کا فروغ دیوانے کے خواب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ ہمارے ہاں عالمی معیار کا ادب پیدا نہیں ہوتا۔ عوامی داد اور طلب بھی بہر حال ایک بہت بڑی سند ہوتی ہیں۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ چند سر پھرے لوگ ضرور کوشش کر رہے ہیں لیکن عوامی رائے عامہ اس حوالے سے ہموار کرنے والے سوئے ہوئے ہیں۔ میرے لیے تو اتنا بھی کافی ہے کہ اس ملک میں ابھی تک کتابیں شائع ہوتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ ردی والا ہی اس سے مستفید ہوتا ہے۔

سوال: نجی سوال کی طرف آتی ہوں آپ نے کسی استاد سے اصلاح لی؟ گر ہاں تو استاد محترم کے نام بتانا پسند کریں گے؟؟

جواب: میرا آغازِ شاعری کافی کٹھن اور دل توڑ دینے والے تجربے سے ہوا تھا۔ میں ان صاحب کا نام نہیں بتاؤں گا جن سے اصلاح کے لیے اپنا کلام بھیجا تھا لیکن انہوں نے دیکھ کر کہا آپ زندگی میں کبھی شاعر نہیں بن سکتے اور وہ سچ ہی کہتے تھے۔ اگر میں شاعر بن جاتا تو دوبارہ انسان بننا میرے لیے کافی مشکل کام ہوتا۔ ایک لمبا عرصہ میں شاعری لکھنے سے دور رہا۔ 2018 میں میں نے بغیر کسی استاد کے شاعری کی پہلی کتاب شائع کروا دی۔ یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا اور مجھے تب اندازہ ہوا کہ حقیقی شاعری اور شوقیہ شاعری میں کیا فرق ہوتا ہے۔ تب میرے دوست پروفیسر عارف لاوی نے میری مدد کی۔ انہوں نے کتاب کو دیکھا اور کہا اس کی غزلوں کو دوبارہ دیکھو۔ تم میں شاعری کا وصف موجود ہے لیکن شاعری کے قوانین سے نابلد ہو۔ مجھے انہوں نے علمِ عروض کی طرف راغب کیا۔ بھٹناگر صاحب کے لیکچر سنے۔ عروض کی باریکیوں کی جانب دھیان دیا اور دوسری کتاب جب مارکیٹ میں آئی۔

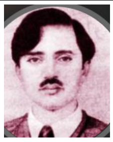

سیّد سبط علی صبؔا صاحب

14 مئی 1980 معروف پاکستانی شاعر ''سیّد سبط علی صبؔا صاحب'' کا یومِ وفات... نام سیّد سبط علی اور تخلص صبؔا تھا۔ ۱۱ نومبر 1935ء کو کوٹلی لوہاراں، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رڑکی (بھارت) اور سیالکوٹ سے حاصل کی۔ پاکستان آرمی میں 1935 سے 1960ء تک ملازم رہے۔ 1965 کی جنگ میں کھیم کرن کے محاذ پر دفاعی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں اپنی عمر کے آخری دنوں تک پاکستان آرڈیننس فیکٹریز، واہ کینٹ میں ملازم رہے۔ 14 مئی 1980 کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد 'طشتِ مراد' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ 1986 میں چھپا۔

(بحوالہ: پیمانہ غزل (جلد دوم) محمد شمس الحق، صفحہ: 306)

معروف شاعر سبط علی صبؔا کے یومِ وفات پر
منتخب اشعار بطورِ اظہارِ عقیدت..

جب چلی ٹھنڈی ہوا بچہ ٹھٹھر کر رہ گیا
ماں نے اپنے لعل کی تختی جلا دی رات کو

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

پیشکش: اعجاز زیڈ ایچ

مبارک صدیقی ،صدق ووفا کا شاعر

امجد مرزا امجدؔ

مبارک صدیقی صاحب لندن کے معروف شعرا میں سے ہیں جو بہت ہی کم مشاعروں میں نظر آتے ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ کلام بنام’’روشنی کا سفر‘‘ ملنے پران کا تعارف ہوا۔ایک بار میری رہائش پراور ایک بار پاکستان کے نامور شاعر فرحت عباس کے اعزاز میں ادبی محفل جو پارلیمنٹ ہاؤس میں لارڈ نذیر احمد کی صدارت میں کی گئی میں ہی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جہاں انہوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظامت کی اور اپنے کلام سے متاثر کیا۔اس کے بعد رانا عبدالرزاق صاحب کے مشاعروں میں اکثر ملاقات کا شرف حاصل رہا۔مبارک صدیقی صاحب 1995 میں برطانیہ آئے شعبہ تدریس سے تعلق ہے اور لاہور یونیورسٹی سے گریجویشن کی اور ایم اے انگلش اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے کیا۔سروش تخلص رکھتے ہیں جو بہت ہی کم ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں کسی نام ونمود یا اپنے آپ کو منوانے کا شوق نہیں جو اکثر شعرا میں ملتا ہے وہ صرف یہ چاہتے ہیں صدق و وفا کے گیت گاتے رہیں روتے ہوئے کو ہنساتے رہیں اور

یونہی جاری رہے زندگی کا سفر
آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

معروف شاعر انور مسعود صاحب مبارک صدیقی صاحب کے بارے میں کہتے ہیں’’مبارک صدیقی ایک خوبصورت اور بھرپور شاعر ہے جو غزل بھی خوب کہتا ہے اور نعت بھی بہت خوب کہتا ہے۔ مجھے لندن میں اس محبت کرنے والے نوجوان جذبوں کے شاعر سے مل کر ازحد خوشی ہوئی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا تعارف خود ان کے اشعار کراتے ہیں... پوچھے جو کوئی اہلِ سخن اس کا تعارف...کہنا کہ وہ غزلوں کی کتابوں کی طرح ہے

معروف شاعر فرحت عباس شاہ لکھتے ہیں۔

’’مبارک صدیقی ایک بہت ہی خوبصورت اور دلوں کو موہ لینا والا شاعر ہے۔ مجھے برطانیہ کے پارلیمنٹ ہاؤس میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں مبارک صدیقی کو سننے کا اتفاق ہوا اور یہ جان کے بہت خوشی ہوئی کہ برطانیہ جیسے سرد ملک میں بھی مبارک صدیقی جیسے شاداب اور روح کو گرما دینے والے شاعر آباد ہیں۔‘‘ مانا سروشؔ، عشق میں ہر موڑ ہے کٹھن... ہم کیا کریں نبھانے کی عادت نہیں گئی۔

معروف شاعر رشید قیصرانی کہتے ہیں: مبارک صدیقی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ مجسم مشاعرہ ہے۔صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر اطہر راز لکھتے ہیں ۔مبارک صدیقی سرزمین جمالیات کا شاعر ہے۔مبارک صدیقی سینے میں محبت بھرا دل رکھتے ہیں اور اپنی اس محبت کو ہمیشہ لٹاتے نظر آئے۔جانے وہ کون لوگ تھے جو بے وفا ہوئے...ہم نے تو جس سے پیار کی عمر بھی کیا۔

اس سے قبل میں ان کے پہلے شعری مجموعہ پر ایک تعارفی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ مبارک صدیقی صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ان کی غزل فنی اور عصری تقاضوں سے آراستہ ہے جہاں ان کی غزل زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے وہاں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کی چھاپ زیادہ گہری نظر آتی ہے۔روائتی غزل کے شیش محل میں جدیدحسیت کی دھنک رنگ شمعیں جھلملاتی نظر آتی ہیں۔

ڈوب کے سورج مرے سینے میں پانی ہو گیا
زخم اس کی بے وفائی کا مگر جلتا رہا

عصرِ حاضر کے مسائل طبقاتی کش مکش فرقہ وارانہ منافرت،مادہ پرستی ،افلاس،غربت اور ظلم و ستم کی عکس ریزی کے ساتھ ساتھ بے انصافی اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف پرعزم جدو جہد کا سراغ ملتا ہے۔کاتب تقدیر تجھ سے اِک شکایت ہے مجھے۔اُس بھری برسات میں کیوں میرا گھر جلتا رہا

انہوں نے اپنی غزلوں میں ایک پیغام دینے کی کوشش کی ہے اور عام شعرا کی طرح ہجر وصال کا رونا نہیں رویا۔

گو ظلمتوں کے شہر میں ہے روشنی حرام
اپنے دیئے جلانے کی عادت نہیں گئی

ہمارے شاعر کا رجحان مذہبی ہے اور ان کے اندر ایک ایسا سچا اور کھرا نسان بیٹھا ہوا اپنی باتیں منوانے پر مصر ہے وہ برملا کہہ اٹھتے ہیں کیونکہ وہ قنوطی شاعر نہیں بلکہ رجائی شاعر ہیں یہ انداز مایوس انسانوں میں زندہ رہنے اور مصائب و مسائل سے نبرد آزما رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

بات حق کی کریں گے سر، دار بھی
اُن کے قانون فرمان اپنی جگہ

اب تک مبارک صدیقی صاحب کے کئی خوبصورت مجموعات منظر عام پر آکر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔آپ کا لہجہ،آپ کی منکسر المزاجی،طرز گفتگو،شاعری مخاطب کو گرویدہ کر دیتی ہے۔آپ کی کئی خوبصورت غزلیں الیکٹرانک میڈیا پر گردش کر رہی ہیں۔آپ ٹی وی کے پروگرام بھی دیتے ہیں اور اپنے خوبصورت مدھم لہجے اور میٹھی آواز سے دیکھنے سننے والوں کے دل موہ لیتے ہیں۔

یشب تمنا لندن

اپنا تعارف خود ہی کرانا بہت مشکل ہے اس لیے اپنے بارے میں صرف چند باتیں بتا پاؤں گا مکمل تعارف نہیں کرا سکوں گا۔ میری پیدائش لاہور کی ہے اور مصدقہ تاریخ پیدائش ۱۶ جون ۱۹۵۷ ہے۔ میرے پاپا شاعر تھے اور تمنا تخلص کرتے تھے ایک عرصے تک وہ ابوز تمنا کے نام سے لاہور کی ادبی فضا میں پوری طرح متحرک تھے اور اس دور کے تمام بڑے شاعروں کے ساتھ انہوں نے مشاعرے پڑھے۔ سن چالیس اور پچاس دہائیوں میں کیمونسٹ تحریک میں نہ صرف باقاعدہ شامل تھے بلکہ تحریک کے قایدین کے بہت قریب بھی تھے مگر بعد میں غمِ روزگار میں اُلجھ گئے۔ سن ساٹھ کی دہائی میں پاپا کی ملازمت کی وجہ سے ہم لاہور سے سندھ آ گئے اور لاڑکانہ ٹنڈو آدم وغیرہ سے ہوتے ہوئے سکھر میں قیام پزیر ہو گئے۔ میری تقریباً ساری تعلیم سکھر کی ہے۔ یہیں تعمیر نو ہائی سکول میں داخلہ ہوا۔ میں اسکول کا بہترین طالب علم تو نہ تھا لیکن میرا شمار سکول اور کالج کے بہترین طالب علموں میں ضرور ہوتا تھا۔ اسی سکول میں حافظ وحیداللہ خان صاحب اور پروفیسر عنایت علی خان صاحب جیسے ماہرین تعلیم اور دوسرے بہت سے اساتذہ سے واسطہ پڑا۔ سکول میں غیر نصابی سرگرمیوں کا بڑا چلن تھا۔ اس زمانے میں تقریری مقابلوں میں شرکت کی اور انعامات بھی حاصل کیے۔ سکول میں اسٹوڈنٹ یونین کے کے تین عہدوں کے لئے انتخاب لڑا اور دو میں منتخب ہو کر ایک مرتبہ جوائنٹ سیکریٹری اور ایک مرتبہ نائب صدر بنا۔ کئی سال تک سکھر میں مہران بزمِ طلبہ کا جنرل سیکریٹری رہا اور اسی طلبہ تنظیم کے تحت اپنے دوستوں نذیر متین ملک آفتاب محمود پاشی، نجم الدین شیخ اور ڈاکٹر اسد صدیقی کی مدد سے طلبہ کے لئے کئی پروگرام کیے۔ اس زمانے میں لکھنا لکھانا شروع کیا۔ اس وقت میرے اکثر دوست عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ ابھی میں آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا کہ میں نے کالج جانا شروع کر دیا۔ گویا صبح کو اپنے سکول جانا اور شام کو ان دوستوں کے ساتھ کالج ۱۹۷۴ میں تعمیر نو ہائی سکول سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ۱۹۷۷ میں اسلامیہ کالج سکھر سے بی اے کا امتحان دیا اور جام شورو یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی اور اسی سال پروبیشنری آفیسر کی حیثیت سے کراچی میں حبیب بنک سے منسلک ہو گیا۔ سکھر کے بعد کراچی میں بھی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ بنک کی ملازمت کے دوران ہی اردو کالج سے ایل ایل بی کا امتحان دیا۔ سالِ اول بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ دوسرے سال امتحان شروع ہوا۔ تیسرے اور چوتھے دن امتحان میں طلبہ نے ہڑتال کر دی اور پیپر نہ ہونے دیئے۔ اسی دوران میں انگلستان آ گیا اور میرا ایل ایل بی نامکمل رہ گیا۔ اس زمانے کے دوستوں میں راشد نور اور لیاقت عاصم شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خالد عرفان اور دوسرے بہت سے دوست امریکہ اور کینیڈا چلے گئے جیسا کہ میں نے کہا ۱۹۸۲ میں انگلستان آ گیا اور لندن میں الائیڈ بنک آف پاکستان سے بنک آفیسر کی حیثیت سے منسلک ہو گیا۔ یہاں ہر قسم کی انٹرنیشنل بینکنگ کا تجربہ حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ لندن شہر میں اردو کے شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں شریک رہا خاص طور پر اردو مرکز لندن کے مختلف پروگراموں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ متعدد بار وہاں اپنے مضامین بھی پڑھے۔ ۱۹۸۸ میں ممتاز مفتی اردو مرکز کی دعوت پر لندن تشریف لائے تو جناب افتخار عارف کی تحریک پر چند دوستوں کی مدد سے لندن میں حلقہ ارباب ذوق کو متحرک کیا اور حلقے کے تحت کئی پروگرام کیے۔ ۱۹۸۹ میں مجھے بنک کی برمنگھم برانچ کا مینیجر بنا کر بھیجا گیا۔ برمنگھم میں ادبی سلسلہ چلتا رہا۔ اسی زمانے میں انجمن ترقیِ اردو کے ساتھ منسلک ہوا اور کئی سالوں تک انجمن کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے نہ صرف بہت سے یادگار پروگرام کیے بلکہ برمنگھم میں یادگار وقت بھی گزارا۔ ۱۹۹۵ میں بنک نے مجھے اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ کے عہدے پر ترقی دے کر لندن واپس بلا لیا۔ ۱۹۹۸ میں بنک سے الگ ہو کر میں نے فائننشل سروسز کی فیلڈ میں آئی۔ ایف اے۔ کی حیثیت سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۴ میں لندن سے لینگویجز ڈپلومہ کیا اور اسی شعبے سے متعلق ایک اور کاروبار شروع کیا۔ اس کاروبار کا تعلق لسانی ترجمانی سے ہے۔ اس سلسلے میں لندن میں الجزیرہ ٹی وی، بی بی سی انگلش سروس کے ساتھ کام کیا اور ان کی بعض دستاویزی فلمز کے سلسلے میں بھی ان کے ساتھ کام کا موقع ملا۔ آجکل یہ دونوں کاروبار ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔ پاپا مرحوم کے شعری اور ادبی شوق اور ذوق کی وجہ سے کتابوں سے دوستی ہوئی۔ ہمارے گھر پاپا کے بعد مجھ سے پہلے میرے بڑے بھائی آذر تمنا نے شاعری شروع کی۔ مجھے ذاتی طور پر شعر پڑھنے اور لکھنے کے ساتھ ساتھ اچھی نثر پڑھنے کا شوق ہے۔ جس میں افسانے اور ناول بھی شامل ہیں اس کے علاوہ سیاسی تجزیات بھی میرے مطالعہ کا مستقل حصہ ہیں اور ان موضوعات پر لکھنا بھی پسند ہے۔ ۲۰۰۱ء میں اردو تحریک کی جانب سے قتیل شفائی ایوارڈ سے نوازا گیا اس کتاب کی کئی نظمیں اور غزلیں پچھلے کئی سالوں اکادمی ادبیات پاکستان کے پاکستانی ادب کے سالانہ انتخاب میں شامل رہیں۔ میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بہت ہی اچھی سی بیگم کا نام روبی ہے اور پچھلے چھ سات سال کی تمام شاعری روبی کی رفاقت کی مرہونِ منت ہے۔ (ادارہ)

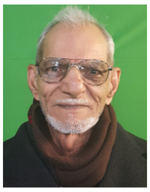

شائق نصیر پوری کی غزل کا مزاج

اسحاق ساجد جرمنی

شائق نصیر پوری کی غزلیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔شائق نصیر پوری جو کہ جدید نسل کے شاعر ہیں اور قدیم وجدید کہ ہم آہنگی کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں۔شائق نصیر پوری کی غزلوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فیضانِ فطرت کے سہارے ہی بڑے شاعر بننے کے خواب نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ حالات، زمانہ، ماحول اور رفتار کی امتزاج سے اپنی غزلوں میں روح پھونک رہے ہیں۔اور شائق نصیر پوری کا مستقبل بہت شاندار نظر آ رہا ہے ۔شائق نصیر پوری ایک حساس شاعر ہیں وہ امن کی فاختہ اُڑانا چاہتے ہیں۔دلوں میں اُترنے اور لہو میں سرایت کر جانے والے اشعار معنی کو اُجالنے اور چمکانے کا کردار ادا کرتے ہیں۔شائق نصیر پوری کی غزل میں ایک گداز ہے مخروطی ہے اُن کی نگاہ اپنے گردوپیش پھیلے ہوئے مناظر پر ہے جیسا کہ ان کے اشعار سے ملتی ہے۔اشعار اُن کے فکری سانچے میں ڈھل کر باہر آتے ہیں اور وقت کے بیکراں سمندر کے ساحل پر موتیوں کی طرح جگمگاتے ہیں۔شائق نصیر پوری کی غزل کی پہلی خوبی اسلوبی طہارت ہے انہوں نے اسے سجانے سنوارنے کی خاطر اپنا طریقِ بیان سادگی و پرکاری سے ہم رشتہ کیا ہے۔آپ کی اکثر غزلیں فکر واحساس کی ندرت، روایت ورُجان کی جدّت طرز ادا کی شدت کے عناصرِ ثلاثہ سے عبارت ہیں۔عہدِ جاریہ میں معاملہ یہ ہے کہ شعرا کے پاس الفاظ تو ہیں لیکن مہمل، اظہار ہے لیکن بے معنی۔لیکن نارسا! شائق صاحب کی شاعری اس کے برخلاف متاثر بھی کرتی ہے۔مطمئن بھی کرتی ہے۔بحیثیت مجموعی شائق نصیر پوری کی شاعری میں تہہ داری بھی اور تنوع بھی، تازگی بھی ہے، مارفتگی بھی ہے، جذبہ بھی عشق کی حدت بھی اور عزم کی شدت بھی۔شائق نصیر پوری کا شعری سفر ابھی جاری ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ابھی انہیں اپنی شہرتوں کے آفاق پر شمس وقمر کی طرح اپنے نام وتخلص کی مناسبت سے اور درفشاں ہونا ہے اس اعتراف واعتبار اور مقبولیت کی بہت سی بلندیاں مزید سر کرنا ہیں۔میرے قیاس وخیال کی پیش گوئی، ان کے تخلیقی رنگا رنگیوں، فنی وفکری جولانیو اور شعری وادبی کارگزاریوں کی روشنی میں بخوبی اور بآسانی لی جاسکتی ہے۔

سلسلہ دلداری کا (عبّاس تابش)

بی بی سی ایک مُطالعہ

دُنیا کا کوئی بھی ادب سرحدوں کا پابند نہیں ہوتا۔اپنی زبان، تہذیب اور فکر وفن کے ساتھ سرحدوں کو پھلانگ کر کسی بھی مُلک کی کسی بھی زبان کے ادبی حلقوں میں (ترجمے کے ذریعہ) پہنچ ہی جاتا ہے اور اُردو ادب تو چاہے دُنیا کے کسی بھی خطّے میں تخلیق پاتا ہو، دُنیا بھر کی اُردو بستیوں میں پہلے اپنی اصلی شکل وصورت کے ساتھ اُسکی رسائی ہوجاتی ہے۔پھر اُس ادب کا وہ حصّہ جو توانا اور عالمی نوعیت کا ہوتا ہے ترجموں کے ذریعے دیگر زبانوں کے ادبی حلقوں میں اپنے جلوے دکھاتا ہے۔جہاں تک ہندو پاک کے اُردو ادب کی بات ہے۔زبان اور تہذیب میں یکسانیت ہونے کے ناطے دونوں جگہوں کے ادبی حلقوں میں قابلِ قبول ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں کے ادب کا ماضی بھی ایک ہے اور حال میں بھی یکسانیت اور یک رنگیت ہوتی ہے۔معمولی فرق معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور طرزِ فکر کا ضرور ہوسکتا ہے لیکن شاعری خاص طور پر غزلیہ شاعری کی پرورش دونوں جگہ یکساں طور پر ہوئی ہے۔غزلیہ شاعری کے ارتقائی منازل مشترکہ طور پر طئے ہوئے ہیں۔یہ سلسلہ عرص دراز سے جاری ہے۔غزلوں کے مجموعے اکیسویں صدی کے سائنسی ترقّی کے دور میں بھی ان دونوں جگہوں پر خاصی تعداد میں شائع ہورہے ہیں۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے سرحد پار (پاکستان) سے ایک مجموعہ سلسلہ دلداری کا آیا ہے جو عبّاس تابش کی غزلیہ شاعری کی نمائندگی کرتا ہے انتخاب شکیل جاذب کا ہے جبکہ ترتیب واہتمام اشاعت کی ذمّہ داری صفدر حُسین نے قبول کی ہے الحمد پبلیکیشن (لاہور) نے اس کتاب کو ہر لحاظ سے خوبصورتی عطا کی ہے سن اشاعت 2013 ہے اور قیمت 200 روپے ہے۔ہمہ رنگی ٹائٹل کی یہ کتاب 176 صفحات پر مُشتمل ہے مُجھے بحیثیت قاری یہ حسین تحفہ پاکر خوشی ہوئی، مزید خوشی اُس وقت ہوئی جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔اس مُطالعہ کے حاصل کو قرطاس پر سجانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ عبّاس تابش نے جذبات اور خیالات کو نظم کرنے میں بڑی محنت، محبّت اور حکمت سے کام لیا ہے۔ان اوصاف کے تاثر نے مُجھے کچھ سطریں لکھنے پر مجبور کیا ہے

۔اس سے پہلے کہ آگے گفتگو کا سلسلہ شروع ہو کچھ اشعار اسی کتاب کے مُلاحظہ فرمائیں۔

گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم ترے شہر سے جاتے ہوئے مرجاتے ہیں

ہم کو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

تمہارے ساتھ کرنے کی بہت سی اور باتیں ہیں
غزل کا کیا غزل تو میں پرندوں کو سُنا لوں گا

اب اُس کو یاد بھی کرتا ہوں پوچھ کر اُس سے
یہ نوبت آئی ہے شرطیں قبول کرتے ہوئے

ان پانچ اشعار سے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عبّاس تابش کی شعری سوچ کتنی مُختلف اور چونکانے والی ہے۔ یہ سوچ غزل کی ہیئت میں رچ بس جاتی ہے تو غزل کے شوقین کے لئے نیا ذائقہ فراہم کرتی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ تابش نئی غزل میں موضوعات کو اہمیت دیتے ہیں اور اچھوتے اور نت نئے مضامین نظم کرتے ہیں۔ انھیں ایسا کرنے میں دقّتیں ضرور آتی ہوں گی، زبان اور بیان کی صفائی اور شفّافیت کے لئے اُلجھنوں اور رکاوٹوں سے بھی واسطہ پڑتا ہوگا لیکن تابش اپنی بات کہے بغیر نہیں رہتے۔ یہ ان کی غزل سے اُنسیت اور اپنی ذات اور خیالات کے اظہار کے لئے صنفِ غزل کو مُنتخب کرنے اور اہمیت دینے کا ثبوت ہے۔ عبّاس تابش کے اس مجموعِ کلام میں مُختلف بحور میں غزلیں ہیں لیکن چھوٹی بحروں میں جو غزلیں ہیں وہ کچھ الگ ہی لُطف دیتی ہیں۔ صفحہ نمبر 44 اور 45 پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

دہکتے دن میں عجب لُطف اُٹھایا کرتا تھا
میں اپنے ہاتھ کا تتلی پہ سایا کرتا تھا

یہ غزل آٹھ اشعار پر مُشتمل ہے تو بہ نو مضامین لئے ہوئے یہ غزل داد کی مُستحق ہے کہ اس کے ہر شعر میں اظہار کے تیور الگ ہیں۔ رنگِ تغزّل شاعر کی سوچ لہر کی توانائی کو ظاہر کرتا ہے، اس غزل کے اور دو اشعار مُلاحظہ فرمائیں۔

اگر میں پوچھتا بادل کدھر کو جاتے ہیں
جواب میں کوئی آنسو بہایا کرتا تھا

ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اور اُس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا

عبّاس تابش کی جدّت پسندی یک رنگی نہیں ہمہ رنگی ہے۔ سوچ رنگوں کو الفاظ سے قرطاس پر paint کرنے کا ہُنر شاعر کو آتا ضرور ہے لیکن کہیں کہیں یہ رنگ پھیکے بھی پڑ جاتے ہیں لیکن بد رنگ نہیں ہوتے۔ شاعر کے محتاط روّیے کی وجہ سے لاج رہ جاتی ہے۔ ایسے اشعار کو بھی کمزور اشعار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مضامینِ نو کو پیش کرنے کی کوشش کی ستائش لازمی ہے۔ اس سے روایتی غزل پٹے پٹائے مضامین سے چھُٹکارا پا کر نئے راستے اپنا سکتی ہے۔ اس شاعر کی غزل جہت اِسی طرح جاری رہی تو نئی غزل کو توانائی بخش سکتی ہے۔ فی الحال ان کی غزل کو تجرباتی نئی غزل کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ تابش نے عصرِ حاضر کی مروّجہ نئی غزل کے لفظیات کو نظر انداز کر کے اپنے لفظوں میں اپنی غزل کو سنوارنے سجانے کی کوشش کی ہے۔ اس شاعر کی طرح اور بھی غزل گو شعراء نے ایسی کوششیں کی ہیں اور کر بھی رہے ہیں لیکن اس مجموعے کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تابش کی غزل سوچ مُنفرد اور الگ ہے۔ کچھ اور اشعار مُلاحظہ فرمائیں۔

اس بات پہ دُنیا سے مری بنتی نہیں ہے
کہتی ہے کہ تلوار اُٹھا اور قلم رکھ

ہماری عمر میں جھوٹی تسلّی مار دیتی ہے
اگر انکار کرنا ہے تو کر انکار بسم اللہ

یہ جو ہے پھول ہتھیلی پہ اسے پھول نہ جان
میرا دل جسم سے باہر بھی تو ہو سکتا ہے

اس قدر گوندھنا پڑتی ہے لہو سے مٹّی
ہاتھ گھُل جاتے ہیں تب کوزہ گری آتی ہے

اپنے دُکھ اپنی ہی آنکھیں روتی ہیں
ہر گھر کا اپنا پرنالا ہوتا ہے

مُختلف غزلوں سے مثال کے طور پر یہ چند اشعار اس لئے پیش کئے

گئے ہیں کہ ان اشعار سے معلوم ہو کہ شاعر کے اظہار کے طریق کیا کیا ہیں، ویسے یہ یا اس مطالعے میں دیئے گئے اشعار شاعر کے شعر گوئی کی مکمّل غمازی نہیں کرتے لیکن شاعر کے سُخن رنگ کی نُمائندگی ضرور کرتے ہیں۔اس مجموعے میں اور بھی کئی اشعار ایسے ملیں گے جو عبّاس تابش کو fresh diction کا خوش کلام شاعر ثابت کرتے ہیں بی مجموعی طور پر عبّاس تابش کی کتاب سلسلہ دلداری کا کی غزلیہ شاعری خوش فکر، خوش دل، جدّت پسند قارئین کو پسند آئے گی اس کا مُجھے یقین ہے۔آخر میں اسی کتاب کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے جو موثر بھی ہے اور مُناسب بھی بی میر تقی میر سے لیکر آج تک ہم سب دل زدوں کیلئے شاعری ہی تو ڈھال ہے بی سو عبّاس تابش نے یہ ڈھال پہن رکھی ہے ہم دل زدہ لوگ جب بھی چاہیں عبّاس تابش کی غزل میں سانس لے سکتے ہیں بی یہ غزل بھلے مانس ہے۔ ہمیں پناہ دیگی۔ ہمارے اندر جوت جگائے گی اور ہمیں پھر سے زندہ کر دیگی عبّاس تابش دل سے معاملہ بند نہ کرنا کہ بہت سے دل زدوں کا تم سے معاملہ ہے۔ (اصغر ندیم سیّد ص16 کتاب ہذا)

خالد یوسفی

ریگزار زندگی میں کس جگہ پہنچا ہوں میں
دوستوں کی بھیڑ ہے چاروں طرف تنہا ہوں میں
دوست سارے ہیں مگر درد آشنا کوئی نہیں
کس کو حال دل سناؤں سوچتا رہتا ہوں میں
دوستوں کی یاد جب آئیں کرم فرمائیاں
رات کی تنہائیوں میں دیر تک رویا ہوں میں
رات کا اک ایک لمحہ ہے گواہ اس بات کا
ہجر میں ترے اے ہمدم کس قدر تڑپا ہوں میں
دوستی مطلب بنا کوئی یہاں کرتا نہیں
بات تو سادہ ہے لیکن دیر سے سمجھا ہوں میں
میں نکل پایا نہ اس سے کر لیے لاکھوں جتن
سوچ کے صحرا میں خالدؔ جب کبھی بھٹکا ہوں میں

مومن خان مومن

14 مئی 1852 مومن خاں مومنؔ کی پیدائش کا دن ہے۔غالبؔ اور ذوقؔ کے ہم عصر۔وہ حکیم، ماہرِ نجوم اور ممتاز غزل گو شاعر ''مومن خاں مومنؔ صاحب'' کا یومِ وفات..مومن اردو کے ان چند با کمال شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی بدولت اردو غزل کی شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگے۔مومن نے اس صفن کو ایسا عروج بخشا اور ایسے استادانہ جوہر دکھائے کہ غالب جیسا خود نگر شاعر ان کے ایک شعر پر اپنا دیوان قربان کرنے کو تیّار ہو گیا۔مومن صنف غزل کے صف اوّل کے شاعر ہیں۔انہوں نے اردو شاعری کی دوسری اصناف،قصیدے اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے جس میں وہ اپنی طرز کے واحد غزل گو ہیں۔مومن کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو اس کے اصل مفہوم میں برتا اور خارجیت کا اظہار داخلیت کے ساتھ کرتے ہوئے ایک نئے رنگ کی غزل پیش کی۔اس رنگ میں وہ جس بلندی پر پہنچے وہاں ان کا کوئی مدّمقابل نظر نہیں آتا۔

حکیم مومن خاں مومن کا تعلق ایک کشمیری گھرانے سے تھا۔ان کا اصل نام محمد مومن تھا۔ان کے دادا حکیم مدار خاں شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل ہو گئے۔مومن دہلی کے کوچہ چیلان میں 1801 میں پیدا ہوئے۔ان کے دادا کو بادشاہ کی طرف سے اک جاگیر ملی تھی جو نواب فیض خان نے ضبط کر کے ایک ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی تھی۔یہ پنشن ان کے خاندان میں جاری رہی۔مومن خان کا گھرانا بہت مذہبی تھا۔انہوں نے عربی تعلیم شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی۔فارسی میں بھی ان کو مہارت تھی۔دنیوی علوم کی تعلیم انہوں نے مکتب میں حاصل کی۔علوم متداولہ کے علاوہ ان کو طب، رمل، نجوم ریاضی،شطرنج اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، جوانی میں قدم رکھتے ہی انہوں نے شاعری شروع کر دی تھی اور شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے تھے لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی مشق اور جذبات کے راست بیاں کے طفیل دہلی کے شاعروں میں اپنی خاص جگہ بنا لی۔مالی لحاظ سے وہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔خاندانی پنشن ایک ہزار روپے سالانہ ضرور تھی لیکن وہ پوری نہیں ملتی تھی جس کا شکوہ ان کے فارسی

خطوط میں ملتا ہے۔مومن خاں کی زندگی اور شاعری پر دو چیزوں نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ایک ان کی رنگین مزاجی تھی اور دوسری ان کی مذہبیت۔لیکن ان کی زندگی کا سب سے دلچسپ حصہ ان کے معاشقے ہی ہیں۔محبت زندگی کا تقاضہ بن کر بار بار ان کے دل و دماغ پر چھاتی رہی۔ان کی شاعری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کسی خیالی نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی محبوبہ کے عشق میں گرفتار ہے۔دہلی کا حسن پرور شہر اس پر مومن کی رنگین مزاجی،خود خوبصورت اور خوش لباس،نتیجہ یہ تھا انہوں نے بہت سے شکار پکڑ یا ور خود کم شکار ہوے۔آئے غزال چشم سدا میرے دام میں صیاد ہی رہا میں،گرفتار کم ہوا ان کے کلیات میں چھ مثنویاں ملتی ہیں اور ہر مثنوی کسی معاشقہ کا بیان ہے۔نہ جانے اور کتنے معاشقے ہوں گے جن کو مثنوی کی شکل دینے کا موقع نہ ملا ہوگا۔مومن کی محبوباؤں میں سے صرف ایک کا نام معلوم ہو سکا۔یہ تھیں امتہ الفاطمہ جن کا تخلص صاحب جی تھا۔موصوفہ پورب کی پشہا ور طوائف تھیں جو علاج کے لئے دہلی آئی تھیں۔مومن حکیم تھے لیکن ان کی نبض دیکھتے ہی خود ان کے بیمار ہو گئے۔متعدد معاشقے مومن کے مزاج کے تلوّن کا بھی پتہ دیتے ہیں۔اس تلوّن کی جھلک ان کی شاعری میں بھی ہیکیھی تو وہ کہتے ہیں۔اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا اور پھر یہ بھی کہتے ہیں۔معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا مومن کے یہاں اک خاص قسم کی شانِ استغناء تھی۔مال و زر کی طلب میں انہوں نے کسی کا قصیدہ نہیں لکھا۔ان کے نو قصیدوں میں سے سات مذہبی نوعیت کے ہیں۔ایک قیدزہ انہوں نے راجہ پٹیالہ کی شان میں لکھا۔اس کا قصہ یوں ہے کہ راجہ صاحب کو ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ایک روز جب مومن ان کی رہائش گاہ کے سامنے سے گزر رہے تھے،انوں نے آدمی بھیج کر انیں پ بلا لیا،بڑی عزت سے بٹھایا اور باتیں کیں اور چلتے وقت ان کو ایک ہتھنی پر سوار کر کے رخصت کیا اور وہ ہتھنی انہیں کو دے دی۔مومن نے قصیدے کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا کیا۔دوسرا قصیدہ نواب ٹونک کی خدمت میں نہ پہنچ پانے کا معذرت نامہ ہے۔کئی ریاستوں کے نوابین ان کو اپنے یہاں بلانا چاہتے تھے لیکن وہ کہیں نہیں گئے۔دہلی کالج کی پروفیسری بھی نہیں قبول کی۔یہ استغناء شاید اس مذہبی ماحول کا اثر ہو جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔شاہ عبدالعزیز کے خاندان سے ان کے خاندان کے گہرے مراسم تھے۔مومن عقیدتاً کٹّر مسلمان تھے۔1818ء میں انہوں نے سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن ان کی جہاد کی تحریک میں خود شریک نہیں ہوئے۔البتہ جہاد کی حمایت میں ان کے کچھ شعر ملتے ہیں۔مومن نے دو شادیاں کیں،پہلی بیوی سے ان کی نہیں بنی پھر دوسری شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں خواجہ محمد نصیر کی بیٹی سے ہوئی۔موت سے کچھ عرصہ پہلے وہ عشق بازی سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔1851ء میں وہ کوٹھے سے گر کر بری طرح زخمی ہو گئے تھے اور پانچ ماہ بعد 14 مئی 1852ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

مومن کے شاعرانہ مرتبہ کے متعلّق اکثر نقّاد متفق ہیں کہ انہیں قصیدہ،مثنوی اور غزل پر یکساں قدرت حاصل تھی۔قصیدے میں وہ سودا اور ذوق کے مرتبہ کو نہیں پہنچتے تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ اردو کے چند اچھے قصیدہ گو شعراء میں شامل ہیں۔مثنوی میں وہ دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق کے ہم پلہ ہیں لیکن مومن کی شاعرانہ عظمت کا انحصار ان کی غزل پر ہے۔ایک غزل گو کی حیثیت سے مومن نے اردو غزل کو ان خصوصیات کا حامل بنایا جو غزل اور دوسری اصناف میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔مومن کی غزل تغزّل کی شوخی،شگفتگی،طنز اور رمزیت کی بہترین ترجمان کہی جاسکتی ہے۔ان کی محبت جنسی محبت ہے جس پر وہ پردہ نہیں ڈالتے۔پردہ نشین تو ان کی محبوبہ ہے۔عشق کی وادی میں مومن جن جن حالات و کیفیات سے گزرے ان کو خلوص وصداقت کے ساتھ شعروں میں بیان کر دیا۔حسن و عشق کے خدّ و خال میں انولں نے تخیل کے جو رنگ بھرے وہ ان کی اپنی ذہنی اپچ ہے۔ان کے اچھوتے تخیل اور نرالے انداز بیان نپرانے اور فرسودہ مضامین کو از سرنو زندہ اور شگفتہ بنایا۔مومن اپنے عشق کے بیاں میں ابتذال نہیں پیدا ہونے دیتے۔انہوں نے لکھنوی شاعری کا رنگ اختیار کرتے ہوئے دکھا دیا کہ خارجی مضامین بھی تہذیب ومتانت کے ساتھ بیان کئے جاسکتے ہیں اور یہی وہ طرہ امتیاز ہے جو ان کو دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔

(پیشکش:اعجاز زیڈ ایچ ممتاز شاعر مومن خاں مومنؔ کے
یوم وفات پر منتخب بطور اشعار اظہار عقیدت)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مینا کماری۔ایک شاعرہ

آغا نیاز مگسی

31 مارچ 1972ء باکمال اداکارہ اور شاعرہ مینا کماری ناز صاحبہ کا یوم وفات۔ برصغیر کی ایک بے مثال و باکمال اداکارہ اور شاعرہ مینا کماری یکم اگست 1933 میں پیدا ہوئیں۔

ان کا اصل نام ماہ جبین، فلمی نام مینا کماری اور تخلص ناز تھا۔ ان کی والدہ کا نام پربھاوتی تھا وہ ایک عیسائی بنگالی خاتون تھیں۔ مینا کماری کے والد صاحب کا نام علی بخش تھا۔ وہ ایک تھیٹر آرٹسٹ، نغمہ نگار اور موسیقار تھے۔ پربھاوتی ایک رقاصہ تھی جس نے ماسٹر علی بخش سے شادی کی اور اسلام قبول کر کے مسلمان ہوگئی جس کا اسلامی نام اقبال بیگم رکھا گیا۔ مینا کماری اقبال بیگم اور ماسٹر علی بخش کی بیٹی تھیں۔ مینا کماری نے فلموں میں لازوال کردار ادا کیا اور خوب صورت شاعری کی انہوں نے 14 فروری 1954 میں کمال امروہوی سے شادی کی۔ مینا کماری کو اولاد نہیں ہوئی۔

مینا کماری ناز کی خوب صورت شاعری سے انتخاب

تیری عنایتوں کا انداز جداگانہ
کبھی رو پڑے مقدر، کبھی ہنس پڑا زمانہ

تیری آواز میں تارے سے کیوں چمکنے لگے
کس کی آنکھوں کے ترنم کو چُرا لائی ہے
کس کی آغوش کی ٹھنڈک پہ ڈاکہ ڈالا ہے
کس کی بانہوں سے تو شبنم کو اُٹھا لائی ہے

ہاں کوئی اور ہو گا تو نے جو دیکھا ہو گا
ہم نہیں آگ سے بچ بچ کے گزرنے والے

نہ انتظار، نہ آہٹ، نہ تمنا، نہ امید
زندگی ہے کہ یوں بے حس ہوئی جاتی ہے

سنبھلتا نہیں دل کسی بھی طرح
محبت کی ہائے تباہ کاریاں

شمع ہوں، پھول ہوں یا ریت پہ قدموں کا نشاں
آپ کو حق ہے مجھے جو بھی چاہے کہہ لیں

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا
ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا

آغاز تو ہوتا ہے انجام نہیں ہوتا
جب میری کہانی میں وہ نام نہیں ہوتا

پنجابی کلام

محبوب عالم طارقؔ اوکاڑہ پاکستان

جدوں اوکھی گھڑی آوے دعاواں دیکے توریں توں
صلہ دینا جے اُلفت دا وفاواں دے کے توریں تُوں
گِلہ تیرے جے دل اندر میری آکھی آ کسے گل دا
جویں مرضی تری پیارے سزاواں دیکے توریں توں
عذاباں وچ پھڑی کوئی جے دکھی جان مل جاوے
مسیحا بن کے اہنوں وی شفاواں دے کے توریں تُوں
دکھا کے پیار دے جلوے میری میت سجا جاویں
سنا کے بول دو مٹھے صداواں دے کے توریں تُوں
قیامت تک سلامت رہن تیرے گھر دیاں کنداں
ترے سر جو وی پیاں نے بلاواں دیکے توریں توں
جوانی دے خماراں توں بہاراں رُس پیاں طارقؔ
زمانے لُٹ لئے نخرے اداواں دے کے توریں توں

جواد حسنین بشر

تمہاری یاد میں خود کو بُھلا رکھا ہے برسوں سے
نگاہوں کو تری راہ میں بچھا رکھا ہے برسوں سے
کٹی انگلی پہ آنچل کا جو ٹکڑا تم نے باندھا تھا
وہی ٹکڑا کلائی میں سجا رکھا ہے برسوں سے
نہیں ممکن سوا تیرے نگاہوں میں کوئی آئے
تمہیں ہی بس نگاہوں میں بسا رکھا ہے برسوں سے
جو خط جاتے ہوئے تم نے دیا تھا مجھ کو رو رو کر
بنا کھولے وہ خط میں نے چھپا رکھا ہے برسوں سے
کسی پل نیند آ جاتی تو خوابوں میں ہی جی لیتا
تمہارے ہجر نے مجھ کو جگا رکھا ہے برسوں سے

کافی ہاؤس

ندیم راعی

میں نے اِرم کو شام ۶ ربجے ملاقات کے لئے کافی ہاؤس اس عزم کے ساتھ بلایا کہ آج ہر حال میں اس کے روبرو میں اظہار محبت کر دوں گا ، دو سال کی مسلسل ملاقاتوں و ایک دوسرے کو پسند ہونے کے باوجود میں اظہار محبت نہیں کر پایا تھا۔ آج میں نے اپنا سارا کام نبٹا لیا تھا اور وہاں شام ۵ ربجے ہی پہنچنے کا ارادہ کر لیا تھا کیونکہ ارم ہمیشہ قبل از وقت یا مقررہ وقت پر پہنچ جاتی لیکن پانچ بجنے میں ہی ابھی تین گھنٹے باقی تھے......؟ وقت کاٹے سے نہیں کٹ رہا تھا گھڑی کی سوئیاں سستی سے آگے بڑھ رہی تھیں ایک اک منٹ ایک اک گھنٹے کی برابر ہو گیا تھا۔

میں نے چاہا کہ تازہ شمارہ ''نیا دور'' کا مطالعہ کر لوں یا پھر گل بن دیکھ لوں لیکن ان سب میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا وقت کی یہ سست روی میرے لئے سوہان روح تھی میں بھی پاگل دیوانہ ملاقات کا وقت شام ۶ ربجے مقرر کر دیا دو بجے ہی اسے بلا لینا چاہئے تھا لکھنؤ یونیورسٹی سے کافی ہاؤس ۱۵ رمنٹ کی دوری پر ہے اور میرے دفتر آل انڈیا ریڈیو سے صرف ۵ رمنٹ...... تاہم میرا تو اس سے صرف ۵ رمنٹ کا کام تھا۔ اظہار محبت کرنا کافی پلانا۔ بعدۂ اس کی مرضی پر منحصر کہ وہ جتنا وقت میرے ساتھ گزارے۔

وقت کی اہمیت تب معلوم ہوتی ہے جب کسی کا انتظار ہوتا ہے اور محبت کے اظہار والے لمحے کا انتظار تو ایک اک لمحہ گزارنا مشکل ہوتا ہے تاہم وقت گزاری کے لئے میں نے کاغذ قلم نکالا اور اپنے ایک ادھورے افسانے کی تکمیل پر جٹ گیا افسانے کا پلاٹ و کردار تو میں نے پہلے ہی متعین کر لئے تھے لیکن اختتام و عنوان کی تلاش تھی لہٰذا میں نے از سر نو افسانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تاہم میں نے اپنا پورا ذہن بس اس ادھورے افسانے پر لگا دیا کاغذ پر لکھتا اور کاغذ پھاڑ دیتا پھر لکھتا اور پھر پھاڑ دیتا حتیٰ کہ چار گھنٹے یوں ہی پلک جھپکتے گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا جیسے ہی میں نے کافی ہاؤس جانے کے لئے اپنا اسکوٹر نکالا افسانے کا کلائمیکس اور عنوان مجھے مل گیا تھا۔ میں نے اپنے افسانے کا عنوان ''کافی ہاؤس'' متعین کر لیا کلائمیکس بھی سوچ لیا تھا جسے صرف لکھنا باقی تھا......اولڈ انڈیا کافی ہاؤس لکھنؤ کا ایک ایسا واحد مرکز ہے جہاں اُردو، ہندی ادیبوں، شعراء، سیاست دانوں، مصوّر، فنکار، دانشوران، نامی گرامی پروفیسر، طلبہ طالبات اور وکلاء یہاں آتے۔ جو بازار حضرت گنج ہلوا سیہ مارکیٹ، یوپی پریس کلب، ہندی سنستھان، حضرت محل پارک، پریورتن چوک، رفاع عام کلب، سفید بارہ دری، بلی پریکشا گرہ ، لال باغ، قیصر باغ، اولڈ اُردو اکادمی، امین آباد، دارالشفاء، چوراہہ برلنگن، دفتر آل انڈیا ریڈیو، رؤئل ہوٹل، ودھان سبھا، دفتر محکمہ نشر و اشاعت، چڑیا گھر، لکھنؤ یونیورسٹی، ٹیلے والی مسجد، رومی گیٹ، چھوٹا بڑا امام باڑہ، ریسی ڈینسی کے قریب قریب و بیچ و بیچ ہے۔

جہاں مہمانوں کی ضیافت، حسن و عشق کے چرچے، محبوب و معشوق کی ملاقاتیں، انکار و اقرار فرصت کے تفریحی لمحات گزارے جاتے۔ جہاں اتر پردیش کی پہلی گورنر محترمہ سروجنی نائیڈو اور مسٹر نائیڈو کے بیچ اقرارِ محبت ہوا اور دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ جہاں چکبست، مجاز، فراق، پروفیسر ملک زادہ، منظور احمد، شبنم گورکھپوری، جواں سال شاعر منظر سلیم ایک دوسرے کے اشعار سنتے اور سناتے...... جہاں رام لعل، شہنشاہ مرزا، ڈاکٹر رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، نیر مسعود، بشیشر پردیپ، عمیر راجہ، احتشام حسین، قمر رئیس، پروفیسر محمد حسن، اقبال مجید، احمد ابراہیم علوی پروفیسر محمود الٰہی، عابد سہیل اپنے افسانے اور دیگر تخلیقات ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے اور ساتھ ہی یہ تمام قلم کار اُردو کے فروغ اور بقاء کے لئے جدو جہد کرتے رہتے۔ جہاں ایک معروف انجینئر نے اپنی منظور نظر طالبہ کو کافی پلا کر اظہار محبت کیا اور وہ ان کی دوسری بیوی بنیں، جہاں ساکنان لکھنؤ اپنے مہمانوں کو کافی پلانے لاتے اور بازار حضرت گنج، امین آباد کی رونق سے روبرو کراتے ساتھ ہی لکھنؤ کی چکن دردوزی کے ملبوسات و دیگر اشیاء کی خریداری کراتے...... جہاں کالج و یونیورسٹی کے طلباء طالبات کافی پینے آتے اور ساتھ ہی یہاں کے سنجیدہ و ادبی ماحول میں پیار محبت کے تاثرات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ...... جہاں تاجر ایک دوسرے سے ڈیل فائنل کرنے میں فخر محسوس کرتے ، جہاں معروف افسانہ نگار رام لعل نے غیر مسلمین اُردو مصنفین کانفرنس کا تانا بانا بنا اور ملک کی واحد و انفرادی کانفرنس کا انعقاد لکھنؤ میں کیا۔

جہاں مجاہد آزادی حافظ محمد ابراہیم، بلبھ بھائی پنت، ڈاکٹر رام منوہر

لوہیا، ڈاکٹر عبدالعلیم، جے نرائن، یوسف مہر علی، رجت پٹوردھن وغیرہ ملک کو آزاد کرانے کی سنجیدہ گفتگو کرتے، جہاں انجمن معین الادب و انجمن معراج الادب کے شعراء صفی لکھنوی، حکیم آشفتہ، سراج لکھنوی اور منظر لکھنوی میدان ادب میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ایک دوسرے پہ طنز کے تیر چلانے میں مصروف رہتے وہیں اُردو انگریزی کے ملک گیر شہرت یافتہ آنند نارائن ملا ایڈوکیٹ ان کے بیچ مفاہمت کراتے نظر آتے، جہاں آپ کیلئے ایک مخصوص ٹیبل الگ سے ہوتی، جس کے ارد گرد ڈاکٹر بشیشور، مجاز لکھنوی، سلام مچھلی شہری، احتشام حسین، آل احمد سرور اور کبھی کبھی عابد سہیل کافی سے لطف اندوز ہوتے...... جہاں ہندوستان کی سیاست کے دو عظیم مجاہد آزادی پنڈت جواہر لعل نہرو، محمد علی جناح غالباً ۱۹۳۶ء میں پہلے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کافی نوش فرمائی بعد میں امین آباد کے گنگا پرشاد ورما ہال میں پہلی آل انڈیا اسٹوڈینٹس کانفرنس جس کے روح رواں لکھنؤ یونیورسٹی کے بی اے کے طالب علم علی جواد زیدی تھے کا افتتاح پنڈت جواہر لعل نہرو اور صدارت محمد علی جناح نے فرمائی اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل پڑی جس کا پہلا اجلاس رفاہ عام کلب میں منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا شرکاء میں سجاد ظہیر اور مولانا حسرت موہانی قابل ذکر ہیں۔

دوسرے دن محمد علی جناح اور جواہر لعل نہرو کے اعزاز میں آنند نرائن ملا نے ایک مشاعرہ و کوی سمّیلن کا انعقاد کرایا۔ مشاعرے کی صدارت مسز سروجنی نائیڈو اور نظامت ریڈیو سیلون کے معروف اینکر امین سلونوی نے فرمائی۔ جس میں ملک کے نامور شعراء شریک ہوئے۔ آنند نرائن ملا نے نہرو پر نظم سنائی اس زمانے میں آنند نرائن ملا کسی بورڈ کے چیئرمین تھے جس کے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو تھے۔ کافی ہاؤس میں آنند نرائن ملا کی سامنے والی سیٹ پر ایک اردو روزنامہ کا نامہ نگار برجیش کمار کے ایک سوال کے جواب میں یوں فرمایا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندی کے کچھ سینٹک اردو کو ایک زبان ماننے پر تیار نہیں اور لگا تار اس کے خلاف الٹا سیدھا پرچار کر رہے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اردو شاعروں اور ادیبوں نے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کے لئے جوش پیدا کیا، رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں وطن پرستی کے شعر پڑھتے ہوئے پھانسی پر چڑھے۔۔۔۔۔ درجنوں اردو اخباروں کے پرچار کرنے کے لئے معتوب کیا گیا ان کے مالکوں اور مدیروں کو جیل کی سزائیں جھیلنی پڑیں الہٰ آباد کے اردو ہفت روزہ ''سوراج'' نے آزادی کی لڑائی میں ایک ایسی مثال قائم کی جس کی دنیا نے تعریف کی۔ ۱۹۱۸ء میں یہ نو مہینے تک شائع ہوا۔

اس کے تیرہ ایڈیٹروں کو قید ہوئی۔ پہلے کو پانچ سال، دوسرے کو سات سال، اور اس کے بعد عمر قید کالے پانی کی سزائیں ہوئیں یکے بعد دیگرے تیرہ ایڈیٹر اسی اخبار کے لئے قربان ہو گئے آخر میں حکومت کو پریس ایکٹ بنا کر اس اخبار کو بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کے پہلے صفحہ پر ایک اشتہار ہوتا تھا... کہ ''ایڈیٹر چاہیئے تنخواہ میں دو سوکھی روٹیاں، ایک گلاس پانی اور عمر بھر کے لئے کالے پانی کی سزا'' پولس نے جب اخبار کے دفتر کی تلاشی لی تو میز کی دراز میں گیارہ درخواستیں ملیں جو ایڈیٹر بننا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں ہی نہیں پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے سے فارغ ہو کر سلام مچھلی شہری، اپنے ہمراہ جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، روش صدیقی خمار بارہ بنکوی، اعجاز ردولوی اور بیزار لکھنوی کو کافی پلانے لاتے اور اس دوران شعر و شاعری کی محفل بھی جمتی۔

جہاں ماہر معاشیات ڈی پی مکھرجی، زیڈ اے احمد، ہندی کے معروف ناول نگار یشپال اور بھگوتی سرن ورما، ریڈیو ڈرامے کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ایاز انصاری، کے این کٹر، ایس بی چگ سدا سرن مصرا، معروف تاجرم نسیم، معروف صحافی ودیا ساگر سرین، ایس ایم جعفر، صلاح الدین عثمانی، حیات اللہ انصاری، ایم چھالا پتی راؤ، ڈاکٹر محمد حسن، شری راما راؤ ذہنی سکون حاصل کرنے آتے۔ ارم لکھنؤ یونیورسٹی کی معاون لائبریرین تھی اس کی تقرری کا یہ دوسرا سال تھا اور اُردو زبان و ادب پر اس کی دسترس تھی۔ ارم سے میری پہلی ملاقت یوپی پریس کلب کے ایک پروگرام میں ہوئی تھی۔ میں آل انڈیا ریڈیو کے لئے کوریج کر رہا تھا جہاں رئیس لکھنوی کے شعری مجموعہ ''چوپال'' کی رسم رونمائی تھی نظامت ارم فرما رہی تھیں۔ فنِ نظامت یوں تو آسان نہیں لیکن ارم جیسی موڈرن لڑکی اس کم عمری میں نہایت سلیس و چنندہ الفاظ کا استعمال کر رہی تھی، پیش کئے جانے والے اشعار بھی بحر میں تھے اس کی پیش کش اس قدر برجستہ کہ سامعین کی تمام تر توجہ کا مرکز وہ ہی تھی لانگ جمپر زیب تن کئے، لہراتی ہوئی کھلی زلفیں دلکش و خوبصورت سراپا مجھ سمیت سامعین کو بھی خود سے بے خود بنا رہے تھے میں نے اسے اپنا

تعارف دیا اور بہترین نظامت کے لئے مبارکباد پیش کی۔ اتفاق سے دوسرے ہفتے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک پروگرام کی کوریج کے لئے متعین ہوا جس میں گورنر اتر پردیش جناب رام نائک تشریف لا رہے تھے۔

میں نے اپنے بے ربط سراپے کو درست کیا اور ڈھنگ کے کپڑے پہنے کہ آج ارم سے ملاقات ہوجائے گی۔ میں اس کا سامنا کرنے میں تھوڑی جھجھک محسوس کر رہا تھا میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ رہی تھیں تھوڑا تھوڑا میں نروس بھی تھا کہ بوقت ملاقات اس سے گفتگو کے لئے نہایت سلیس اور چنندہ الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے جس کے لئے میں اپنے ذہن کو تیار کرنے لگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ نہایت ہی شگفتہ سلیس اُردو میں برجستہ لب ولہجہ کے ساتھ گفتگو کرتی ہے۔ تاہم میں اس سے بہتر گفتگو نہ کرسکوں تو کم بھی نہیں حالانکہ میں ایک افسانہ نگار اور اینکر ہوں مجھے ایک دہائی کا تجربہ ہے الفاظ میرے روبرو ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں اور مجھ سے ملتجی رہتے ہیں کہ میں انہیں استعمال کروں۔ میرے پاس الفاظ کا خزانہ ہے سلیس برجستہ برمحل شائستہ اور چنندہ الفاظ ......؟ لیکن ارم بھی کسی سے کم نہیں ہے بہرحال میں تمام تر الفاظ کے تیروں سے اپنے ترکش کو لیس کر کے قبل از وقت یونیورسٹی پہونچ گیا تھا ارم کے ملتے ہی میں نے اسے بصد احترام سلام عرض کیا اور معلوم کرلیا کہ آج سیمینار کی نظامت بھی وہی فرمائیں گی؟ اس نے اپنی نغمگی آواز میں انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ ......''یہ تو ہمارا ہوم سیمینار ہے ہم تو منتظمین میں سے ہیں تاہم آج کے سیمینار کی نظامت ڈاکٹر عباس رضا نیرؔ جلال پوری فرمائیں گے جن کو سماعت کرتے کرتے کبھی کبھی میں بھی نظامت کرلیتی ہوں ورنہ کہاں فنِ نظامت اور کہاں یہ ناچیز......'' آج تو وہ غضب ڈھانے والے پیراہن میں تھی سلیپ لیس شورٹ بلاؤز، کٹ ورک کی خوبصورت کاٹن ساڑی متناسب جسم اور یہ موڈرن لباس اس کے حسن کو دوآتشہ کر رہے تھے۔ سیمینار کے آغاز سے اختتام تک میں اس کے آس پاس ہی منڈراتا رہا اور اس نے محسوس بھی کرلیا تھا کہ میں اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہوں......ہم دونوں نے اپنے اپنے واٹس ایپ کا تبادلہ کرلیا تھا۔

اب ہم وہاٹس ایپ کے ذریعہ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے کبھی وہ اپنے کسی پروگرام میں بلالیتی اور کہیں میں اسے بلالیتا۔ آل انڈیا ریڈیو پر بھی میں نے اسے موقع فراہم کرایا اور اس کی پیش کش میری امیدوں سے کہیں زیادہ بہتر نکلی علاوہ ازیں ہم دونوں ایک دوسرے سے اکثر ملتے رہتے اور گھنٹوں گفتگو کرتے ہم دونوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے پیار میں گرفتار ہیں یہ محض اتفاق ہے یا پھر میری تساہلی کہ جب سے ارم سے ملاقات ہوئی اب تک ان دو سالوں میں ایک بھی افسانہ مکمل نہیں ہو پایا تھا کام سے فارغ ہوکر ارم سے واٹس ایپ کے ذریعہ گفتگو یا پھر ملاقات ...... رات کو تھک ہار کر سوجانا ......یہی روز کا معمول تھا اور تعطیل کے دن تو ہم ساتھ ساتھ رہتے ......اب ہم ایک دوسرے کی کمیوں اور برائیوں کی بھی انگشت نمائی کرنے لگے تھے اسے میرا سگریٹ پینا ناپسند تھا خرچ کرنے کے معاملے میں وہ مجھے بخیل کہتی تھی پرانی گھٹیہ اسکوٹر کو الوداع کہہ کر کار خریدنے کے لئے تنبیہ کرتی ......تاہم مجھے اس کے نت نئے لباس خاص طور سے مختصر ٹائٹ جینز وہ بھی گھٹنوں وغیرہ سے پھٹی ہوئی بیچ لگی ناپسند تھیں فیس بک پر غیروں سے بے تکلفانہ گفتگو نیز اپنی ادھ ننگی بے ہودہ تصاویریں پوسٹ کرنا گوار خاطر تھا لیکن پھر بھی ہم دونوں پیار کی ایک مہین ڈور میں بندھے تھے جن کے دونوں سرے ہم دونوں نے بڑی مضبوتی سے پکڑ رکھے تھے۔

ارم سے قربت کا علم میرے محکمے اور والدین کو بھی ہوگیا تھا وہ اس چنچل اُڑتی پھرتی تتلی کو جلد از جلد میری دلہن بنا کر گھر میں قید کرنا چاہتے تھے مشکل میرے لئے یہ تھی کہ ابھی ہمارے بیچ اظہار محبت نہیں ہوا تھا یعنی ہم نے پہلا مرحلہ تو سر کیا نہیں اور آخری مرحلے یعنی شادی پر قدم کیسے رکھ سکتے ہیں...... پہلے پیار کا اظہار ہو قبولیت ہو بعدہٗ شادی کے بارے میں بات کی جائے۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ ملاقاتیں یہ گفتگو محض دوستی تک ہی محدود ہوں۔ لیکن اس کا میرے ہر بلاوے پر ہمہ وقت دن و رات کا امتیاز کئے بغیر آجانا مجھ سے بے تکلفانہ اس کی گفتگو اس کی آنکھوں میں میرے لئے پیار ہی پیار کا نظر آنا مقررہ وقت سے ایک منٹ دیری سے پہونچنے پر اس کا تلملانا اور جذباتی ہوکر اشک بار ہوجانا......اس کا یہ کہنا کہ''ہمہ وقت مجھے آپ کی آمد کا انتظار رہتا ہے آپ سے گفتگو کرنا آپ کے ساتھ وقت گزارنا میرے لئے یہ زریں لمحات کے مساوی ہیں......'' پھر اس کا میری طرز زندگی پر انگشت نمائی، سوالات، ہدایتیں اور پھر اس نے اپنے وا پنی فیملی کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات یعنی تمام نشیب وفراز سے مجھے واقف

کرادیا تھا۔ غالباً یہ سب تو محبت کی نشانی ہیں۔ آج شام کی ملاقات کا حاصل تو ارم بھی جانتی تھی ۔ چونکہ میں نے وہاٹس ایپ کے ذریعہ اشاروں اشاروں میں اسے بتادیا تھا اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آپ کے والدین سے میرے گھر کے افراد بہت جلد ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور اب ہمیں تین جادوئی الفاظ ایک دوسرے سے کہنے ہیں جس کے لئے ’’کافی ہاؤس‘‘ کا تعین کیا گیا ہے......

میرا افسانہ ’’کافی ہاؤس‘‘ قریب قریب مکمل تھا دوسال بعد کوئی افسانہ تکمیل کو پہونچ رہا تھا لیکن میرے عشق کے افسانے کا کلائمیکس ہونا ابھی باقی ہے اور امید ہے کہ کلائمیکس سوچا سمجھا ہوگا چونکانے والا ہرگز نہیں کیونکہ فکشن اور اصل زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

میں ٹھیک ۶ ر بجے کافی ہاؤس میں اس تاثر کے ساتھ داخل ہوا کہ وہ پہلے سے میری منتظر ہوگی لیکن چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آئی یہ میرے لئے تعجب کرنے والا لمحہ تھا اور میں دائیں جانب کونے میں دوصوفہ نما کرسیوں پر بیٹھ گیا دوسری کرسی پر میں نے اپنا ہینڈ بیگ رکھ دیا تاکہ اس پر کوئی دوسرا نہ بیٹھے علاوہ ارم کے، کرسیوں کے سامنے ایک چھوٹی سی شیشے کی ٹیبل تھی میں نے کافی ہاؤس کا جائزہ لیا دائیں جانب دوسرے کونے میں کچھ شعراء نظر آئے، واصف فاروقی،، ڈاکٹر معراج ساحل، رحمت لکھنوی، رضوان فاروقی، ڈاکٹر ہارون رشید، رفعت شیدا صدیقی اور غالباً گوگل ہندوستانی جو شاید ایک دوسرے کو اپنی اپنی غزلیں سنانے میں مصروف تھے یا پھر کسی مشاعرہ کا ذکر کر رہے تھے۔ یہاں کافی ہاؤس میں ہر ایک یہ احتیاط برتتا کہ ان کی ٹیبل کی آواز کسی دوسری ٹیبل تک نہ پہونچے جہاں سرگوشیاں، سنجیدگی پیر پسارے رہتی۔ سامنے کی طرف دائیں جانب محترم شارب ردولوی، انور جلال پوری، رئیس انصاری، مسرور جہاں، سہیل کاکوری، صبیحہ انور اور وصی صدیقی سکریٹری مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن بیٹھے نظر آئے اور میرے بغل کی کرسیوں پر محکمۂ نشرو اشاعت کے وضاحت رضوی، سید عاصم رضا، سہیل وحید انصاری، غزال ضیغم صاحبہ کسی اہم مسئلہ میں محوِ گفتگو تھے اور کافی کی چسکیاں لگا رہے تھے۔ دوسری جانب کچھ طلباء وطالبات اٹھکیلیاں کر رہے تھے ۔ شاید وہ انجینئر صاحب اپنی منظور نظر شاگردہ کے ساتھ ان ہی دونوں صوفہ نما کرسیوں پر بیٹھے تھے اور یہیں ان دونوں نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ میرے پیچھے کی کرسیوں پر روزنامہ آگ کے ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی اور افسانہ نگار ڈاکٹر عبید اللہ چودھری تشریف فرما تھے۔

’’آیئے تشریف رکھئے......اتنی دیر آپ نے کہاں لگادی آپ کے انتظار میں میری آنکھیں پتھر بن گئیں پل پل آپ کے آنے کی آہٹ سے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا آس پاس کے منچلے کالج کے لڑکے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھے کھوسٹ نے تو مجھے دیکھ کر فوراً کاغذ قلم نکالا اور کچھ لکھنے لگا کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی لکھنے لگتا۔ آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے معزز افراد سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون لاپرواہ غیر ذمہ دار لڑکا ہے جو اپنی اتنی خوبصورت دلکش محبوبہ کو انتظار کرا رہا ہے ۔ یا پھر یہ کوئی کٹی پتنگ تو نہیں......؟ غالباً ان ہی کرسیوں پر بیٹھی کسی منتظر محبوبہ نے اپنے محبوب سے کچھ ایسا ہی کہا ہوگا...... ویٹر کے آنے سے میری محویت ٹوٹی......اس سے میں نے کافی لانے کو کہا...... میں متعجب تھا کہ وقت مقررہ سے قبل آنے والی یہ لڑکی کہاں رہ گئی اسے کیا ہوگیا کہاں ہے وہ......؟ اپنا موبائل فون بھی اس نے بند کر رکھا ہے......ایسا اور اتنا انتظار تو اس نے مجھے کبھی نہیں کرایا نہ ہی میں اس طرح کے انتظار کا عادی ہوں یہ انتظار تو کچھ عجب طرح کا انتظار ہے جو میرے جسم کا تمام خون چوسنے پر تلا ہے......آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ اس کے آنے کی آہٹ ہوتی۔ وہ سلیپ لیس بلاؤز کے ساتھ کاٹن کی ساڑی زیب تن کئے اٹھلاتی مسکراتی کافی ہاؤس کے مغربی دروازہ میں داخل ہورہی ہے جو بالکل میری نظروں کے سامنے ہے وہاں بیٹھے سبھی تقریباً اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں......‘‘ لیکن وہ تو کوئی اور ہے ارم نہیں۔ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے ہر لڑکی جو کافی ہاؤس میں داخل ہورہی ہے مجھے ارم کیوں لگ رہی ہے......؟ وہ آ کیوں نہیں رہی، مجھے کیوں ستا رہی ہے......؟ ویٹر پھر آدھمکا اور میں نے دوسری کافی منگالی پھر تیسری...... اور اب چوتھی کافی اپنے گلے سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگوں کے آنے کا سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا تھا اور آہستہ آہستہ کافی ہاؤس کی تمام کرسیاں خالی ہورہی تھیں کافی ہاؤس بند ہونے کو تھا لیکن ارم نہیں آئی میں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور کافی ہاؤس بند ہوتے ہوتے میں باہر نکل آیا......حسبِ معمول میں صبح دس بجے اپنے دفتر پہونچ گیا تھا میرے سینئر مسٹر جوشی جو مجھ سے بے حد بے تکلف تھے نے طنزیہ کہا...... ’’نیند سے بیدار ہوکر سیدھے یہاں چلے آرہے ہو نہ برش کیا نہ بال سنوارے اور نہ ہی ٹھیک سے فریش ہوئے...... کیا ہوا

سب ٹھیک ٹھاک تو ہے......؟ میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموش رہا اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا ایک کانٹریکٹ اپنے ہاتھ میں لے کر ریکارڈنگ روم میں شعری نشست کی رکارڈنگ کے لئے چلا گیا۔ شعری نشست کا عنوان تھا ''بے وفائی'' اور شعراء میں قمر سنبھلی، آفتاب اثر ٹانڈوی اور سلیم تابش شامل تھے۔ کس نے کیا پڑھا مجھے کچھ معلوم نہیں میں تو صرف کافی ہاؤس میں ارم کی غیر حاضری کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ڈاکٹر رؤف خیر حیدرآباد، ڈاکٹر راشد عزیز جموں کشمیر کے انٹرویوز کی ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر لکھنؤ یونیورسٹی جانے کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا تا کہ مجھے حالات سے آگاہی ہو سکے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ارم اتنی لاپرواہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اتنی غیر ذمہ دار......کوئی مجبوری ہی ہوگی کہ وہ نہ آ سکی یا پھر مجھ سے رابطہ نہ کر سکی......؟ ریکارڈنگ روم سے باہر نکل کر میں اپنی نشست پر جیسے ہی آیا وہاں مجھے اپنی ٹیبل پر ایک سیاہ رنگ کا لفافہ رکھا ملا......میں نے بے دلی سے اسے کھولا......یہ تو ارم کا مراسلہ تھا جس میں لکھا تھا......

جناب ادریس۔ اسلام علیکم......

''سب سے پہلے تو میں معافی کی طلب گار ہوں کہ میں وقت مقررہ پر کافی ہاؤس نہ آ سکی......بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اچانک ممبئی سے میرے بچپن کے دوست وکلاس فیلو اپنے والدین کے ہمراہ تشریف لے آئے جو گذشتہ دس سالوں سے ممبئی میں رہائش پذیر ہیں۔ کاشف کے ساتھ میں تاج ہوٹل ڈنر کے لئے چلی گئی تھی۔ کاشف نے میرا موبائل فون بند کر دیا تھا تا کہ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے۔ جہاں سے دیر رات ہماری واپسی ہوئی اس نے تین جادوئی الفاظ آئی۔ لو۔ یو مجھ سے بول دیئے۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا گھر آ کر معلوم ہوا کہ ہمارے والدین نے ہمارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ میں اپنے والدین کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتی......اور جاتی بھی کیوں کاشف ہینڈسم، اسمارٹ و موڈرن ہے بڑا کاروباری بڑے شہر ممبئی کا ساکن معاشرے میں ایک منفرد مقام ہے اور لکھنوی ہے......اکیسویں صدی کی ایک موڈرن لڑکی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے......؟'' ....ارم

میرے عشق کا یہ چونکا دینے والا کلائمکس میرے افسانے ''کافی ہاؤس'' کا کلائمکس ہی تو ہے......؟

ندیم راعی

احمد فراز کی شاعری میں انسانی عظمتوں کا شعور

احمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر

احمد فراز اپنے عہد کے مقبول محبوب اور منفرد وممتاز شاعر ہیں۔ وہ اپنے دور کے ایک باغی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ شاعرانہ تجربوں کے حوالے سے باغی شاعر نہیں ہیں بلکہ یہ بغاوت اس کی رگ و پے میں خون کی طرح گردش کرتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ظلمت کے خلاف عملاً بغاوت کرتے ہیں۔ وہ اپنے گمراہ لشکر سے حر کی طرح جدا ہو کر سچ کی گواہی دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے احمد فراز کی شاعری میں آسمانی صحیفوں کی طرح صداقت جھلکتی ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے خلوص پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ احمد فراز تلخ حقیقتوں کے ناسور خوشنما لفظوں سے ڈھانپنا نہیں جانتے۔ وہ مصلحتوں کی بنیاد پر دزدیدہ ساعتوں کے طلبگار نہیں ہیں۔ اس لئے وہ صداقتوں کے پیامبر بن کر منصور کی طرح رسن پہ گلو دکھائی دیتے ہیں۔

احمد فراز کی سب سے بڑی بغاوت استحصالی معاشرے کے خلاف نظر آتی ہے۔ وہ نظام جو مفلسوں کے حلق سے نان جویں بھی چھین لیتا ہے۔ احمد فراز سب سے پہلے اس نظام اور خداوندان نظام کو للکارتے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ کے تناظر میں مخلوق کی ازلی ہلاکت زدگی سے افسردہ ضرور ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں پر شکوہ ایوانوں میں رہنے والے مٹھی بھر لوگ زمین پر رینگنے والی مخلوق کا رزق اپنی غلیظ آنتڑیوں میں بھر لیتے ہیں۔ احمد فراز مظلوموں کی آہوں کو اپنے سینے میں سمیٹ کر نعرہ بلب آتے ہیں تو شاہی ایوانوں کے طلائی کلس خوف سے تھرتھراتے ہیں۔

کتنے ہی ناگ خزانوں نے یہاں پالے ہیں
کتنے پیکر ہیں جو ڈھل جاتے ہیں ایوانوں میں
زندگی رینگتی ہے موت کے ویرانوں میں
انقلاب نے انداز بدل ڈالے ہیں
رات دن شام وسحر کس کی جرأت ہو مگر
ناگ خود ہی تو خزانوں نے یہاں پالے ہیں

آگ پھولوں نے بکھیری ہے گلستانوں میں (احتساب)
پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق
اے بھوکی مخلوق (اے بھوکی مخلوق)

احمد فراز ابن آدم کی مسلسل محکومی سے تڑپ اُٹھتے ہیں۔ کل بھی ان کے ماتھوں پر ذلتوں کے داغ تھے آج بھی ان کے دامن میں عزتوں کی راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ابن آدم سے وارثاں تخت وتاج کا یہ رُوح فرسا سلوک شاعر کو چین نہیں لینے دیتا۔ فراز سمجھتا ہے خلعت پوشوں نے تہی دستوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں اس پر انسانیت جتنے اشک بہائے کم ہیں۔ تخت نشینوں نے مفلسوں کا نوالہ ہی نہیں چھینا بلکہ ان کو بے دست وپا کر دیا ہے اور وہ ننگ انسانیت ہو کر بھی ظل الٰہی رہتے ہیں۔

تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی کو زروسیم میں چھپاتے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے
یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری نفرش
مزاج قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اونچے محلات کے بھرم کے لئے
ہر ایک دور میں تزین طوق ودار ہوئی
مگر یہ تخت پہ سلطان یہ بیگمات یہ قصر
مورخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بفیض وقت اگر کوئی راز کھل بھی گیا
زمانے والے طرفدار کج کلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے (بانو کے نام)
میں شہنشاہ زمن ہوں کسے معلوم نہیں
ہر طرف موجب تعمیل ہیں فرمان مرے
میرے ادنیٰ سے اشارے پہ ہیں سب رقص کناں
یہ سپاہی یہ حسینائیں یہ دربان مرے

خادمہ آج سے اس قصر کی تو ملکہ ہے
آ مجھے اپنی گرہ گیر لٹوں میں کس لے
آ مرے جسم سے اک سانپ کی مانند لپٹ
اور تڑپ کر مرے بیتاب لبوں کو ڈس لے
(طلسم ہوشربا)

احمد فراز اپنی شاعری میں کج کلاہوں کے خلاف بغاوت کا علم اٹھائے رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کے کانوں میں خاک نشینوں کی صدائیں گونجتی رہتی ہیں۔ وہ کسی مرحلے پر بھی مقہور فرد کی آنکھ کے آنسوؤں کو نہیں بھولتے۔ یہ الگ بات ہے اس کے پاس مظلوم کے شب وروز بدلنے کی طاقت نہیں ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ آنگنوں کے پھول ہلاک نہ کئے جائیں، ماؤں کے آنسوان کی گود میں سوئے ہوئے بچوں کے ماتھوں پر نہ گریں۔

چمن میں جشن ورود بہار جب بھی ہوا
وطن میں جب بھی فروزاں ہوئے خوشی کے دیئے
رہی ہے بوالہوسوں کے سبو میں بارہ ناب
بلا کشان وفا نے لہو کے گھونٹ پیئے
مہ ونجوم رہے بزم شہر یاراں میں
نگاہ خلق ترستی رہی کرن کے لئے (۲۳ مارچ)
ہلال عید تجھے غمزدوں سے کیا نسبت
کہ خواجگان جہاں ہی ترے چہیتے ہیں
جو ترے نام کے ساغر فضا میں لہرا کر
تری کمان کی قوسوں کو موڑ دیتے ہیں
فغاں کہ تجھ کو بھی ان بے کسوں سے ربط نہیں
جو اپنے دل کے سفینے لہو میں کھیتے ہیں (ہلال عید)
لیکن اس وقت مرے ذہن کے ہر پردے میں
چند سلگی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
مری سانسوں میں ہیں مغموم دلوں کی چیخیں
جن کی قسمت میں کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جن کی شادی بھی غم ورنج کا مجموعہ ہے
جن کو حاصل نہیں ہوتا کسی لمحہ بھی فراغ

جن کو ماں باپ سے ملتے ہیں مصائب کے جہیز
جن کی باراتوں میں جل اٹھتے ہیں اشکوں کے چراغ
(معذرت)

احمد فراز کی ایک اور بغاوت مذہب فروشوں کے خلاف ہے۔اس طبقے نے گلشن ہستی کے بچے کھچے پھولوں کو کچل ڈالا ہے۔اس گروہ نے خواب دیکھنے والی آنکھ ہی بجھادی ہے اور زندگی کی جلترنگ کے سر جلا دیئے ہیں۔ان اجارہ داروں نے جگنوؤں کو جینے کی مہلت تو دی ہے مگر ان کی روشنی اپنی سیاہ مٹھی میں قید کر دی ہے۔تاریخ گواہ ہے مذہبی آقاؤں نے ہمیشہ صاحب تاج وتخت کا ساتھ دیا ہے۔ان کی مذہبی تاویلیں غریبوں کا عرصہ حیات تنگ کرنے کے کام آئی ہیں۔مذہب فروشوں کے فتوے مظلوموں کی شب تاریک بڑھا دیتے ہیں۔فتویٰ فروشوں کے گھر تو زروسیم سے بھر گئے ہیں لیکن روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوئے ہاتھ اب تک خالی ہیں۔بھوکی رعایا ایک طرف حاکموں کے جبر سہتی ہے دوسری طرف خودساختہ مذہب کی سولی انتظار کرتی ہے۔فرد کبھی خسروان جہاں کی چیرہ دستی کا شکار ہے کبھی اہل دستار کی حرص کا نشانہ ہے۔فراز نے جرات رندانہ سے مذکورہ گروہ کے گرد حصار باندھا ہے۔فراز نے ایسے ریاکاروں کے خلاف دلیرانہ موقف اختیار کیا ہے۔وہ ان کے سیاہ کارناموں کو بےخوف بیان کرتے ہیں۔مذہب کے نام پر گردن تو کاٹی جاتی ہے مگر مذہب کے نام پر روٹی میسر نہیں آتی۔مذہب کے رکھوالوں نے مذہب کے نام پر غریبوں کو صرف آنسوؤں پر قناعت کا درس دیا ہے۔

مفلسو اپنے مقدر سے شکایت نہ کرو
اس سے انساں کے ایماں میں فرق آتا ہے
ہم تو ناچیز سے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کون سی بات میں کیا مصلحت یزداں ہے
کتنے گمراہ و گنہگار ہوئے جاتے ہیں
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی
مرمر و آہن و سیماں کی عمارات بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے
ٹھیک کہتے ہو مگر خام عقائد والو
ہم تو تقدیر کے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
(آگ)

کہ محراب و منبر سے
فتوہ گروفتنہ پرداز دیں
حرف حق بیچتے ہیں
فقیہان مسند نشیں
حرص و دینار و درہم میں
ترے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں
(میں اکیلا کھڑا ہوں)

یہی وہ مقام ہے جہاں احمد فراز براہ راست خالق مطلق سے مخاطب ہوتے ہیں۔یہاں ان کے لہجے میں شکوہ بھی ہے اور درماں طلبی بھی ہے۔وہ خدا کی عظمت سے واقف ہیں مگر وہ اس مشیت کو سمجھنا چاہتے ہیں جس نے اس کو تیرہ نصیب قرار دیا ہے۔وہ قصر نشینوں کے عذابوں سے ریزہ ریزہ نہیں ہوئے مگر انسان کی بےتوقیری نے ان کے اعتماد کو پاش پاش کر دیا ہے۔وہ یہ چاہتے ہیں کہ انسان کی عظمت بحال کر دی جائے۔

خدائے تنور و آب سارہ مجھے گلہ ہے
مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا ملا ہے
کہاں ہے وہ تیرا دست فیاض
جس کے جود و سخا کے قصے
سنہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے
حاشیے بن کے رہ گئے ہیں
کہاں ہیں وہ تیری جنتیں جن کی داستانیں
بڑے تکلف سے عرش سے فرش پر اتاریں
کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شہد و شکر کے بے انتہا ذخیرے
کہ جن کی کاذب جھلک سے تو نے
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا (منصور)

احمد فراز کی شاعری کا ایک اور پہلو جو بہت نمایاں ہے وہ ان کی شجاعانہ پیش قدمی ہے۔وہ اپنے محاذوں پر پسپائی کے باوجود اعتراف شکست نہیں کرتے۔زنداں کی تاریکیاں بھی ان کی بینائی کو سلب نہیں کر سکیں۔احمد فراز پھولوں کے مرجھانے کے بعد بھی ان کی خوشبوؤں کو محسوس کرتے ہیں۔ایسا

لگتا ہے ابد آشنا چراغوں نے ان کا سینہ منور کر دیا ہے۔

ہاتھ کٹتے رہے ہیں پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعث تقلید بنی
شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلہ خورشید بنی
(شہدائے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نام)

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں
کہ جن کو دیکھنے کی آرزو میں
ہم نے آنکھیں تک گنوا دی تھیں
کہ جن کی عاشقی میں
اور ہوا خواہی میں
ہر ترغیب کی شمع بجھا دی تھیں
چلو ہم بے نوا
محروم سقف بام و در ٹھہرے
چلو ہم بد مقدر بے ہنر ٹھہرے
پر اپنے آسماں کی داستانیں
اور زمیں کے انجم و مہتاب کیوں بیچیں
(ہم اپنے خواب کیوں بیچیں)

احمد فراز کا پر امید لب ولہجہ بالآخر انسان کی فتح کی علامت ہے۔ کب تک ظلم کی وراثت منتقل ہوتی رہے گی۔ ایک ایسی صبح ضرور آئے گی جس کی کرنوں کے سامنے ظلم کے حنوط شدہ چہرے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔

اس اذیت کے سفر میں
کون سا موسم نہیں آیا
مگر آنکھوں میں نم
لہجے میں سم
ہونٹوں پہ کوئی نغمہ ماتم نہیں آیا
ابھی تک دل ہمارے
خندہ طفلاں کی صورت بے کدورت ہیں
ابھی ہم خوبصورت ہیں (ابھی ہم خوبصورت ہیں)
رات کی جانگداز ظلمت میں
عزم کی مشعلیں جلائے ہوئے
دل میں لے کر بغاوتوں کے شرر
وحشتوں کے مہیب سائے میں
سر بکف جاں بلب نگاہ بہ قعر
سرخ و خونیں علم اٹھائے ہوئے
بڑھ رہے ہیں جنوں کے عالم میں
چند ناداں چند دیوانے (چند ناداں چند دیوانے)

احمد فراز کی شاعری کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ امن و آشتی کے دلکش نغموں کے پجاری ہیں۔ وہ تاریخی تناظر میں جانتے ہیں کہ اہل ہوس انسان کو جنگ کا ایندھن بنا دیتے ہیں۔ ملک گیری کی ہوس، اقتدار کی کشمکش اور مال غنیمت کی کشش جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے۔ فاتحوں کا غرور لاکھوں انسانوں کے بہتے ہوئے خون سے نمو پاتا ہے۔ جنگ ازل سے انسانیت کی دشمن ہے۔ اس حوالے سے احمد فراز کے یہاں ایک بین الملکی محبت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر رشتہ موانست کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ گویا وہ نسلی، قومی اور جغرافیائی تفریق کو آدم خاکی کے لئے وجہ فساد سمجھتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعری میں ایک عالمگیر برادری کا خواب مچلتا ہے۔

کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کئے ہیں یہ اثاثے سارے
کس نے دیوار تفاوت کی اٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے لوگو (سرحدیں)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد فراز کی شاعری انسانی عظمت کی بازیافت کا عمل ہے۔ اس شاعری میں ان کے خلوص کی حدت کارفرما ہے۔ ان کی نظموں کا آہنگ مفہوم کے مطابق زیر و بم اختیار کرتا ہے۔ احمد فراز لفظوں کی نسبی خصوصیات سے واقف ہیں اس لئے ان کی نظموں میں استعمال ہونے والے الفاظ اپنی جگہ نہایت معتبر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات کا مد و جزر بڑے سلیقے سے نظم میں سما جاتا ہے۔ اسی لئے نظم کی تاثیر ذہن سے روح تک اتر جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک انسانیت سے پیار کرنے والا ایک شخص بھی موجود ہے احمد فراز کی شاعری زندہ رہے گی۔ احمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

***

انسانیت کا نوحہ گر افسانہ نگار

اقبال متین

احمد علی جوہر

آزادی کے بعد جب ہم اردو افسانہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال متین ہمیں ایک اہم اور ممتاز افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ کر اہل علم وادب سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' ہے جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''نچا ہوا البم'' کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں سامنے آیا۔ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں ''خالی پٹاریوں کا مداری'' (۱۹۷۷ء) ''آگہی کے ویرانے'' (۱۹۸۰ء) ''مزبلہ'' (۱۹۸۹ء) ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' (۱۹۹۳ء) اور ''شہر آشوب'' (۲۰۰۳ء) ہیں۔ اقبال متین کی پہلی کہانی ''چوڑیاں'' ۱۹۴۵ء میں 'ادب لطیف' میں شائع ہوئی اور ان کا آخری افسانوی مجموعہ ''شہر آشوب'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان کا افسانوی سفر تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں اقبال متین نے اپنی افسانوی تحریروں سے افسانوی ادب کو مالا مال کیا اور بہت سی ایسی خوبصورت اور شاہکار کہانیاں لکھیں جن سے دنیائے افسانہ میں ان کی اپنی منفرد ومستحکم شناخت قائم ہوئی اور وہ ایک اچھے اور باکمال افسانہ نگار تسلیم کیے گئے۔

اقبال متین کی کہانیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں اور زندگی کے مختلف رُخوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کئی زاویوں سے سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں انسانیت کے دکھ درد میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بقول عابد سہیل: ''ان کے افسانوں میں دکھوں کی پھوار جس طرح برستی ہے ویسے اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کی تحریروں میں شاید ہی برسی ہو۔ لیکن یہ پھوار ان کو، ان کے کرداروں کو اور ان افسانوں کے قاری کو جینے اور زندگی کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔''

(۱) اقبال متین کی ذاتی زندگی انتہائی دُکھ بھری تھی۔ اپنے نجی غم میں انھوں نے دنیا کے غموں اور دکھوں کو شامل کر کے جب کہانیاں لکھنی شروع کیں تو ان کی کہانیوں میں تمام دکھ درد کے مارے انسانوں کو اپنی کہانی نظر آنے لگی۔ ان کی کہانیوں کی یہی وہ خوبی ہے جو انھیں مقبول ومحبوب اور ایک قابل قدر افسانہ نگار کی شکل میں سامنے لاتی ہے۔ اقبال متین کے افسانوں کے مطالعہ سے قوی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انسانیت اور اخلاقی قدروں کے زوال کے نوحہ گر افسانہ نگار ہیں۔ دراصل اقبال متین کو انسانیت اور انسانی قدریں بے حد عزیز ہیں مگر بدلتے اور بگڑتے معاشرے میں جب وہ انسانیت کا جنازہ نکلتے دیکھتے ہیں تو وہ درد سے تلملا اُٹھتے ہیں اور کراہنے لگتے ہیں۔ یہی وہ دُکھ درد ہے جسے اقبال متین الفاظ کا جامہ پہنا کر افسانوی شکل عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں درد کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ دیکھئے درج ذیل اقتباس میں وہ انسانیت کے ملیامیٹ ہونے پر کس طرح ماتم کناں ہیں اور اس نوحہ وغم کو وہ کس طرح لفظوں میں ڈھالتے ہیں:

''اب تو ہر عید تہوار کو خوشیاں گھر گھر میں چھپ چھپ کر روتی ہیں۔ مسرتیں ہنسنا بھول گئی ہیں۔ فطرت جب اپنا سب کچھ لٹا چکتی ہے تو نہ شعائیں روشنی پھینکتی ہیں نہ کرنیں۔ بس ایسے اندھیرے پھیلتے ہیں۔ ایسے اندھیرے پھیلتے ہیں کہ سورج کالا ٹھیکرا بن کر رہ جاتا ہے۔ اب یہ کالا ٹھیکرا کب طلوع ہوتا ہے، کب غروب ہوتا ہے کسی کو پتہ نہیں۔ اب میرے شہر میں کوئی آدمی کسی آدمی کو نہیں پہچانتا۔ انسانیت جب پہچانی نہیں جاتی تو دلوں کی اجڑتی بستیوں کو کون پہچانتا ہے۔ آنکھوں میں بستے ویرانوں کو کون پہچانتا ہے۔ اب تو نام پوچھ کر خنجر چلائے جاتے ہیں لیکن کٹتے ہیں تو سڑک پر بہتا ہوا لہو کچھ اس طرح ایک ہو جاتا ہے کہ اس خنجر سے لکیر کھینچ کر اس کو جدا نہیں کر سکتے جس خنجر سے وہ بہایا گیا تھا۔ نام پوچھنے پر یہ خون اپنا نام بھی تو نہیں بتلاتا۔ اور میں ایسے میں ہر ارتھی، ہر جنازے کے ساتھ اپنی مٹی کو دفناتا پھرتا ہوں جلاتا پھرتا ہوں۔''

(۲) اسی افسانے کے دوسرے اقتباس میں ملاحظہ کیجیے کہ افسانہ نگار نے فنکاری کے ساتھ انسانی درندگی کو کس طرح آشکارا کیا ہے:

''باہر لگے کرفیو میں زندگی اپنی حفاظت کے تصوّر کے باوجود کس درجہ بے آرام ہے۔ ساری آدمیت چوہے کی طرح بلوں میں دبکی بیٹھی ہے۔ چھپے ہوئے خنجروں نے جنہیں کاٹ دیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ تباہی مچی ہے کہ آدمی کی درندگی پر شرم آنے لگی ہے۔ غذا مہنگی ہے خون ارزاں ہے، انسانی خون گلی کوچوں میں ضائع ہو سکتا ہے لیکن گیہوں کے دانے کے لیے بچے بلک

رہے ہیں۔'' (۳)

اقبال متین نے اپنی کہانیوں میں طنز کے عنصر سے بہت کام لیا ہے۔ یہ عنصران کی تحریروں کے رگ وپے میں خون کی طرح جاری وساری ہے۔ دیکھئے انھوں نے اپنے ایک افسانے بعنوان ''چھت'' میں موجودہ تہذیب اور معاشرتی زوال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کتنا گہرا طنز کیا ہے:

''آج آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنیاں شہروں کو لوٹ رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے کٹا پھٹا سڑکوں پر بے تحاشہ بھاگتا ہوا انسان شہروں کو لوٹ رہا ہے۔ دوڑتی ہوئی کاریں اڑتے ہوئے جہاز، بڑے بڑے سنیما گھروں کے پردوں پر اسمگلنگ کا کاروبار، قتل، غارت گری جو سارے معاشرے کا گھناؤنا پہلو ہے وہی آج سب سے دلچسپ پہلو ہے۔'' (۴)

اقبال متین کی کہانیوں میں بے زمینی کا احساس شدید طور پر نمایاں ہے۔ انھوں نے بے زمینی کے کرب کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے اور انتہائی فنکاری سے اُسے لفظوں کا پیرہن عطا کیا ہے۔ ان کے یہاں بنیادی انسلاک کے فقدان سے پیدا کرب بے زمینی کے کرب کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیکھئے یہ بے زمینی ''نچا ہوا البم'' میں کس طریقے سے سامنے آئی ہے۔ افسانہ کا کردار ''میں'' بچپن کی سرزمین کی بازیافت کے لیے سفر کرتا ہے اور دوبارہ اس ماحول میں سانس لینے کی کوشش کرتا ہے مگر۔

''یہ ہمارا مکان ہے۔ میں مکان کے صدر دروازے تک آپہنچا ہوں صدر دروازہ جیسے صرف میرے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ میرا اشتیاق کس قدر بڑھ گیا ہے۔ مگر میں اپنے ہی گھر میں اس طرح داخل ہو رہا ہوں جیسے کسی دوسرے کے گھر اپنی کوئی سب سے زیادہ قیمتی شئے تلاش کر رہا ہوں جو گم ہوگئی ہے۔ در و دیوار مجھے حسرت سے تک رہے ہیں یا میں انہیں حسرت سے تک رہا ہوں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ حسرتیں مشترک ہیں۔ میں احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوں، یادوں کے اس جھرمٹ میں کسی کو نظروں سے گدگداتا ہوں۔ کسی سے نظریں چراتا ہوں اور آگے بڑھتا بڑھتا آہستہ آہستہ اس دروازے تک آپہنچا ہوں جہاں سے مجھے اپنے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہونا ہے۔ لیکن دروازے پر قفل لگا ہے۔ میں تڑپ کر رہ گیا ہوں۔ جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کو اس کی ماں کے سینے سے جھپٹ لے۔ کاش یہ دروازے ایک بار میرے لئے کھل سکتے۔'' (۵)

''نچا ہوا البم'' میں بچپن کے ماحول سے دوری ایک کسک کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وہ کسک ہے جو افسانے کے کردار کو دو حصوں یعنی حال اور ماضی کی شخصیت میں منقسم کر دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان وقت کی خلیج ہے جسے وہ پُر کرنے سے معذور ہے۔ اس طرح دونوں شخصیتیں ایک سطح پر آ کر استعاراتی جہت اختیار کر لیتی ہیں اور ذات کی شکستگی بڑے نوکیلے انداز سے وقت کے پس منظر میں ظہور پذیر ہوتی ہے:

''میرا بچپن جسے میں ابھی ابھی بستی میں چھوڑ آیا ہوں، دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لئے مجھے غور سے دیکھا۔ کیا تم وہی ہو جس نے مجھے ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ دیا؟۔ کیا تم میری تلاش میں یہاں تک نہیں آئے تھے؟۔۔ میں نے منہ پھیر لیا تو اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیئے۔ ٹھیک ہے، آج سے میں بھی اسی کو ڈھونڈوں گا جس کی تمہیں تلاش ہے لیکن کیا اس تلاش میں ہم پھر کبھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے؟'' (۶)

اقبال متین نے اپنے افسانوں میں بے زمینی کے تجربے عجیب وغریب زاویوں سے کئے ہیں۔ ''کتاب سے کتبہ تک'' میں یہ بے زمینی منوّر میاں، کی غیر عملی زندگی کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ اپنی بڑھتی عمر کے ساتھ منوّر میاں ذہنی طور پر عالم وفاضل تو بن گئے اور پڑھتے رہنا ان کا مشغلہ تو ہو گیا لیکن ان کی بے عمل زندگی جو جاگیردارانہ نظام کی پروردہ تھی گزرے ہوئے وقت کی صورت میں بے زمینی کا احساس بن کر کاٹنے لگی۔ ''اور اب منوّر میاں کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ یہ سب کچھ انھوں نے کھو دیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو گیا کہ منوّر میاں بیچارے قبروں کے بیچوں بیچ کھڑے اپنی نکٹائی اور پتلون کی کریز درست کرتے رہ گئے۔'' (۷)

اقبال متین کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اقبال متین کو اس بات کا شدید رنج وملال ہے کہ موجودہ متعفن معاشرے میں بے حسی وبے ضمیری عام ہو چکی ہے۔ لوگ اپنی انفرادی شناخت کھو چکے ہیں۔ انسانی اور اخلاقی اقدار بے معنی ہو چکی ہیں۔ بیشتر افراد ذاتی اور محدود مفادات کے چکر میں پڑ کر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ بظاہر تو انسان نے سائنس اور صنعت کی بدولت بڑی ترقی کر لی ہے مگر زندگی کی بنیادی قدر یعنی انسانیت دم توڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ جو چند افراد آج بھی اس

قدر کو کسی نہ کسی وجہ سے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ عام انسانوں کا استحصال کرنے والے دولت مند ہو گئے ہیں مگر شدید غربت کی چپیٹ میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ پڑھے لکھے غریب لوگوں کی زندگی المناک بنتی جا رہی ہے۔

اقبال متین موجودہ مادّی تہذیب سے بہت نالاں ہیں۔ اس مادّی تہذیب کی وجہ سے انسانی و اخلاقی قدریں ملیامیٹ ہو رہی ہیں۔ افراد بے حس ہو رہے ہیں۔ افراد کی طرح ہمارے شہر بھی بے چہرہ اور بے حس ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کوئی انفرادی شناخت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس سنگین صورت حال سے اقبال متین سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ شاید اسی لیے ان کے اکثر مرکزی کردار شدید ترین ذہنی اور دماغی الجھنوں اور مستقل بے خوابی کا شکار نظر آتے ہیں۔

اقبال متین کے افسانے فنّی و تکنیکی اعتبار سے بہت متاثّر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں فنکارانہ اختصار سے کام لیا گیا ہے اور فنّی ہنرمندی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں ساحرانہ فضا پیدا کرنے اور قاری کو اپنی طرف متوجّہ کرنے میں خاصی کامیاب ہوئی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فضیل جعفری رقم طراز ہیں:

''ہارڈی کی طرح اقبال متین کے افسانوں کا کینوس بھی بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ وہ اختصار سے شدّتِ تاثر پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ ایک کے بعد ایک افسانہ پڑھتے چلے جائیں آپ کو ان میں ایک بھی فالتو جملہ نہیں ملے گا۔ اسی طرح ان کے یہاں کردار تو ہیں مگر اس طرح کہ ہیرو اور ہیروئن نہیں ہیں جن سے ہم ترقی پسند افسانہ میں عموماً دوچار ہوتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ اقبال متین کے افسانوں میں افسانہ نگار کا خلّاقانہ ذہن سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ احساسات و جذبات کو اجاگر کرنے کے لیے ان کا ذہن کرداروں کی تشکیل بھی کرتا ہے اور واقعات کو بھی جنم دیتا ہے۔ انہوں نے خود زبوں آثار میں اعتراف کیا ہے کہ: ''آنکھیں نہیں دیکھتیں، ذہن دیکھتا ہے۔ ٹانگیں کسی کے پیچھے نہیں بھاگتیں، ذہن بھاگتا ہے۔ ہاتھ کسی کو سینے سے کھینچتے ہیں نہ پرے ڈھکیلنے کا یارا رکھتے ہیں''۔ بیانیے کی یہ تکنیک اور یہ افسانوی اسلوب اقبال متین کی اپنی ایجاد ہے۔''(۸)

حوالے: (۱) عابد سہیل، اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی سا تنقیدی مطالعہ) مشمولہ، سہ ماہی بادبان (اقبال متین نمبر)، شمارہ نمبر: ۱۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء، کراچی۔ (۲) اقبال متین، شہر آشوب، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۶۷۸، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء۔ (۳) ایضاً، ص، ۶۸۱۔ (۴) اقبال متین، چھت، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۷۰۴۔ (۵) اقبال متین، نچا ہوا البم، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۸۱، ۱۸۰۔ (۶) ایضاً، ص، ۱۸۳۔ (۷) اقبال متین، کتاب سے کتبے تک، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۲۱۰۔ (۸) فضیل جعفری، اقبال متین: شہر آشوب کا تنہا مسافر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب، نورالحسنین، ص، ۸۶، ۸۷، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

ریسرچ اسکالر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

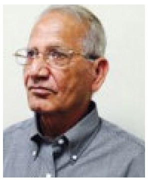

پروفیسر مبارک احمد عابدؔ

ادارہ

والد کا نام غلام قادر صاحب مرحوم۔ والدہ عائشہ بیگم صاحبہ مرحومہ، ولادت ۱۹۴۴ء میں کلاس والا تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔ تعلیم ایم اے اردو تعلیم گاؤں اور تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم الاسلام کالج میں بزم اردو کے پہلے معتمد پھر صدر رہے۔ سال اول سے چہارم تک کالج کے مجلّہ المنار کے ایڈیٹر اور چیف ایڈیٹر (حصہ اردو) رہے۔ سال اوّل سے سال چہارم تک تعلیمی وظیفہ (گورنمنٹ سکالرشپ) حاصل کیا جو ایم اے تک ملتا رہا۔ پیشہ تدریس۔ کچھ عرصہ لاہور میں (پرائیویٹ کالج میں) اردو پڑھاتے رہے۔ پھر 1971 سے 2004 تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھایا۔ 1971 میں جب کالج قومیا لیا گیا تو 33 سال کی ملازمت کے بعد اسی کالج سے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ بعد میں دس سال تک نصرت جہاں کالج میں پڑھایا۔ 2014 میں امریکہ چلے گئے۔ آجکل امریکہ میں ہی ہیں شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ سکول اور کالج کے زمانے سے ہی شاعری کر رہے ہیں۔ آپ کا کلام سدا بہار ہے۔ آپ کا کلام مقبول عام ہے۔ آپ بہت ہی شستہ کلام کہتے ہیں۔ دیار مغرب میں آپ کے بہت چاہنے والے رہائش پذیر ہیں۔ آپ اکثر مشاعروں میں نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی عمر دیتا چلا جائے آمین۔

***

اقبال متین کے افسانوں میں زوال پذیر جاگیردار معاشرہ کی عکاسی

احمد علی جوہر

اقبال متین اردو کے قدآور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش سرٹیفکٹ کے مطابق ۲/فروری ۱۹۲۹ء ہے۔ وہ حیدرآباد کے ایک علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالقادر ناصر شاعر تھے۔ ان کے دو چچا سید قادرالدین تمکین سرمست اور نسیم قاسمی بھی غزل گو شاعر تھے اور ایک چچا دستگیر الدین ڈرامہ نویس تھے۔ اس طرح علمی وادبی ماحول انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کی ذہنی وفکری تربیت مشہور ترقی پسند انقلابی شاعر مخدوم محی الدین کے زیراثر ہوئی تھی۔ وہ شروع سے ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے اور آگے چل کر ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ وہ طبقاتی نظام، سماجی ناانصافی، مزدوروں اور کسانوں پر ظلم واستحصال اور ان کے ساتھ غیرانسانی رویوں کے خلاف تھے۔ وہ انسانیت، محبت، مساوات اور سماج کی اعلیٰ قدروں پر یقین رکھتے تھے۔ اس کی جھلک ان کی کہانیوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اقبال متین ترقی پسند تحریک سے ضرور وابستہ تھے، آگے چل کر وہ جدیدیت سے بھی متاثر ہوئے مگر وہ کبھی فیشن پرستی کا شکار نہیں ہوئے۔ کہانیاں لکھتے وقت انھوں نے ہمیشہ اعتدال وتوازن کے رویے کو اپنائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کہانیوں کو ترقی پسندی کے عیوب جیسے جذباتیت، اشتہاریت، نعرہ بازی اور سطحیت اور جدیدیت کے عیوب جیسے بے جا علامت نگاری، ابہام وتجریدیت سے بچائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ دیگر افسانہ نگاروں کی طرح ان کے یہاں بھی کمزور کہانیاں ملتی ہیں مگر ان کی کامیاب اور اچھی کہانیوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان کے افسانوں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) ''اُجلی پرچھائیاں'' ۱۹۶۰ء، (۲) ''نچا ہوا البم'' ۱۹۷۲ء، (۳) ''خالی پٹاریوں کا مداری'' ۱۹۷۷ء، (۴) ''آگہی کے ویرانے'' ۱۹۸۰ء، (۵) ''مزبلہ'' ۱۹۸۹ء، (۶) ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' ۱۹۹۳ء، (۷) ''شہر آشوب'' ۲۰۰۳ء۔

اقبال متین نے اپنے آس پاس کی زندگی اور اپنے اردگرد کے ماحول سے اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنا ہے۔ وہ حیدرآباد، دکن کے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جو ایک زمانہ میں جاگیرداروں کا مسکن رہا ہے۔ ان کے زمانہ میں اس طبقہ کی حالت عروج پر کم، اور زوال پذیر زیادہ تھی۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں دیگر موضوعات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس طبقہ کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ویسے جاگیردار طبقہ اردو افسانہ کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اس حوالے سے پریم چند کی کئی کہانیاں، احمد ندیم قاسمی کی ''لارنس آف تھیلیبیا''، قاضی عبدالستار کی ''مالکن''، ''پیتل کا گھنٹہ''، جیلانی بانو کی ''موم کی مریم''، ''پیاسی چڑیا'' اور واجدہ تبسم کی ''اترن''، ''نتھ کا بوجھ'' وغیرہ قابل ذکر کہانیاں ہیں۔ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے جاگیردار طبقہ کے ظالمانہ اور استحصالی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔

واجدہ تبسم نے اس طبقہ کے ذریعے عورتوں پر کیے جانے والے مظالم اور ان کے جنسی وجسمانی استحصال کو جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ جیلانی بانو نے بھی اسی پہلو کو اجاگر کیا ہے مگر وہ واجدہ تبسم کی طرح جذباتی نہیں ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں واجدہ تبسم کی طرح عریانیت اور جنسی لذتیت کا عنصر نہیں ہے۔ قاضی عبدالستار وغیرہ نے اس طبقہ کی قابل رحم حالت کو دکھایا ہے۔ اقبال متین نے اس طبقہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہوئے اس معاشرہ سے متعلق تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس طبقہ اور اس نظام کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ بقول پروفیسر یوسف سرمست:

''ان کے دادا نواب مسیح الدین خاں بڑے معین الدولہ والی پائیگاہ آسمان جاہی کے سگے ماموں اور سرپرست تھے۔ نواب معین الدولہ کے والد نواب آسمان جاہ بشیر الدولہ کا انتقال اس وقت ہوا جب معین الدولہ بہت کم عمر تھے اس لیے نواب مسیح الدین خاں کو ان کا سرپرست اور نگراں مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے اقبال متین کو جاگیرداروں کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا''۔ (۱)

مذکورہ بیان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال متین حیدرآباد کے زوال پذیر جاگیردار معاشرہ کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ انھوں نے اس طبقہ کی زندگی، اس کے شب وروز، اس کے عادات واطوار، رہن سہن اور اس کی دلچسپیوں اور اس کے اخلاق وکردار کا بہت قریب سے

مشاہدہ کیا ہے۔ مشاہدہ کی اس گہرائی و گیرائی کو ان کے افسانوں میں بدرجہ اتم محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر جو افسانے لکھے ہیں ان میں ''کتاب سے کتبے تک''، ''ملبا''، ''گرتی دیواریں'' اور ''آدمی اور آدمی'' فنی اعتبار سے دلچسپ اور شاہکار کہانیاں ہیں۔ ان کے علاوہ ''اندھیروں کی لاج'' اور ''پانی کے چراغ'' بھی اس موضوع پر ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں جاگیردار طبقے کے ظلم و استحصال، لٹے پٹے نوابوں کے ماضی کی آن بان اور ان کی شان و شوکت اور حال میں ان کی بے بسی و لاچاری اور قدیم و جدید قدروں کی آویزش اور جاگیردار معاشرے کی ٹوٹتی بکھرتی قدروں، ان تمام پہلوؤں کو افسانہ نگار نے اس چابکدستی اور فنی ہنرمندی سے بیان کیا ہے کہ یہ افسانے ماضی کی معاشرتی تاریخ معلوم ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر مشہور افسانہ نگار و ناول نگار نورالحسنین اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اقبال متین نے آصف جاہی سلطنت کے کروفر کو بھی دیکھا، جاگیردارانہ ٹھاٹھ باٹ کو بھی جیا، اور پھر جب وقت بدلا تو انھوں نے شاہی کو عوامی اقتدار میں منتقل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ جاگیرداروں کو لٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ امارات کے سرنگوں ہونے کے گواہ بھی بنے۔ قدیم اور جدید تہذیبوں کے تصادم کو بھی بھوگا، قدروں کو پائمال ہوتے ہوئے بھی دیکھا اور قدروں کے پاسبانوں کو اپنی آبرو کی مٹتی سسکتی آن بان کی پرورش کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس لیے ان کا قلم ایک مخصوص روایت کا امین بھی ہے۔ جدید سفر کا آشنا بھی، ان کے کردار اعلیٰ اقدار کے پروردہ بھی ہیں اور بدلتے زمانے سے اس طرح آنکھیں بھی چار کرتے ہیں کہ عزت سادات کو بہر حال کسی صورت محفوظ بھی رکھنا ہے۔ جن ادیبوں نے محض سنی سنائی کہانیوں پر خیالی گھوڑے دوڑاتے ہوئے جاگیرداروں کے ظلم، ان کی بے راہ روی اور ان کی عیاشیوں کو گرفت کیا ہے، انھیں اقبال متین کے ان افسانوں کو بھی ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہئے، جو حقیقت کا آئینہ بھی ہیں اور ماضی کی معاشرتی تاریخ بھی۔ ان افسانوں میں 'ملبہ'، 'گرتی دیواریں'، 'پانی کے چراغ'، 'آدمی اور آدمی'، 'کتاب سے کتبے تک اور اندھیروں کی لاج وغیرہ شامل ہیں جن کے کردار مٹتی تہذیب و تمدن کے نمائندے بھی ہیں جن میں انسانیت کی شمع بھی روشن ہے اور آن بان کی چمک بھی اور اپنی گرتی بگڑتی تباہ ہوتی ہوئی ساکھ کی آبروؤں کا احساس بھی ہے، ان کی مسکراہٹوں میں ان کے چھپے ہوئے غم بھی ہیں اور ان کے غم میں ماضی کی شاندار روایتیں بھی ہیں، ان کی آنکھوں میں جلال و جمال بھی ہے اور حال کی بے بسی بھی۔''

(۲) نورالحسنین کی درج بالا باتوں سے ایک حد تک تو اتفاق کیا جاسکتا ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ اقبال متین نے جاگیرداروں کے ظلم، ان کی بے راہ روی اور ان کی عیاشیوں کو گرفت نہیں کیا ہے، کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ زوال پذیر جاگیردار معاشرے کے یہ ایسے پہلو تھے جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہاں اقبال متین نے ان باتوں اپنے مخصوص، سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان باتوں کو بیان کرتے ہوئے نہ تو وہ جذباتی ہوئے ہیں اور نہ ہی انھوں نے اسے رومانی بنانے کی کوشش کی ہے۔ فلسفے کے مشہور پروفیسر عالم خوندمیری نے اقبال متین کی کہانیوں کے اس پہلو پر ایک تقریر کے دوران یوں اظہار کیا ل کیا ہے:

''اقبال متین نے حقیقت کو Romanticise کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سب سے بڑی جواُن کی کامیابی ہے وہ یہی ہے کہ وہ بڑی بے رحمی سے سماجی حقیقت کا اور Human Condition کا مطالعہ کرتے ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے Feudalism کے خلاف یا حیدرآباد کے Feudalism کو افسانوں کے ذریعہ پیش کیا تو اس میں غصہ، حقارت یا نفرت موجود نہیں تھی اور نہ Feudalism کے گرنے یا مرجانے سے انہیں کسی قسم کا کوئی صدمہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص ایک Detached Observer ہے جو اپنے Person یا اپنی شخصیت کو الگ کر کے حقیقت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اور یہ ان کی ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ اپنے شخصی میلانات یا رجحانات کو الگ کر دیتے ہیں جب وہ حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی حقیقت کی عکاسی میں ہمیں ایک ایسا گہرا عنصر ملتا ہے اور یہی انسانی ہمدردی ان کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے''۔

(۳) یہ امتیازی خصوصیت ان کی ان تمام کہانیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جو انھوں نے جاگیردار طبقہ پر لکھی ہیں۔ ان میں ایک اہم کہانی ''کتاب سے کتبے تک'' ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار اقبال متین نے جاگیردار طبقہ کی بے عملی، نام نہاد علمیت و فضیلت اور رعونت پسندی کو موضوع بنایا ہے۔ پوری کہانی طنز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار منور میاں ہیں جن کی

شخصیت بے عملی کی شکار ہے۔ بحث و مباحثہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور دوسروں پر اپنی شخصیت کی برتری جتلانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کی متضاد شخصیت کا تعارف افسانہ نگار نے اپنے مخصوص طنزیہ اور دلکش انداز میں یوں کیا ہے:

''منوّر میاں خاندان بھر میں لائق فائق مشہور تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی تینوں زبانیں جانتے تھے اور جاننا بھی کیسا، عالموں فاضلوں کے کان کاٹتے تھے۔ بحث و تمحیص ہوتی، مکالمے و مجادلے ہوتے تو منور میاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ بس مجبوری تھی سوا تنی ہی کہ خیالات کی وسعتوں کا زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ رک رک کر، تھم تھم کر، چبا چبا کر کچھ اس طرح بحث کرتے کہ موضوع کتنا ہی جان دار ہو منور میاں کی زبان پر آ کے دم توڑتا ہوا سا محسوس ہوتا''۔

(۲) منوّر میاں اپنے نام نہاد علم و فضل کی بدولت خاندان بھر میں عالم و فاضل کی حیثیت سے مشہور تھے اور خاندان کے لوگ ان سے بے حد مرعوب تھے۔ شادی کے بعد منوّر میاں نے اپنی سسرال کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا تھا جہاں انھیں ہر طرح کی سہولت میسّر تھی۔ وہ رات دن کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے اور پان کی گلوریاں چباتے۔ اس کے علاوہ انھیں دنیا کے کسی کام سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی ساری ذمّہ داریاں ساس سسر پر ڈال رکھی تھیں اور خود بے کار اور اپاہج بنے ہوئے تھے۔ وہ شرعی ڈاڑھی رکھے ہوئے تھے اور ٹخنوں تک شرعی پاجامہ پہنتے تھے۔ ان کے اس مرشدانہ انداز اور اصول پسندی سے ان کے ساس سسر اور بیوی سب ہی نالاں تھے مگر یہ سب ان کی نام نہاد علمیت کے رعب و دبدبہ سے خائف تھے۔ ان کے ساس سسر اور بیوی دل سے تو نہیں مگر ڈر کر ان کا احترام ضرور کرتے اور ان کے لیے بہتر سے بہتر کھان پان کا انتظام کرتے۔ اچھے کھان پان اور کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ اپنی سسرال میں منور میاں کا محبوب مشغلہ اپنی بیوی سے جنسی خواہش پوری کرنا اور بچے پیدا کرنا تھا۔ دیکھیے اس پہلو کو افسانہ نگار نے طنز و مزاح کی ہلکی چاشنی کے ساتھ کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

''اللہ رکھے منور میاں کے سات بچے تھے۔ آٹھویں کی آمد آمد تھی۔ وہ ہر بچے کو اللہ کی برکت پر محمول کرتے اور اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے۔ ایک برکت نازل ہو کر کچھ ہی مہینے گزرتے کہ دوسری برکت کے نزول کے لیے اللہ میاں کو ہموار کر لیتے۔ رہ گئی بیوی سو وہ تو ایک ذریعہ تھیں۔ پھر محکوم و مجبور الگ۔ منور میاں نیم خدا تھے۔ ان کا التفات ہی تو ان کی بیوی کے لیے سب کچھ تھا۔ ''جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں'' کے مصداق جب چاہتے کچی نیند سے بیدار کر لیتے۔ اور اس طرح برکت کا نزول ہوتا رہتا''۔

(۳) منور میاں کو اپنی سسرال میں تمام آسائشیں دستیاب تھیں۔ وہاں بڑے مزے سے ان کے شب و روز گزر رہے تھے۔ وہ بے عمل ضرور تھے مگر اپنی بے عملی کو چھپانے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو کتابوں میں غرق کر رکھا تھا۔ وہ خاندان بھر میں علوم مشرقیہ کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے انھیں انگریزی کا چسکہ پڑا۔ پھر کیا تھا ایک پرچہ دے کر گریجویٹ ہو بیٹھے اور اپنی شرعی ڈاڑھی اور شرعی پاجامہ کو اُتار پھینکا۔ ان کی اس بدلی ہوئی شکل و صورت سے ان کے سسر کو امید بندھی کہ اب منور میاں کچھ کام کریں گے مگر اب بھی ان کی حالت جوں کی توں رہی۔ اسی درمیان منور میاں کو حصولِ علم کے لیے لندن جانے کی سوجھی۔ ان کی اس تجویز سے ان کے ساس سسر اور بیوی دل ہی دل میں خوش ہوئے اور خوشگوار مستقبل کے خواب دیکھنے لگے۔ وہ مہنگا سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر بڑی شان سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ لندن سے انھیں اپنا گھر، سماج اور یہاں کی ہر چیز بہت حقیر معلوم ہونے لگی اور اپنا ملک قبرستان کی مانند نظر آنے لگا۔ اب وہ پروفیسری کا خواب دیکھنے لگے۔ اپنی بیوی کے نام خط میں ان تمام خیالات کا اظہار کرتے ہوئے منور میاں نے ان سے ایک عالیشان مکان ڈھونڈنے کو کہا جہاں لندن سے واپسی کے بعد وہ رہ سکیں۔ وہ لندن پانچ سال کے لیے گئے تھے مگر ان پر فالج کا حملہ ہوا اور دو ہی برسوں میں لوٹ آئے۔ لندن جا کر بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، جیسے گئے تھے ویسے لوٹ آئے البتہ اب پان کے ساتھ بڈّ ٹی بھی پینے لگے۔ اب بڑی تمکنت سے سوٹ پہن کر ٹائی لگا کر دن بھر گھر کے پاس چبوترے پر قبروں کے بیچ بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے رہنا، مختلف انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرنا اور دوست و احباب میں گھرے رہنا اور ان سے گفتگو کرنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ وہ بیوی بچوں کے لیے تو بڑے اصول پسند اور سخت دل واقع ہوئے

تھے مگر دوستوں کے درمیان وہ بڑے متواضع اور مرنجاں مرنج معلوم ہوتے۔ ان کی شخصیت کا یہ تضاد افسانہ نگار کی زبانی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں: ''منور میاں کی پہلودار شخصیت ویسے تو پہلو در پہلو تھی۔ لیکن ان کی شخصیت کے دو رُخ بڑے متضاد تھے۔ وہ شخص جو اپنے بیوی بچوں میں اصول پسندی کے نام پر شقی القلبی کی سرحدوں تک جا پہونچا تھا۔ اپنے دوست احباب میں بڑا ہی مرنجاں مرنج، متواضع اور منکسر المزاج سمجھا جاتا تھا''۔

(۴) منور میاں نے دوست احباب کی حتی الامکان تواضع کی مگر بیوی بچوں کو انھوں نے پیار نہیں کیا۔ بچوں پر تو انھوں نے ایسی بے جا سختیاں کیں کہ بچے ان کے سائے تک سے ڈرنے لگے۔ ان کی بیوی بھی ان سے خائف تھیں۔ خاندان کے تمام لوگوں پر ان کے نام نہاد علم وفضل کا رعب ودبدبہ قائم تھا۔ وہ گھمنڈ وتکبر میں چور ہمیشہ اپنے علم پر اتراتے رہتے۔ لندن سے واپسی کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ان کو چھوٹی موٹی مختلف نوکریوں کی پیش کش ہوئی مگر انھوں نے اسے اپنی شان کے خلاف سمجھا اور اسے ٹھکرا دیا۔ ان کے علم کے طنطنہ اور غرّہ نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ کسی نوکری کے قابل نہیں رہ گئے۔ سسر کے انتقال کے بعد ان کی حالت ایسی بدتر ہوگئی کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہ گئے۔ اب ان کی وہ کتابیں جن پر وہ اترایا کرتے تھے، ان کے لیے قبرستان بن گئیں۔ بالآخر ان کا انتقال اسی ہندوستان اور قبرستان میں ہوا جس سے لندن جانے کے بعد انھوں نے ناطہ توڑ لیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے ان کی قبر پر کتبے کی طرح حاشیہ بنا کر لکھ کر چھوڑ دیا۔ ''میر منور علی خاں مرحوم، ایم۔ اے (آکسن)

اس افسانہ میں اقبال متین نے جاگیردارانہ نظام کے پروردہ منور میاں کی شخصیت کے گھناؤنے رُخوں کو بڑی چابکدستی سے سامنے لایا ہے اور اس پر گہرا طنز کیا ہے۔ منور میاں کی شخصیت دوغلی، جھوٹی، مکّار اور ناکارہ تھی جو نہ کسی کام کے لائق تھی اور نہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔ انھوں نے اپنی محرومیوں، کمزوریوں اور اپنی شخصیت کے مکروہ پہلوؤں کو اپنے نام نہاد علم کے پردوں میں چھپا لیا تھا۔ انھوں نے وقت کی قدر بالکل نہیں کی تھی۔ اب جاگیرداری بھی بس نام کو رہ گئی تھی۔ ایسے میں منور میاں جیسے شخص کے لیے اس سماج میں کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ وقت کی ناقدری نے ان سے ایسا بھیانک بدلہ لیا کہ ان کی شخصیت کو شکستہ اور چکنا چور کر کے رکھ دیا۔ ان کا بے عمل اور مضرّت رساں کردار ایک پورے طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے اور ان کے کردار میں جاگیردار طبقہ کے تمام بے عمل، ناکارہ، اپاہج، حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے والے اور گھمنڈ وتکبّر سے چور لوگوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ فنی وتکنیکی اعتبار یہ انتہائی جاندار افسانہ ہے جو قاری کو مکمل طور سے اپنی گرفت میں لیتا ہے۔

جاگیردار معاشرے سے متعلق اقبال متین کے افسانے ''ملبہ''، ''گرتی دیواریں''، ''آدمی اور آدمی'' بھی اردو کے اہم افسانے ہیں۔ ''ملبہ'' میں افسانہ نگار نے نوابوں کے ذریعے عورتوں پر کیے جانے والے جبر واستبداد اور ان کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار نواب صاحب ہیں۔ ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ اپنی پسند کی مختلف عورتوں سے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل ہے۔ اس کام میں ان کا معاون ان کا وفادار ملازم بے چارہ سرفراز علی ہے جس نے سماج کے دبے کچلے طبقے سے ان تمام لڑکیوں کو نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا کر دم لیا جن پر نواب صاحب کی نگاہ ٹھہر گئی۔ اس طرح اس نے بیسیوں لڑکیوں کو نواب صاحب کی آرام گاہ میں داخل کیا اور انھیں اپنی مالکن سمجھا۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ ایک دن ان کی چہیتی بیوی گلبدن بوا پر بھی نواب صاحب کا دل آجائے گا اور وہ گلبدن بوا سے گلبدن بیگم بن جائیں گی۔ اپنی بیوی کے چھن جانے کا اسے اتنا صدمہ ہوا کہ مارے غم کے کسی خیراتی اسپتال میں اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی بیوی جب نواب صاحب کے عقد میں آئیں تو پورے دس ماہ بعد ان کے بطن سے نواب قلندر حسین خاں پیدا ہوئے جو ہو بہو اپنے والد نواب صاحب کی طرح تھے۔ باپ سے ان کی ملتی جلتی شکل وصورت افسانہ نگار کے دلچسپ انداز بیان میں ملاحظہ ہو:

''نواب قلندر حسین خاں کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ بس باپ کے منہ سے ٹپک گئے ہیں۔ چال ڈھال، رنگ روپ، دوہری ہڈی، عمر سے زیادہ گوشت پوست اور چربی۔ نواب صاحب کو اگر جوانی بخش دی جائے تو اللہ میاں بھی پہچان نہ سکیں کہ باپ کون سا ہے اور بیٹا کون سا؟ اسی لیے تو وہ نواب صاحب کے چہیتے تھے ورنہ ڈیوڑھی بھر میں کتنے ہی ایسے ننگے بچے

درخت پر کونے میں پڑے سوکھ رہے تھے جن کے متعلق نواب صاحب کو شبہ تھا کہ تخم کسی نے بویا ہے تو کھاد اور کسی نے دی ہوگی۔ دونوں کام نواب صاحب نے نہیں کیے۔ جب اس بات کا یقین ہوجائے کہ فصل اپنی نہیں تو کون دردسر مول لے۔ کون جھگڑوں سے بچائے۔ کون پتے اور ٹہنیاں گن گن کر پروان چڑھائے۔ آخر قدرت کے تفویض بھی تو کچھ کام ہیں''۔

(۵) اس اقتباس میں افسانہ نگار نے باپ سے بیٹے کی مشابہت کو بیان کرتے ہوئے اشاراتی انداز میں جاگیردار معاشرہ کے اس بے رحم اور سفّاک ماحول کو بھی بے نقاب کیا ہے جہاں ڈیوڑھی کے کونے میں کتنے ہی ننگے بچے پڑے ہوتے۔ ان بچوں کی ولادت ناجائز اور مخلوط جنسی تعلق کے نتیجہ میں ہوتی اور ان کا باپ کون ہوتا یہ پتہ نہیں چل پاتا۔ یہ بچے ڈیوڑھی کے کنارے پڑے سوکھتے رہتے۔ ان میں سے کچھ بچے اپنی قسمت سے بچ جاتے اور کچھ مرجاتے۔ جاگیردار معاشرہ کا یہ وہ غیر انسانی ماحول تھا جہاں انسانی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ وہاں ساری اہمّیت نفسانی خواہش کو حاصل تھی۔ اس معاشرہ میں کمزور اور غریب طبقہ کی عورتیں اسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ تھیں اور بس۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اہمّیت نہیں تھی۔ گلبدن بوا نواب صاحب کے نزدیک اس وجہ سے اہمّیت اختیار کرگئی تھیں کہ نواب صاحب کا ان پر دل آ گیا تھا۔ جب ان کے بطن سے نواب صاحب کی شکل وصورت سے ملتا جلتا بیٹا پیدا ہوا تو وہ نواب صاحب کی اتنی چہیتی بیگم بن گئیں کہ ڈیوڑھی کی ساری بیگمات ان پر رشک کرنے لگیں مگر چند ہی برسوں بعد دوسری بیگمات کی طرح ان کا بھی برا حشر ہوا۔ دراصل اب نواب صاحب نے بمبئی کی ایک نوخیز لڑکی کو اپنی خواب گاہ کی زینت بنالیا تھا اور گلبدن بیگم سے نگاہ پھیر لی تھی۔ اب گلبدن بیگم نواب صاحب کے لطف وکرم سے محروم ہوگئی تھیں۔ اس محرومی کے ساتھ اب وہ اپنے بیٹے نواب قلندر حسین خاں کی توجہ سے بھی دور ہوتی چلی گئیں۔ تین چار دن میں جاکر کہیں ایک جھلک وہ اپنے بیٹے کو دیکھ پاتیں۔ دراصل ان کے بیٹے دن رات اپنے ابا حضور کی اطاعت وفرماں برداری میں لگے رہتے۔ ان کے خیال میں ڈیوڑھی کے مالک نواب صاحب تھے اور ان کی خدمت کرکے ہی اس کی جائداد سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس لیے وہ دن رات اپنے والد کی خدمت اور ان کی دیکھ ریکھ میں لگے رہتے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے نہیں مل پاتے تھے اور اپنی نئی نویلی دلہن کو بھی بہت کم وقت دے پاتے تھے۔ ان کی دلہن تنہائی اور اداسی سے گھبرا کر رونے لگی تھیں۔ ان کے پوچھنے پر وہ خاموش دل ہی دل میں یوں سوچنے لگی تھی۔ دیکھئے ان کی سوچ کے ذریعے افسانہ نگار نے اس عہد اور اس معاشرہ کی دبی کچلی عورتوں کی بے بسی، ان کی حسرتوں، مایوسیوں اور المناکیوں کا نقشہ کس فنی مہارت سے کھینچا ہے۔

''بستر کی شکنوں نے نشتر بن کر دلہن کو کچوکے دیئے۔ دیواروں پر رینگتی ہوئی تنہائیوں نے دلہن کے کانوں میں سرگوشیاں کیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے دلہن کو اشارے کیے۔ کہہ دو دلہن۔ آج ہی کہہ دو کہ تم ڈیوڑھی کے طول طویل احاطے میں بھٹکتی ہوئی زخمی روحوں سے واقف ہوگئی ہو۔ ایسی روحوں سے جن کے ماضی کو بڑے نواب صاحب نے حرفِ غلط کی طرح محو کروا دیا ہے۔ ان روحوں کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ کوئی مستقبل۔ لوح پاک میں ان کے ناموں کے متوازی ان کی تقدیر صرف تین لفظوں میں لکھی گئی ہے۔ پیدائش، عقد، موت۔ پیدائش سے لے کر موت اتنی لمبی پوری مدت میں ان کو نہ کوئی نیکی کرنی ہے اور نہ کسی بدی سے ان کا واسطہ ہے۔ اللہ نے اشرف المخلوقات کو پیدا کیا اور بہت سے کام اس کے تفویض کیے لیکن اللہ نے انھیں صرف ایک ہی کام دیا اور وہ تھا نواب سے عقد کرلینا۔ اس کے بعد اللہ نے اور کوئی کام سونپنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ در و دیوار چیخ رہے تھے۔ تم نے بھی نواب ابن نواب سے عقد کرلیا ہے دلہن! تمھاری زندگی کا مقصد بھی پورا ہوگیا۔ تم جس لیے پیدا ہوئی تھیں وہ تم کرچکیں۔ اب اپنے مستقبل کو نواب صاحب کے قدموں میں رکھ کر بالکل بھول جاؤ۔ اب تمھیں مستقبل کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا چاہوگی تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے ماضی کی دل خوش کن یادیں بھی حویلی کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر تم تک نہیں آسکیں''۔

(۶) نواب قلندر حسین خاں نے اپنے والد کی دن رات خدمت کی۔ اس کے چلتے انھوں نے اپنی ماں سے دوری اختیار کرلی، اپنی دلہن کو تنہائیوں اور اداسیوں کی نذر کردیا اور اپنے جذبات اور اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹا مگر اس کا صلہ انھیں یہ ملا کہ ایک دن نواب صاحب نے ان پر چھوٹی بیگم کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا الزام لگادیا۔ وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر

زار وقطار روتے ہوئے کہنے لگے کہ ابا حضور نے مجھ پر شک کیا ہے۔ اس بہانے سے گلبدن بیگم کو ان کا بیٹا تو مل گیا مگر اس کے بعد ان کا بیٹا ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ جاگیردار معاشرہ کا یہ وہ ظالمانہ اور سفاک ماحول ہے جہاں خوف، سازش، مکر وریا اور جھوٹ کی حکمرانی ہوتی ہے اور انسانیت دم توڑ رہی ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں عورتوں کی حالت انتہائی قابل رحم ہوتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔ وہ جنسی کھلونا کی مانند کھیلنے والے کی مرضی پر منحصر ہوتی ہیں۔ کھیلنے والے جب چاہتے ہیں ان سے کھیل لیتے ہیں اور جی بھر جانے پر انھیں گھر کے کسی کونے میں بے کار سامان کی طرح اٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے جذبات و احساسات اور ان کی خواہشات کا کوئی احترام نہیں ہوتا ہے۔ یہ ان عورتوں کی حالت ہوتی ہے جو سماج کے کمزور اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس بگڑی نواب زادیاں ہوتی ہیں جن کے ہاتھوں ان کے سیدھے سادھے شوہروں یعنی شریف نواب زادوں کا استحصال ہوتا ہے۔ ''گرتی دیواریں'' میں افسانہ نگار اقبال متین نے اس پہلو کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانہ میں اقبال متین نے جاگیردار طبقہ کی کھوکھلی شان وشوکت اور اس کی مٹتی ہوئی عزت وآبرو کو بھی دکھایا ہے۔ 'بی اماں' لٹے پٹے نواب کی بیگم ہیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی خاصی جائدادیں بھی بک چکی ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے نے کسی بازاری عورت سے نکاح کر کے اسے اپنی بیوی بنالیا ہے۔ ایسے میں 'بی اماں' نے اپنی مٹتی ہوئی عزت وآبرو کو بچانے اور اپنی کھوکھلی نوابی شان وشوکت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے شریف اور چہیتے بیٹے نادو میاں کی شادی بڑے متمول شخص، نواب جنگ کی اکلوتی بیٹی سے کرائی ہے۔ اس شادی سے 'بی اماں' کی عزت وشان میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹے ان کے بیٹے نادو میاں کی زندگی المناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔

دراصل نادو میاں تو انتہائی شریف ہوتے ہیں مگر ان کے برعکس ان کی دلہن تنک مزاج اور بڑے ناز ونخروں والی ہوتی ہیں۔ ناز ونعم میں غلط ڈھنگ سے پرورش پانے کی وجہ سے ان کے اندر اس قدر گھمنڈ، تکبر اور رعونت جنم لے لیتی ہے کہ انھیں اپنے شوہر تو شوہر، اپنی ساس اماں کا بھی لحاظ نہیں رہتا ہے۔ وہ بات بے بات پر نادو میاں پر برس پڑتی ہیں اور دشنام طرازی پر اتر آتی ہیں۔ نادو میاں بے چارے شریف آدمی اپنی نئی نویلی دلہن کے ناز ونخروں کو تو برداشت کر جاتے ہیں مگر ان کی ماں 'بی اماں' صاحبہ کو دلہن کی یہ حرکت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ آخر وہ بھی تو نواب کی بیٹی اور نواب کی بیگم ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ 'بی اماں' دلہن کے ہاتھوں اپنے بیٹے نادو میاں کی معمولی توہین پر انھیں اس قدر جلی کٹی سناتی ہیں کہ دلہن روٹھ کر میکے چلے جاتی ہیں جہاں ان کے والد نواب جنگ اپنی بیٹی کی توہین پر اس قدر طیش میں آجاتے ہیں کہ فوری انتقام کا ارادہ کر بیٹھتے ہیں مگر ان کی بیگم بروقت ہوشمندی سے کام لے کر انھیں نرم کرتی ہیں۔ نواب جنگ فوری انتقام تو نہیں لیتے ہیں مگر وہ نادو میاں کے نام خط میں ان کے پورے خاندان کو مغلظات سے نوازتے ہیں اور ٹھان لیتے ہیں کہ جب تک 'نادو میاں کی ماں 'بی اماں' ان کے یہاں آکر معافی نہ مانگ لیں، وہ اپنی بیٹی کو جانے نہیں دیں گے۔ نادو میاں کی ماں 'بی اماں' بھی اپنی ضد پر اڑی رہتی ہیں۔ اپنی ماں اور سسر کے ضدی رویوں اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نادو میاں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ جب انھیں دونوں خاندان میں مصالحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے تو وہ اپنے چھوٹے بھائی نواب رمضان علی خاں کا سہارا لیتے ہیں اور انھیں اپنے سسر کے پاس بھیجتے ہیں۔ ان کے جانے سے کوئی بات تو نہیں بنتی مگر اس کے بعد ان کے مسلسل جانے کی وجہ سے ان کا دلہن سے جسمانی تعلق قائم ہو جاتا ہے اور دلہن حاملہ ہو جاتی ہیں۔

اس سنگین جرم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے دلہن چالاکی سے کام لیتے ہوئے نادو میاں کے نام خط لکھتی ہیں جس میں وہ اپنے کیے پر پشیماں ہوتی ہیں اور ان سے چھپ کے ملنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ نادو میاں تو پہلے ہی سے دلہن سے ملنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ پہلی رات کو جب وہ چھپ کر ملتے ہیں تو انھیں دلہن میں عجیب وغریب تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک دوبار چھپ کر دلہن سے اور ملتے ہیں کہ اسی درمیان انھیں دلہن کے حاملہ ہونے کی خبر ملتی ہے۔ اس خبر کو سن کر نادو میاں کے ہوش اڑ جاتے ہیں مگر شرافت کے مارے وہ ایک لفظ زبان پر نہیں لا پاتے ہیں۔ ان کے سامنے خاندان کی عزت کا بھی سوال ہے۔ اس لیے وہ خاموشی سے اندر ہی اندر غم میں گھلتے رہتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے بے خبر جب 'بی اماں' دلہن سے نادو میاں کے چھپ کر ملنے اور دلہن کے حاملہ ہونے کی خبر سنتی ہیں تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی ہیں۔ وہ دلہن کو اپنے گھر لا کر ان کی ہر خواہش کا احترام

کرتی ہیں اور ان کے ناز و نخرے بخوشی اٹھاتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد جب دلہن کو ننھا پیدا ہوتا ہے تو اس موقع پر 'بی اماں' کے گھر جشن کا ماحول ہوتا ہے مگر اس جشن کے ماحول میں نادو میاں کی جو اندرونی حالت ہوتی ہے اس کی تصویر کشی افسانہ نگار کے مخصوص انداز بیان میں ملاحظہ ہو:

''ننھا پیدا ہوا تو شادیانے بجائے گئے، کپڑے تقسیم کیے گئے۔ مبارک بادیوں کے جواب میں شکریہ ادا کرتے کرتے نادو میاں کی زبان سوکھ گئی۔ وہ باوجود یہ سوچتے رہنے کے کہ بچّہ ابھی تین ماہ بعد تولد ہونا چاہئے تھا، مبارک باد پر اس طرح شکریہ ادا کرتے جیسے رٹا ہوا طوطا ہر منٹ دو منٹ بعد شکریے کی رٹ لگائے۔ نادو میاں ننھا مبارک ہو، شکریہ۔۔ نادو میاں ننھے کا نام کیا سوچا ہے؟ شکریہ۔ نادو میاں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ شکریہ۔ نادو میاں آپ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ شکریہ۔ غرض کہ نادو میاں کچھ اسی طرح شکریہ شکریہ کہتے رہے۔ اگر انھیں مبارک باد کی بجائے گالی دی جاتی تو بھی وہ نہایت اطمینان سے مری ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرتے''۔

(۷) ننھے کی پیدائش کے بعد چلہ کی رسم ادا ہوتی ہے۔ اس چھوٹے موٹے جشن کے موقع پر ننھے کا نام تجویز کیا جاتا ہے اور دلہن کو سجا سنوار کر پھر دلہن بنایا جاتا ہے۔ اسی رات کو ایک ایسا حادثہ ہوتا ہے جس میں نادو میاں کی دردناک موت ہوتی ہے اور وہ اپنی عزت و آبرو لیے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے اس حادثہ اور نادو میاں کی المناک موت کو افسانہ نگار نے ہمدردی کے ساتھ کس فنی چابکدستی سے بیان کیا ہے:

''اسی رات نادو میاں کچی نیند سے چیختے ہوئے اٹھے اور بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ پکڑو بھاگنے نہ پائے۔ میں جب تک زندہ ہوں دلہن کو کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ ان کی طرف آنکھ تک اٹھا نہیں سکتا۔ مگر اس کو پکڑو بھئی، پکڑ لو۔ وہ چھپ رہا ہے۔ مردانے دروازے کے قریب دھرے ہوئے تخت کو جس پر نوبت بجائی گئی تھی، وہ اندھیرے میں دیکھ نہ سکے اور ٹکرا کر اس پر گر پڑے، ایک مہیب چیخ ماری تخت کا کونہ ان کے پیٹ میں دھنس گیا۔ اسی رات کو نادو میاں نے کفن اوڑھ لیا اور نہایت خاموشی سے چپ چاپ اپنی عزت و آبرو کو اپنے ساتھ لیے زمین کے اندر جا چھپے''۔

(۸) اس افسانہ میں افسانہ نگار اقبال متین نے گھمنڈ و تکبر میں چور اور بگڑی ہوئی نواب زادی کی بدچلنی کی وجہ سے شریف نواب کی قابل رحم موت کو دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانہ میں انھوں نے نوابوں کی جھوٹی شان و شوکت اور ان کی مٹتی ہوئی عزت و آبرو کو بھی بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ لاڈ، پیار میں بگڑی ہوئی نواب زادی کی جھلک ان کے افسانے ''اندھیروں کی لاج'' میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے مگر اس افسانہ میں نواب زادی سے زیادہ ان کے شوہر یعنی نواب زادے کا چلن بگڑا ہوا ہے۔ نواب زادے نواب برکت جنگ کے بیٹے ہیں۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح وہ بھی رنگیلے قسم کے عاشق مزاج انسان ہیں۔ ویسے شہر کی تمام مشہور طوائفوں سے ان کے تعلقات ہیں مگر سب سے مشہور طوائف بخت افروز جہاں پر وہ اس قدر فریفتہ ہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ اس کے چہیتے عاشق شاعر تک کو چوری چھپے قتل کروا دیتے ہیں۔ ان کے والد نواب برکت جنگ بڑے ارمانوں سے ان کی شادی اپنے مرحوم بھائی نواب صلابت علی خاں کی اکلوتی، چہیتی بیٹی شہزادی بیگم سے کرا دیتے ہیں اور جنم جنم کے لیے شیر و شکر ہو کر رہنے کی قسمیں دیتے ہیں۔ نواب زادے اپنی شادی کے بعد بھی چوری چھپے بخت افروز جہاں سے ملتے رہتے ہیں۔ اپنے والد نواب برکت جنگ کی زندگی میں تو وہ اپنی بیگم کے ناز و نخرے اٹھاتے ہیں مگر والد کے انتقال کے بعد وہ اپنی بیگم کے نخروں اور ان کی تنک مزاجی سے تنگ آ کر مکمل طور پر بخت افروز جہاں کے ہو رہتے ہیں۔ آگے چل کر وہ اس سے شادی کر کے کرایے کے مکان میں رہنے لگتے ہیں۔ وہ اس پر پانی کی طرح دولت بہاتے بہاتے بُری طرح مقروض ہو جاتے ہیں۔ جب وہ قرض خواہوں کا قرض نہیں چکا پاتے ہیں تو قرض خواہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور حکومت ان کی جائیداد ضبط کر کے ان کے قرض خواہوں کو قرض چکاتی ہے۔ اب ان کے گھر برانڈ امرتسری باسمتی چاول آنا بند ہو جاتا ہے اور ان کی ڈیوڑھی کی لائٹ تک کاٹ دی جاتی ہے۔ وہ بخت افروز جہاں کے پیچھے بُری طرح کنگال ہو جاتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کا ایک معمولی قرض خواہ فرنگی نژاد درزی کا بیٹا جان کلفٹن ان کی توہین پر اتر آتا ہے۔ وہ پہلے عدالت کے ذریعے ان کے نجی موٹر کو اپنے قبضہ میں لیتا ہے۔ پھر انھیں عدالت کا چکر کاٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ اب نواب زادے کو مقدمے کی سماعت کے لیے عدالت تک جانے کا مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے۔ ان کے پاس اپنا نجی موٹر ہے نہیں اور ٹیکسی میں بیٹھ کر جانا نوابی شان کے خلاف ہے۔

ساری جائداد اور عزت و آبرو کے لٹ جانے کے باوجود نواب زادے کو اپنی جھوٹی نوابی شان و شوکت کی اس قدر فکر ہے کہ وہ ایک پرانی ٹیکسی میں پرائیویٹ نمبر ڈال کر اور ٹیکسی ڈرائیور کو پرانے شوفر کا ڈریس پہنا کر اس طرح عدالت جاتے ہیں کہ یہ ان کا اپنا موٹر معلوم ہو۔ ان کی اس مصنوعی حالت کو دیکھ کر اس عہد کے لٹے پٹے نوابوں کی کھوکھلی شان و شوکت اور دم توڑتے ہوئے جاگیردار طبقہ کا پورا منظر نگاہوں میں منعکس ہو جاتا ہے۔

بگڑے نواب زادوں کی تصویر اقبال متین نے اپنے افسانہ ''پانی کے چراغ'' میں بھی دکھائی ہے۔

اس افسانہ میں انھوں نے حیدرآباد کے بگڑے نوابوں کے جھوٹے اور بناوٹی عشق اور ان کے ذریعے طوائفوں کے جنسی استحصال کو بیان کیا ہے۔ بائی جی اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ جے پور سے حیدرآباد اس لیے آتی ہیں کہ مجرے کے فن کا مظاہرہ کر کے پیسے کما سکیں مگر یہاں کے نواب ان کی حسین و جمیل بیٹیوں پر بری طرح فریفتہ ہوتے ہیں، خصوصاً ان کی بڑی بیٹی انور جہاں کے لیے تو نوابوں کے درمیان تلوار تک کھنچ جاتی ہے۔ دیکھیے اس بات کو افسانہ نگار نے طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ کس دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:

''نواب بھکومیاں کی نواب مکی میاں سے بڑی بہن کے لیے ایسی ان بن ہوئی کہ بھری انجمن میں تلواریں کھنچ گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ تلواریں چلی نہیں اس لیے کہ دونوں ہی صرف تلواریں کھینچنا جانتے تھے۔ چلانے کے لیے پہرے داروں کی کمی نہ تھی جو یہ معمولی کام بھی وہی کر لیے۔ چلو اچھا ہی ہوا نا۔ ورنہ کیا خون خرابے ہوتے۔ بچپن چپکے سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوا تو نینوں نے بان اور ابروؤں کی کٹار نے اس بری طرح گھائل کیا کہ سب کی تلواریں اپنی اپنی نیام میں ہی دھری دھری زنگ خوردہ ہو گئیں''۔

(۹) اس اقتباس میں افسانہ نگار نے نوابوں کی نااہلی پر کتنا گہرا طنز کیا ہے کہ انھیں تلوار بھی چلانے کا سلیقہ نہیں آتا اور اس کام کے لیے وہ پہرے داروں کے محتاج ہیں۔ ہاں عشق و عاشقی میں ان نوابوں کا جواب نہیں۔ ایک جگہ ان کی عاشقی کی کیفیت کو افسانہ نگار نے اپنے مخصوص و دلکش انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''یہاں کے نواب زادوں کے لچھن بائی جی کو دنیا بھر سے کچھ مختلف ہی نظر آئے۔ جن کے پاس دولت ہوتی وہ بے دریغ لٹاتے بھی، لیکن ایسے تھے کتنے یہی جنھیں انگلیوں پر گن لیا جا سکے۔ دوسرے تھے تو عشق جیسے انھیں ورثے میں ملا تھا۔ کیوپڈ کا دیوتا جیسے ان کے خانۂ دل کا پاسبان تھا۔ ایسا شدید عشق کرتے کہ مجنوں بے چارہ اس وقت زندہ ہوتا تو شاید اس کا سارا کیا کرایا مٹی میں مل جاتا۔ اتنے دن کی شہرت، عزت و ناموس دیکھتے دیکھتے جہنم واصل ہو جاتی''۔

(۱۰) ان نوابوں میں ایک نواب طرحدار علی خاں تھے جو بائی جی کی بڑی بیٹی انور جہاں پر بری طرح عاشق ہوئے۔ انھوں نے بڑی کوشش کے بعد انور جہاں سے تعلق بنا ہی لیا اور ان یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ اس کے یہاں جا کر وہ عجیب مجنونانہ حرکت کرتے۔ اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

''طرحدار علی خاں ایک نہیں ہزار بار انور جہاں کے گھر گئے۔ پاؤں سے نہیں سر سے چل کر اور پھر ایک بار ایسے گئے کہ بس ادھر ہی کے ہو رہے۔ وہ چلتی پھرتیں تو آپ آنکھیں بچھاتے، وہ بیٹھی گلوریاں بناتی رہتیں تو آپ سو سو طرح نثار ہوتے رہتے، وہ سو جاتیں تو بس بیٹھے چپ چاپ تکا کرتے، پھر یکایک پیروں پر آنکھیں ملنے لگتے۔ وہ پیر سمیٹ لیتیں تو خوش ہو کر آغوش میں لے لیتے''۔

(۱۱) نواب طرحدار علی خاں نے انور جہاں پر عشق کا ایسا جادو چلایا کہ وہ مکمل طور پر ان کے قبضہ میں آ گئیں۔ ان کی ماں نے لاکھ سمجھایا کہ بٹیا ہماری دنیا میں محبت پروان نہیں چڑھتی مگر انھوں نے نہیں مانا۔ اپنی ماں کی سخت مخالفت کے باوجود وہ نکاح کر کے نواب طرحدار علی خاں کی ہو رہیں۔ اب انور جہاں نے ہمیشہ کے لیے اپنے پیشے سے توبہ کر کے مصلیٰ سنبھال لیا اور نماز کی پابند ہو گئیں مگر کچھ ہی مہینوں بعد نواب طرحدار علی خاں ان سے اپنی جنسی خواہش پوری کر کے انھیں حمل کی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب روتی بلکتی انور جہاں کو پھر سے مجبوراً مصلیٰ کو اٹھا کر رکھ دینا اور پازیب پہن کر اپنے سابقہ پیشے کی طرف لوٹنا پڑا۔ یہ تھی انور جہاں اور ان جیسی طوائفوں کی دردناک حالت۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے نوابوں کے ذریعے عشق و محبت کے ڈھونگ رچائے جانے اور طوائفوں کے جنسی استحصال کیے جانے کو دلچسپ اور پُرکشش انداز میں بیان کیا ہے۔

اقبال متین نے زوال پذیر جاگیردار طبقہ کو موضوع بنا کر ایک اور افسانہ ''آدمی اور آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے باپ اور بیٹے دو آدمیوں کی زندگی دکھائی ہے۔ باپ بہت چالاک، لالچی، خودغرض، مفاد پرست، بے ضمیر اور ریاکار قسم کے انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد متمول ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ہوشیاری سے انتہائی مالدار گھرانے میں شادی کرتے ہیں۔ اپنے خسر کے توسط سے وہ کسی اچھے سرکاری محکمہ میں ملازمت پانے میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ ملازمت کرتے ہوئے وہ بڑی سے بڑی مقدار میں رشوت لے کر اور دیگر ہتکنڈے اپنا کر بہت جلد مالدار ہو جاتے ہیں اور شہر کے متمول طبقہ میں ان کا شمار ہونے لگتا ہے۔ شہر کے رئیسوں کی طرح جوانی میں وہ بھی فرنگی لڑکیوں سے عشق کرتے اور ان پر اپنی دولت لٹاتے ہیں۔ اپنی جوانی میں وہ کتنی طوائفوں کا بھی منہ چاٹ آتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ دین کا چولا پہن کر دین داری کا بکھان کرتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس ان کے بیٹے اسلم خاں خوددار اور باضمیر قسم کے انسان ہیں۔ اپنے باپ کے راستوں پر چلنا ان کے بس میں نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں بُری طرح ناکام رہتے ہیں۔ ان کے والد چاہتے ہیں کہ جن راستوں پر چل کر انھوں نے جائداد حاصل کی ہے، ان ہی راستوں پر ان کا بیٹا اسلم خاں بھی چلے۔ اسی لیے وہ رشوت دے کر اسلم خاں کو محکمۂ پولیس میں ملازمت دلوا دیتے ہیں مگر اس ملازمت کے دوران جب انھیں معصوم، بے گناہ اور نہتے عوام کا خون بہانے کو کہا جاتا ہے تو وہ استعفیٰ دے کر چلے آتے ہیں۔ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ دیکھئے ان باتوں کو افسانہ نگار نے فنی ہنرمندی سے کس دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

''میرا قصور یہی ہے کہ میں نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی ہے۔ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف کافی رشوت دے کر مجھے محکمۂ پولیس میں ایک اچھی سی خدمت دلوا دی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے میرے لیے بھی زندگی کے وہی راستے چُنے تھے جن پر چل کر میں بہت متمول ہو سکتا تھا، جن پر چل کر میں بھی سوسائٹی میں ایک اونچا مقام حاصل کر سکتا تھا۔ میرے لیے بھی یہ سارے امکانات تھے اور ان دنوں میرا باپ مجھ سے بہت خوش تھا۔ بچپن ہی سے میں نے اپنے ہاتھ میں بندوق اٹھالی تھی۔ بندوق میرا بچپن تھی، بندوق میری جوانی تھی، بندوق میرا فن۔ پھر ایک تاریک رات کو میرے آقاؤں نے مجھ سے سرگوشی کی۔ حکم دیا کہ میں اپنے اس فن سے ساری انسانیت کے سینے کو چھلنی کی طرح چھید دوں۔ بھوکے ننگے، ذلیل اور کمینے انسانوں کی ایک چھوٹی سی دنیا نے میرے خداؤں کی نیند اڑا دی تھی۔ میرے خداؤں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کی آنکھوں سے چرائی ہوئی نیندیں واپس لادوں کیوں کہ ذلیل انسانوں نے صرف اس لیے ان کی نیندیں چُرالیں کہ میرے خداؤں نے ان کمینوں کے ہونٹوں کی شادابی پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ ان کی ہنسیوں کو انھیں کے کپکپاتے ہونٹوں میں دفن کر دیا تھا۔ ان کے خالی پیٹوں کے اندر دانۂ گندم کے عوض آتش و باروت بھر دینے کی قسم کھا رکھی تھی، لیکن آج یہ سارے ذلیل و خوار انسان اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے ایک آواز ہو کر آج اپنے ہونٹوں کی شادابی مانگی تھی، اپنی مسکراہٹوں کی زندگی مانگی تھی، اپنے خالی پیٹوں کے لیے دانہ گندم مانگا تھا اور غضب تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں لجاجت سے نہیں مانگیں ہاتھ پھیلا کر نہیں مانگیں بلکہ برہم ہو کر مانگی تھیں، دھمکا کر اور للکار کر مانگی تھیں۔ بادل کی طرح گرج کر مانگی تھیں اور اس گرج نے میرے خداؤں کی نیند اڑا دی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اگر آج میں انھیں کمینوں کی صف میں ہوتا تو اپنے خداؤں کی ویران آنکھوں کے لیے ابدی نیند فراہم کر دیتا جو اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی اور قلم اٹھا کر نوکری کے لیے استعفا لکھ کر چلا آیا''۔

(۱۲) اسلم خاں شبہ کی بنیاد پر جیل بھی جاتے ہیں جہاں سے ان کے والد انھیں رہا کرواتے ہیں۔ ایک تو اسلم خاں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اچھے مگر غریب گھرانے میں شادی کرتے ہیں جب کہ ان والد اپنی طرح متمول گھرانے میں ان کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔ پھر وہ نوکری سے بھی استعفا دے دیتے ہیں۔ اپنے باپ کے بتائے راستوں پر نہ چل پانے کی وجہ سے وہ ان کی توجہ اور ہمدردی سے پورے طور پر محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے والد انھیں کمینہ سمجھنے لگتے ہیں اور ان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلم خاں کی زندگی بڑی عسرت و مفلسی میں گذرتی ہے۔ تھوڑے دنوں کے لیے اسلم خاں ایک ہوٹل کا منیجر

بنتے ہیں اوران کی زندگی خوشحال گذرتی ہے مگر پھر ہوٹل بند ہوجانے کی وجہ سے وہ بے روزگار ہوجاتے ہیں۔ ان کے افلاس وتنگدستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیمار بچی تک کا علاج نہیں کراپاتے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے والد کوایسی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جیسے رحم کی بھیک مانگ رہے ہوں مگر اس حالت میں بھی ان کے والد کا دل نہیں پسیجتا۔ وہ اپنے بیٹے کی مدد کرنے کے بجائے انھیں جھوٹی نصیحت اورصبر ورضا کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ اسلم خاں اپنے سنگ دل والد کے گھر میں پاؤں نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں مگر بچی کے انتقال پر مجبوری میں انھیں قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں جب بھاگتے ہوئے اپنے والد کے وظیفہ پڑھنے کے کمرے میں پہنچتے اور وہاں پر موجود الماری سے ٹکراتے ہیں تو ان کے والد کی جھوٹی دینداری، ریاکاری اوران کی مکّاری شراب کی بوتلوں کی شکل میں عیاں ہوتی ہے۔ اب اسلم خاں اپنی مجبورومقہور زندگی سے تنگ آکر اپنے غم کوبھلانے کے لیے پھر بوتلوں کا سہارا لیتے ہیں اور بُری طرح اپنے آپ کوشراب میں غرق کرلیتے ہیں۔ اس طرح ایک اچھے بھلے انسان کی زندگی غموں، دکھوں، حسرتوں اور مایوسیوں کی دردناک داستان بن جاتی ہے۔ اس افسانہ میں اقبال متین نے باپ بیٹے، دو کرداروں کے ذریعے زوال پذیر جاگیردار معاشرے کی خودغرضی، مفاد پرستی، سنگ دلی، حرص وہوس، ریاکاری اور بے ضمیری اوراس کے ہاتھوں باضمیر افراد کے المناک حالات کو ہمدردی کے ساتھ بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

ان تمام افسانوں میں اقبال متین نے زوال پذیر جاگیردار معاشرہ، جاگیردار طبقہ کے ظلم واستحصال، ان کی کھوکھلی شان وشوکت اورٹوٹتی بکھرتی قدروں اور لٹے پٹے نوابوں کی بدحال اورتباہ ہوتی زندگی اوراس معاشرہ کی دم توڑتی تہذیب وثقافت کی اپنے مخصوص فنکارانہ اسلوب میں ایسی بھرپور تصویرکشی کی ہے کہ پورا عہد نگاہوں کے سامنے زندہ ہوجاتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر قاری زوال پذیر جاگیردار طبقہ سے صرف واقف ہی نہیں ہوتا بلکہ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس معاشرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ان افسانوں میں اقبال متین نے زوال پذیر جاگیردار معاشرہ کو اس فنکاری سے پیش کیا ہے کہ ان افسانوں میں اس معاشرہ کی پوری تصویر و تاریخ آگئی ہے۔ یہ اقبال متین کے ایسے افسانے ہیں جو انھیں ایک منفرد و ممتاز افسانہ نگار کی شکل میں سامنے لاتے ہیں۔ یہ افسانے اردو کے افسانوی ادب میں خوبصورت اوربیش بہا اضافہ ہیں۔

حوالے

(۱) پروفیسر یوسف سرمست، اقبال متین۔ صاحبِ طرز ادیب، مشمولہ، بادبان، کراچی، اقبال متین نمبر، مدیر، ناصر بغدادی، شمارہ نمبر: ۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص: ۳۶۔

(۲) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۵۔

(۳) پروفیسر عالم خوندمیری، صدارتی تقریر۔ اقبال متین کا خیرمقدمی جلسہ، ۲۵/دسمبر ۱۹۷۷ء، لائبریری ہال، انوارالعلوم کالج، حیدرآباد، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلداول)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص: ۳۱۱۔

(۴) اقبال متین، افسانہ، کتاب سے کتبے تک، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلداول)، ص: ۱۹۴۔

(۵) ایضاً، ص: ۱۹۵۔

(۶) ایضاً، ص: ۲۰۷۔

(۷) اقبال متین، افسانہ، ملبہ، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلداول)، ص: ۹۶۔ (۸) ایضاً، ص: ۹۸۔

(۹) اقبال متین، افسانہ، گرتی دیواریں، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلداول)، ص: ۱۱۹، ۱۲۰۔

(۱۰) ایضاً، ص: ۱۲۰۔

(۱۱) اقبال متین، افسانہ، پانی کے چراغ، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ص: ۱۳۵۔

(۱۲) ایضاً، ص: ۱۴۰۔

(۱۳) ایضاً، ص: ۱۳۷، ۱۳۸۔

(۱۴) اقبال متین، افسانہ، آدمی اورآدمی، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ص: ۸۴، ۸۵۔

احمد علی جوہر ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

***

اسحاق ساجد

جرمنی میں برِصغیر کا ایک جمالی گیت کار

(ڈاکٹر منور احمد کنڈے، ٹیلفورڈ، انگلینڈ)

برِصغیر ہندو پاک میں گیت کی تاریخ عہد قدیم سے تعلق رکھتی ہے۔ گیت کی جڑیں قدیم پراکرت زبان وادب اور موجودہ ہندی زبان وادب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں تک اُردو زبان وادب کا تعلق ہے اس نے گیت کو ہندی سے مستعار لیا ہے۔ دکنی تہذیب کے ابتدائی دور میں ہندی اور فارسی کے ملے جلے الفاظ کو بروئے کار لا کر غنائی نظموں کی تخلیق رائج الوقت رہی ہے۔ یہ نظمیں اگرچہ گیت کہلانے کی مستحق نہیں ہیں پھر بھی ان میں گیت کار س زیروبم رنگ و آہنگ موسیقیت اور غنائیت کے مرکب اجزاء کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شمالی ہند میں بھی گیت نما نظموں کا چلن رہا ہے لیکن ان کو گیت سے تعبیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ دراصل نظم اور گیت میں ٹیک کا بند ہی حد فاصل قائم کرتا ہے اور گیت کی پہچان بنتا ہے۔ برِصغیر ہندو پاک میں خالص گیت کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ڈاکٹر فرازؔ حامدی بیکلؔ اتساہی نذیرؔ فتح پوری مناظر عاشق ہرگانوی، انور شیخ، سوہن راہی ساحر شیوی اور گلشن کھنہ کی طرح اسحاق ساجدؔ نے بھی بہت اچھے گیت تخلیق کئے ہیں۔

گیت کا فارم یا اُس کی ہیئت کسی مخصوص بحرووزن کی پابند نہ ہو کر آزادی سے ہمکنار ہے۔ اسے کسی بھی وزن بحر ہندی چھند یا فارسی کی بحر میں تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیالِ خام میں گیت کار کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ جتنی سطروں کے بعد چاہے ٹیک کا بند استعمال کرسکتا ہے۔ گیت اگرچہ ایک داخلی جذبہ ہے لیکن خارجی سطح پر اس میں الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے گیت کو بحر ہی نہیں لفظ بھی غنائیت اور موسیقیت سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اس لیے اس میں روزمرہ استعمال میں آنے والے عام فہم سادہ اور مترنم الفاظ کا استعمال گیت میں لطف وتاثر کا موجب بنتا ہے۔ انگنت موضوع گیت کے دامن میں جگہ پاسکتے ہیں لیکن گیت کا حسن دوبالا کرنے کے لیے جنس مخالف کی باہمی محبت عشق و عاشقی قلبی واردات جذبات واحساسات اور وصل وہجر قرار وانتظار غم وخوشی یاس وہراس کامیابی وناکامی جیسے معاملات کو موضوع اظہار بنایا جاتا ہے۔ اسحاق ساجدؔ نے بھی اپنے گیتوں میں ایسے ہی متعدد معاملات کو موضوع اظہار بنایا ہے۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ ''گیت میرے میت'' اس کی واضح مثال ہیں۔ ساجدؔ صاحب نے اپنے حالیہ شعری مجموعے ''جمال دوست'' میں بھی دس گیت شامل کئے ہیں اور انہیں کی روشنی میں یہ مضمون میں نے ترتیب دیا ہے۔ چونکہ لوک گیت کے بعد ہی گیت معرض وجود میں آیا اور لوک گیت کے خالق گاؤں کے کوی ہوتے تھے اس لیے ہمارے گیت بھی گاؤں کی بولی میں گاؤں کی زندگی کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ اسحاق ساجدؔ کا یہ گیت جو مل جل کر دریا پار کرنے کی تلقین کرتا ہے اس سکھی کے جذبات کا آئینہ دار ہے جو اپنی سکھیوں کو دریا پار کرتے وقت نئی زندگی کے شاندار مستقبل کی بشارت دیتی ہے۔

دور ہے منزل رستہ ہے دشوار سکھی۔ آؤ کریں مل جل کے دریا پار سکھی

پیار کی راہیں دشوار ہوتی ہیں جن پر ہو کر طوفانی آندھیاں بھی گذرتی ہیں، پاؤں بھی لہولہان ہوجاتے ہیں۔ آبی سفر میں بھی طوفانی موجیں اور گرداب حوصلہ شکن ہوتے ہیں۔ موت کی آہٹیں ہر طرف سنائی دیتی ہیں۔ پھر بھی ایک نئی اُمید کے آسرے پر پیار کے راہی آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں مکمل گیت نقل کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے پھر بھی گیت کا آخری انترا پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ملاحظہ ہو

ٹوٹی کشتی تیز ہوا چڑھتا پانی
اس پر بھی کرتا ہے یہ دل من مانی
چھوتی ہیں امبر کو پھر اٹھتی لہریں
چین سے راہی دو پل اب کیسے ٹھہریں
دکھتے ہیں پھر طوفاں کے آثار سکھی
آؤ کریں مل جل کر دریا پار سکھی

آخری لائن ٹیک کا بند ہے۔ گیت کو دو مطلعوں کے بعد ٹیک کے بند کی ہم قافیہ ایک سطر کو جوڑ کر فارم یا ہیئت عطا کی گئی ہے۔ گیت میں تین فارسی کے الفاظ راستہ منزل اور دشوار کے علاوہ بقیہ سبھی ہندی کے عام فہم اور مترنم الفاظ سے گیت کی لڑی پروئی گئی ہے۔ جس سے گاؤں کی زندگی ماحول اور منظر سبھی نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ عام گیت سے قطع نظر

موضوعاتی گیت تخلیق کرنا ایک مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام قسمت کو موضوع بنا کر انہوں نے بڑی چابکدستی وفنی مہارت اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔گیت کی چند سطور (مصرعے) قسمت کی کارکردگی کا کیا خوبصورت مظاہرہ ہیں ملاحظہ ہو۔

اُونچی مسند پر یہ بٹھائے، کبھی یہ دردر بھیک منگائے
عجب چمن میں گل یہ کھلائے، کبھی ہے محرم کبھی ہے ہولی
قسمت کھیلے آنکھ مچولی

گاؤں کے منچلے رنگ رنگیلے پریمی اور الہڑ شوخ وشنگ چنچل مستانی اور البیلی جوانیوں کا گاؤں کی کھلی فضا اور سرسبز وشاداب مناظر کے سائے تلے ایک دوسرے کے پریم جال میں پھنس کر محبت بھرے نغمے گنگنانا، ناچنا اور گانا ایک روایت بن چکا ہے۔جن پریمیوں کے دلوں کو محبت راس آ جاتی ہے وہ سدا کے لیے عیش ونشاط کی سیج پر زندگی کا لطف لیتے ہیں اور جنہیں یہ محبت ٹھکرا دیتی ہے وہ بچھڑ کر برہا کے گیت گانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ برہا کی ماری ایک کنّیا اپنے بچھڑے پریتم کی یاد میں کس طرح تڑپتی ہے کس طرح آنسو بہا کر اپنے پردیسی کو یاد کرتی ہے اس گیت میں اس برہن کی تصویر اسحاق ساجد نے کیا خوب اُتاری ہے ملاحظہ ہو۔

پاگل منوا تم سے پوچھے کب آؤ گے تم پردیسی
مجھ برہن پر کیا کیا بیتے کب آؤ گے تم پردیسی
برسوں کے ہیں ہم تم بچھڑے کب آؤ گے تم پردیسی
مجھ برہن پر کیا کیا بیتے کب آؤ گے تم پردیسی

مجازی عشق سے ہٹ کر اگر ہم اِس گیت کو عشقِ حقیقی سے جوڑ لیں تو یہی گیت فلکی بلندیوں کو چھو لیتا بشرطیکہ کسی ولیِ روحانی کے قلم سے جنم لیا ہوتا۔ اِسحاق ساجدؔ اس زمرے میں شمار ہوتے ہیں یا نہیں، کم از کم 'میں' اس حقیقت سے بے خبر ہوں۔۔!!! بہر حال گیت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ گیت وہی تخلیق کر سکتا ہے جس کا فطری طور پر اس صنفِ کی جانب سچا میلان ہو۔ اسحاق ساجد کے گیتوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسحاق ساجدؔ جتنے اچھے غزل گو ہیں اس سے بھی اچھے گیت کار ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ گیت میں مشقِ سخن جاری رکھیں گے اور اُن کی کاوشیں انشاء اللہ ضرور ثمر آور ثابت ہوں گی۔

آفتابیات۔ آفتاب شاہ

تہذیبوں کے ارتقاء میں افراد اور اقوام کی حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔تبدیلی کے عمل میں سوچ کے زاویئے بدلتے رہتے ہیں جہل سے علم اور علم سے عمل کا راستہ خاصا طویل ہوتا ہے جس میں ہر گروہ اور جماعت ایک مخصوص وقت میں اپنی فکری اور عقلی کاوشوں کو وقت کے حوالے کرتی جاتی ہیں۔یہ حالت ذہنی پسماندگی سے ذہانت کے اعلیٰ درجات کا مرقع ہوتی ہے۔پستی سے عروج کا سفر ہمیشہ انسانوں کو آگے بڑھنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن وہ اقوام جو ایک مخصوص دائرے میں گھومتی رہتی ہیں اور گروہی ولسانی سوچ ان پر غالب آ جاتی ہے تو وقت کا بے رحمانہ رویہ ان کو دنیا میں تماشہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔

۞- خیالات کا بہاؤ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ایک ایسی نعمت جو فضول اور گھٹیا سوچ کے گند کو اپنی طاقتور لہروں سے بہا کر لے جاتی ہے۔انسان کی جذباتی یا نفسیاتی کیفیات ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتیں اس لیے قدرت کا یہ تحفہ انمول ہے جو سوچ کے تسلسل کو نئے واقعات سے جوڑ دیتا ہے۔لیکن دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ماضی کے قبرستان میں اپنی یادوں کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر آنسو بہاتے رہتے ہیں جو بیکار سوچ کے آسمان میں پسند کا چاند تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں لیکن انہیں یہ نہیں پتہ کہ حال میں رہنے والا ہی حال کو درست آنکھ سے دیکھ سکتا ہے ورنہ ماضی کا بھوت زندگی کی خوشیاں نگل جانے کے لیے ہمیشہ بیتاب رہتا ہے۔

۞- کسی قوم کی ترقی اور تربیت کا دوسرا زینہ وہ علم اور تعلیم کا نظام ہوتا ہے جو مستقبل کو محفوظ بناتے ہوئے ترتیب دیا جاتا ہے۔اس نظام میں جدت اور قدامت کی خوبیوں کو اس طرح سمویا جاتا ہے کہ ہر عہد اور دور اس سے مستفید ہو سکے۔ان ممالک میں تعلیم سے مراد اوراق نہیں ہوتے اور علم سے مراد رٹے ہوئے چند جملے نہیں ہوتے۔ بلکہ تحقیق اور تخلیق کا عمل ہی علم کو روشنی عطا کرتا ہے۔لیکن وہ ممالک جو یہ ہی فیصلہ نہ کر سکیں کہ نظام تعلیم کی بنیاد کن خطوط پر استوار کرنی ہیں وہ صرف زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہتے بلکہ عقلی اور فکری بونا پن بھی ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

۞- کسی معاشرے میں جب انحطاط کا سانپ گھس جائے تو وہ سب سے پہلے تعلیم پر حملہ آور ہوتا ہے۔اس کی رگوں میں تضادات کا زہر بھرتا ہے اور مفاد پرستی کی جڑوں میں جہالت کا پھن پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔علم کا درخت جہل کے پھلوں سے لدا نظر آتا ہے۔پہلی نظر میں علم اور جہل میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔یہاں تک وہ افراد جو علم کی شاخ کے جگنو ہوتے ہیں اس درخت سے رفتہ رفتہ کوچ کرتے جاتے ہیں اور تنگ نظری کے اُلو اس درخت کے استھان کو اپنا آخری ٹھکانہ سمجھ کر بیوقت کا وہ راگ الاپتے ہیں جو شعور کی شمع کے لیے تیز آندھی کا کام کرتا ہے اور معاشرہ تنگ نظری کی بھیانک کھائی میں ہمیشہ کے لیے گر کر کسی مسیحا کا انتظار کرتے ہوئے بھسم ہوجاتا ہے۔

۞- انسانی بھوک کسی نا کسی شکل میں برقرار رہتی ہے۔اس بھوک کا تعلق طلب کے اس نظام سے جڑا ہے جو ضرورت کے رشتے کو بعض اوقات ہوس کے در پر بھی سجدہ ریز کروا دیتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو تعلیم کی تکمیل کے بعد پیسے کی ہوس ختم ہوجانی چاہئے لیکن حیرت انگیز طور پر یہ بھوک مزید بڑھ جاتی ہے۔امارت کے بعد حسد کی بھوک مٹ جانی چاہیے لیکن یہ بھوک بھی برقرار رہ کر دوسروں کی نیندیں ہرام کرنے کا سبب بنتی رہتی ہے۔عبادت کے طویل سجدوں کے بعد بیسکونی کی حالت کو ختم ہوجانا چاہئے لیکن عبادت کا در ہمیشہ بے چینی کی صدا سے کھٹکھتا رہتا ہے۔شعور کے بعد بھی آخر جہالت کی رمق باقی کس طرح رہ جاتی ہے؟ ڈگریوں کے باوجود زہر آلود زبان کا اثر باقی کس طرح رہ جاتا ہے۔شاید ہر بھوک اپنی طلب کے نظام پر قائم رہتی ہے۔

۞- دکھ اور سکھ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں جس طرح زندگی سچ اور جھوٹ سے جڑی ہے اسی طرح غم اور خوشی بھی زیست کا حصہ ہیں۔عام طور پر غم اور دکھ کا واویلا اس طرح کیا جاتا ہے جس طرح آفات خداوندی یا عذابِ الٰہی کی پکڑ میں اچانک آ گئے ہوں حقیقتاً ایسا نہیں ہے انسان کو اپنے اعمال اور حرکات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ایک غم وہ ہے جو انسان خود اپنے لیے تیار کرتا ہے یہ غم محبت اور غلط توقعات سے پیدا ہوتا ہے اور دوسرا غم وہ ہے جو ربِ کائنات کی جانب سے جھنجھوڑنے کے لیے ہوتا ہے۔سمجھدار اور توکل سے جڑے لوگ قبولیت کا اظہار سر کو جھکا کر کرتے ہیں اور کم ظرف گلے شکوہ میں زندگی گزار دیتے ہیں حالانکہ دکھ اور سکھ کا دورانیہ ایک جیسا ہوتا ہے۔

۞- حسن کو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو جانچا نہیں جا سکتا۔دنیا میں ابھی وہ پیمانہ یا آنکھ ہی نہیں بنی جو حسن کی تعریف کو کسی ایک اکائی میں سمیٹ دے۔ہر شخص کی آنکھ کا عدسہ الگ ہوتا ہے اسی لیے حسن کے انداز بھی اس کے ہاں الگ ہوتے ہیں وہ لوگ جو حسن مجسم کو حسنِ متصور سے ملا کر زندگی بسر کرتے ہیں وہ ماں کے جھریوں والے چہرے سے بھی عقیدت و پیار رکھتے ہیں۔لیکن وہ لوگ جو حسنِ مجسم کے قائل ہوں تو ڈھلتے جسم اور رعنائی سے نئے جہانوں کا رُخ کر لیتے ہیں۔وہ رنگ جو آنکھ سے دل میں جا کر ٹھہر جائے حسن کا مکمل زاویہ ہے جو زندگی کے ہر حصے میں ایک ہی رنگ میں ڈھلا نظر آتا ہے۔

۞- صاحب علم ہمیشہ آپ طور طریقوں اور عادت واطوار سے پہچانا جاتا ہے۔جس طرح سورج کبھی یہ اعلان نہیں کرتا کہ وہ آسمان پر آ چکا ہے اسی طرح ایک صاحبِ علم اور حقیقت کا ادراک کرنے والا کبھی شور اور بے تکے پن سے اپنی شناخت نہیں چاہتا۔بلکہ اس کی گفتگو اور عمل اس کی شخصیت اور علم کی پہچان بن جاتے ہیں۔ایک بونا ہمیشہ خود کو بڑا کر کے پیش کرتا ہے لیکن پست قامتی جسمانی ہو تو کوئی عیب نہیں لیکن عقلی ہو تو کبھی بھی روا نہیں رکھی جاتی۔اس لیے وہ گدھا جو خود کو اونچی آواز کی بنا پر شیر سمجھنا شروع کر دے تو عین وقت جنگ دو حصوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔

۞- ہمارا انسانوں کو پرکھنے کا معیار ان کی شکل، رنگ، نسل، ذات، فرقہ اور مذہب ہوتا ہے۔عام طور پر کسی کی عقل، ذہانت، سوچ اور فکر کی قدر اس لیے نہیں کی جاتی کیونکہ وہ پسندیدگی کے اس معیار پو پورا نہیں اترتا جو تنگ ذہنیت کے افراد کے مطابق نہیں ہوتا۔معاشرتی سطح پر برداشت سکھانے کی بجائے جب ہاتھ اُٹھانے اور گردن اُڑانے کا درس دیا جائے گا تو اس قانون کے لحاظ سے صرف گردن اُتارنے والا ہی بچے گا۔ترقی یافتہ ممالک نے یہ بات بہت عرصہ پہلے سمجھ لی تھی کہ عقل اور ذہانت کا نہ تو کوئی مذہب ہوتا اور نہ کوئی ملک ہوتا ہے اسی لیے ان کی ترقی انسانی ترقی کہلاتی ہے۔آج اگر وہ اس ترقی کو کسی خاص فرقے، مذہب، گروہ یا قبیلے سے جوڑ دیں تو سوچیں باقی دنیا کا کیا بنے گا؟ ***

آبروئے قلم پر تبصرہ

شاہین کھروڑی

برصغیر کی تحریکِ آزادی کے رہنما اور معروف کلاسیکل شاعر مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا۔

شعر دراصل ہے وہی حسرت۔ سنتے ہی دل میں جو اُتر جائے

شعر کا یہ خاص معیار مولانا حسرت موہانی نے قائم کیا بہت سے اشعار عام فہم نہیں ہوتے وہ بالعموم ہمارے سر سے گزر جاتے ہیں اول بات یہ کہ اپنے جذبات، محسوسات اور مافی الضمیر کو الفاظ کے منظم پیرائے میں ڈھالنا شاعری کہلاتا ہے اور دوئم اپنے شعر کا قابلِ فہم اور بامقصد بنانا اس کا اصل حسن ہے احکم غازیپوری کا شمار ہندوستان کے ان چند شعراء کرام میں ہوتا ہے جو مذکورہ بالا دونوں تعریفات پر بطریقِ حسن پورا اُترتے ہیں۔

موصوف سے میرا تعارف سوشل میڈیا کے توسط سے ہوا چونکہ فنونِ لطیفہ جغرافیائی حدود کے محتاج نہیں ہوتے اس لیئے محترم احکم غازیپوری کے شعر وادب سے پرخلوص لگاؤ اور انکے کلام نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ان کی شاعری درحقیقت روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج ہے ان کی سچائی اور کھرا پن پڑھنے اور سننے والوں کو لمحوں میں ہی تسخیر کر لیتا ہے۔احکم غازیپوری کا زیرِ نظر شعری مجموعہ ”آبروئے قلم“ روایتی شاعری کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے ان گنت انسانی موضوعات سے مزین ہے اس میں نا صرف عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس میں روزمرہ سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل اور انسانی تاریخ کے خودساختہ طبقاتی تفاوت کے رنگ بھی نمایاں ہیں موصوف انسانی معاشرے کی بنیادی اساسِ اخوت و بھائی چارہ اور فلسفہء امدادِ باہمی کے فقدانی گراف پر بھی عقابی نظر رکھتے ہیں

کہنے کو ایک گھر میں وہ رہتے تو ہیں مگر
رشتہ کشیدگی کا سگے بھائیوں میں تھا

احکم غازیپوری مادہ پرستی کے اس عہدِ پرفتن میں قناعت پسندی کا دامن تھامتے ہیں اور یہی وصف انکے کھرے پن کی درخشاں اور ایک واضح دلیل بھی ہے۔”آبروئے قلم“ میں یوں رقم طراز ہیں۔

پرے ہے عقل سے پرواز آرزوئے قلم
حدِ کمال سے آگے ہے جستجوئے قلم
مرے خیال میں مضمون لے کے آتے ہیں
سروشِ علم سے ہوتی ہے گفتگوئے قلم
یہ علم ایک قلم کار کی عبادت ہے
نماز حرف سیاہی ہے گر وضوئے قلم
فقیرِ عشق ہوں خاطر میں میں نہیں لاتا
کہ ورنہ کرنے کو دولت سلام کرتی ہے

اپنے قلبی احساسات کے لطیف پیرائے میں اظہار کا فن احکم غازیپوری کو بخوبی آتا ہے وہ محض دو جملوں میں اپنی طویل اور اہم ترین قلبی واردات کا اظہار ایسے دلپذیر انداز میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں اپنی قوم کی تاریخ لکھنے بیٹھا ہوں
یہ امتحان ہے رہ جائے آبروئے قلم
بکھر رہی ہے ہواوں میں ہر طرف خوشبو
لبوں پہ ان کے شگفتہ کوئی گلاب ہے کیا

محبت کے پاکیزہ جذبات کی پاسداری کا ہنر کوئی احکم غازیپوری سے سیکھے وہ اپنے محبوب (خواہ وہ خودساختہ ہی کیوں نہ ہو) کی جدائی کا اظہار بھی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ محبت کا جذبہ، محبت اور محبوب تینوں کا تقدس اور بھرم اپنی جگہ قائم رہتا ہے وہ اپنی محبت کو رسوا کرنے کی بجائے اسے زمانے کا معتبر حوالہ بناتے ہیں۔خدا کا شکر ہے سب کچھ ہے میرے پاس مگر۔۔۔جو تو نہیں تو میری ہر خوشی ادھوری ہے۔احکم غازیپوری کی شاعری میں انسانی فلسفے کا عکس بھی ملتا ہے معاشرتی مسائل کا فہم وادراک ایک شاعر کیلئے جزو لازم گردانا جاتا ہے مفاد پرستی اور نظریہ ضرورت کے دریا کو اسکے تمام لوازمات کے ساتھ کوزے میں بند کرنے کے مصداق ایک ہی شعر میں اپنے مشاہدے کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

میری وفا مری حسرت سلام کرتی ہے
چلے بھی آؤ محبّت سلام کرتی ہے
مشاہدہ ہے ہمارا بغیر مطلب کے
کہاں کسی کو سیاست سلام کرتی ہے

اب آدمی کو سلام آدمی نہیں کرتا
اب آدمی کو ضرورت سلام کرتی ہے

عوام الناس کی محرومیوں اور محکومیت کے ساتھ ساتھ اپنے سروں پر ذاتی غرض و غایت کے ریشمی تار سے مرصع اور مسجع جھوٹی دستارِ فضیلت پہننے والے امیرانِ قوم کی رہبری کے انداز اور اس سے وابستہ مضامین بھی پڑھنے کو میسر ہیں۔

کوئی بھی قوم تباہی سے بچ نہیں سکتی
امیرِ قوم کی گر رہبری ادھوری ہے

مجموعی طور پر اگر احکم غازیپوری کی ''آبروئے قلم'' کا جائزہ لیا جائے تو یہ دبستانِ شعر و ادب میں تازہ ہوا کا ایسا جھونکا ہے جو اپنے اندر شعور و آگہی کے نئے مضامین سموئے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اسے سرزمینِ ہندوستان کے دبستانِ ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کہہ سکتے ہیں۔احکم غازیپوری کے اس شعر کے ساتھ اپنی رائے کا اختتام کرتا ہوں۔

کیسے میں کہہ دوں چھوڑ کے مجھ کو چلا گیا
وہ یاد بن کے رات کی تنہائیوں میں تھا

(اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ)

محمود احمد ناصر کنیڈا

جان و دل ساتھ لا آمادہ لا
خود میں قربانیوں کا مادہ لا
آج پھر دین کو ضرورت ہے
مال پورا نہیں تو آدھا لا
مول یونہی نہیں لگا کرتے
پسر یعقوب کا لبادہ لا
کام ہونگے فقط سبھی یونہی
سب کو ہمت دلا ارادہ لا
اس کی آنکھوں سے مے ٹپکتی ہے
سل گئے ہونٹ چشم بادہ لا
یونہی کھلتی نہیں قفل گاہیں
عہد و پیماں کوئی تو وعدہ لا

ہاشم رضا ہاشم

پگڑی اُچھا لنے سے بھی کرتا نہیں گریز
آداب زندگی بھی سکھاتا ہے مولوی
سجدوں کا ہے جبیں پہ نشاں دل مگر سیاہ
ڈرتا نہیں خدا سے ڈراتا ہے مولوی
روشن چراغ کرتا ہے اندھوں کے سامنے
اہل نظر سے آنکھ چراتا ہے مولوی
کرتا دین فروخت فتاویٰ کی شکل میں
انسانیت کا منہ بھی چڑاتا ہے مولوی
واعظ کی شکل میں کبھی ناصح کے روپ میں
دیوار بن کے راہ میں آتا ہے مولوی

اعلان

شریف اکیڈمی جرمنی کے زیر اہتمام ایوارڈز

(ڈائریکٹر میڈیا)

شریف اکیڈمی جرمنی کے چیف ایگزیکٹو شفیق مراد نے اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے متفقہ فیصلے کے مطابق 2015تا2022 تک فروغ علم وادب کے لئے خدمات سرانجام دینے والوں اور اردو ادب کی مختلف اصناف میں تخلیق کرنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایوارڈز دینے کا اعلان کیا ہے۔

یہ ایوارڈ شریف اکیڈمی جرمنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی جانب سے تشکیل دیے گئے ججز کے پینل کے فیصلے کے مطابق دیئے جائیں گے۔

(ادارہ)

تانیثی شعری حسِّیت کی علمبردار شاعرہ
ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

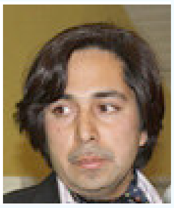

مظفر احمد مظفر لندن

آرٹ اور شاعری کا براہ راست تعلق وجدان سے ہوتا ہے۔اور وجدان Conscience میں تخصیصِ صنف نہیں پائی جاتی۔رب کائنات نے اپنے عطیاتِ معتبر کی تقسیم وترسیل میں تخصیص Customization سے بالاتر ہوکر مرد وزن کو عطا کیا ہے۔ہماری آٹھ سو سالہ مشرقی شعری محاذ آرائیوں پر مرد شعراء کا ہی تسلط رہا۔اس دور میں خوش قسمتی سے دو ایک خواتین شاعرات میں سب سے پہلے جو نام سامنے آئے، وہ شہزادی زیب النساء مخفی ہیں۔جو شہنشاہ اورنگ زیبؒ عالمگیر کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔عربی اور فارسی زبانوں کے ساتھ فارسی شاعری کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔لیکن افسوس ان کا دیوان دستیاب نہیں ہے۔شعر گوئی کے سلسلے میں دوسرا نام بیگم کا آتا ہے، جو شاعر میر تقی میر کی صاحب زادی تھیں۔غالب گمان یہ ہے کہ والد محترم کی شفقت اور گھر میں شاعرانہ ذوق کے سبب ان کی کشتِ ذہن کی آبیاری ہوئی ہوگی۔شعر دیکھیں۔

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا

بیسویں صدی میں یہ رجحان مزید پروان چڑھا امتہ الروٗف، نجمہ تصدق،سعیدہ جہاں مخفی، رفیعہ بانو مضمر وغیرہ نسائی لب ولہجے میں اظہار کرنے والی اولین شاعرات ہیں، جن کے بدولت جلد ہی تانیثی حسّیت کی علم بردار شاعرات کا ایک پورا جہان آگہی مرتب ہوگیا۔ازاں بعد تقسیم ہند تک گویا نسائی جذبات واحساسات Feminine Emotions کو ثانوی حیثیت دی جاتی رہی تذکرہ نگاروں نے خواتین اور انکے افکار ونظریات کو بہ نظر تعمق/In terms of meditation نہیں دیکھا اور نہ ہی انہیں مستند اور سنجیدہ فکر شعراء کے ہم مرتبہ سمجھا گیا۔اگرچہ اسی دور میں خواتین شاعرات اپنے احساسات ونظریات کو جزوی طور پر ہی سہی شعری ونثری قالب میں ڈھالنا شروع کرچکیں تھیں۔اور اپنے مخصوص نسائی نقطہ ہائے نظر کو معاشرے کے سامنے رکھنے کا آغاز کرچکیں تھیں۔تقسیم ہند کے بعد خواتین شاعرات کے خیالات سماجی، معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی اور اخلاقی سطح پر اثر انداز ہونے لگے۔ذرائع ابلاغ نے اس اقدام کو خوش آئند سمجھتے ہوئے انکا خیر مقدم کیا اور یوں معاشرہ میں نئی اور خوشگوار مثبت تبدیلی نے عوام الناس کو نئے اور مسحور کن نسائی لب ولہجہ سے متعارف کروایا اور اسکی افادیت اور سحر انگیز جاذبیت سے پردہ اٹھتے ہی مخصوص نسائی لہجے کی گونج نے کانوں میں رس گھولنا شروع کردیا تھا۔

یوں مردوں کی اجارہ داری جاتی رہی اور خصوصاً بساط ادب پر مردانہ فوقیت کو خواتین نے تسلیم کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا شدید مگر غیر محسوس انداز سے احساس دلایا اور سبھی غزلیہ مروجہ موضوعات پر اپنی باری چلی اور اکثر مقامات ہر مرد پیادوں کو تاریخ ساز مات دے کر اپنی خود اعتمادی کو دو چند کیا اور کہیں کہیں تو اپنی خداداد ادبی صلاحیتوں اور فطری نفاست کی بدولت میدان ہی مار دیا۔الغرض یوں خواتین کے ادبی معرکوں کی گونج، خود اعتمادی اور رشحات پر ناقدین وتذکرہ نگاروں نے خوب قلم اٹھایا اور سیر حاصل مضامین اور مقدمے لکھے اور انکی تخلیقات کو درخور ستائش سمجھنے لگے۔ہمارے دور میں جن شاعرات کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ انکے تانیثی نقطہ ءنظر کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔انمیں ادا جعفری، پروین شاکر، زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ممتاز مرزا، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، جمیلہ بانو، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، وحیدہ نسیم، مسعود حیات، بیگم ممتاز مرزا، بسمل صابری، حمیرا رحمان، جمیلہ بانو گیتا گپتا، نیر جہاں نیر، نور جہاں ثروت، کشور آراء شبنم، گلنار آفریں، رشیدہ عیاں، ذکیہ سلطانہ نیر، ملکہ نسیم، سیدہ شان معراج، نسیم نکہت، حسنی سرور، عفت زریں، نسرین نقاش، نزہت صدیقی، ترنم کانپوری، یاسمین حمید، نوشی گیلانی، پروین فنا اور بہت سے نام اس کے علاوہ ہیں ان کے علاوہ دیگر بہت سی شاعرات ہیں جنہوں نے نسائی شاعری کو بام عروج تک پہنچایا۔کہا جاتا ہے کہ قدیم روایتوں کی فصیل گرانا آسان نہیں ہوتا۔مدت دراز سے محبوس

اور بے بس بنا کر رکھی جانے والی یہ حساس حاشیائی مخلوق تبھی اپنا جائز حق وصول کر پائی جب وہ اپنی رائے اور کلفتِ خاطر کو قوت گویائی عطا کر پائی۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہوا جب وہ آگے بڑھ کر خارجی حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکی بیسویں صدی کے آواخر میں ڈیرہ غازی خان پاکستان سے اُٹھنے والی ایک توانا اور پُر تاثیر آواز جو جدید دور کی باہمت اور عالمگیر شہرت یافتہ شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نام سے شہرت حاصل کر چکی ہے آپ کو اوائل عمری سے ہی ان تلخ اور ہوش ربا حقائق کا علم ہو چکا تھا۔ اپنے قبیلے کی رسم و رواج علاقائی سماجی اور معاشرتی قیود انکی نگاہ سے اوجھل نہیں تھیں۔ با ایں ہمہ آپ نے میڈیکل کالج کے دور سے ہی اپنی باقاعدہ شاعری کا آغاز کر کے اپنے بعد آنے والی شاعرات کے لئے نہ صرف راستہ ہموار کیا ہے۔ بلکہ انکے لئے نشان منزل بھی بنی ہیں۔ محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شعری کائنات میں عمق بھی ہے اور سطحیت بھی دراصل اظہار کے باب میں شاعرہ نے کلام میں سلاست اور سادہ پن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور سادگی میں پرکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اور یوں کلام پُر تاثیر بھی ہو گیا ہے اور دو آتشہ بھی، خیال کو خوشنما الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنی شگفتہ بیانی سے عطر آگیں کر دیا ہے اور یوں لفظ پر کیف ہو گئے ہیں۔

مضمون آفرینی زبان و بیان کی پاکیزگی عاشقانہ اور سفلی جذبات کے ساتھ ساتھ کلام میں پاسِ ناموسِ عشق بھی پایا جاتا نیز سنجیدہ اور متین اخلاقیات کے نکات بھی ملتے ہیں۔ کلام کی فنی، فکری، اخلاقی و سماجی نیز دیگر موضوعاتی خصوصیات آپ کی غزل نگاری کی انفرادی حیثیت کا تعین کرتی ہیں مطلقاً روایاتی انداز فکری و موضوعات کی شرح اور خاص کر عناصر ترکیبی اور اسلوب کی سنجیدگی لائق تحسین ہے۔ جذبات کی تپش کلام کی معنویت تہہ داری اپنی جگہ متاثر کن ہے زبان و بیاں کے ساتھ ساتھ لغات و محاورہ پر بھی آپکی گرفت دیکھی جا سکتی ہے۔ فی زمانہ اثر جوش اور ہیجان پرور شاعری کی نسبت مابعد الطبیعاتی شاعری کا رُجحان جڑ پکڑ رہا ہے ایسے میں فطرت اور رومان کی طرف رُجحان اور معنی آفریں کلام کا ہونا غنیمت ہے میرے نزدیک اس جواہر پارے پر جتنی داد بھی دی جائے کم ہو گی۔ میرے نزدیک یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ کسی حسین کلام کی ایمائیت اشاریت اور اعجاز بیانی سے انکار کیا جائے جہاں خیالات کے آئینوں میں تفکرات اور تجلیات کی دلفریب تتلیاں رقص کناں ہوں اور پردۂ سوز و ساز بوجہ سرمستی و سرشاری مرتعش ہونے لگے۔ افکار کی تازگی جو کسی Idealogy کی بے معنی قید کو جزو لازمی نہ سمجھتی ہو لائق صد داد ہوتی ہے یہ تفہیم آفرینی اور تازگیٔ نہالِ سخن سزاوارِ ہزار ہا تحسین و مبارک باد ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین صاحبہ اسی اعتماد و یقین اور تلاش سے محوِ سفر ادب رہیں تو جلد اپنی انفرادیت کی منزل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ رب ذوالجلال انکا یہ مجموعہ کلام ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تو'' انکی نئی کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا دے تمام ترنیک تمنائیں اور دعائیں۔

سید ساجد احمد یو ایس اے

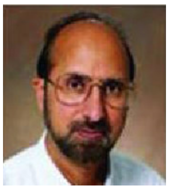

بجھتے جاتے ہیں نگاہوں کے چراغ
روشنی سے بھرلو پھولوں کے ایاغ
مٹتے جاتے ہیں بہاروں کے نقوش
ہے چمن میں دامنِ گل داغ داغ
بیٹھ کے بیتی سنے دل کی کوئی
اس قدر کس کو ہے دُنیا میں فراغ
تو نہیں آیا تو تنہا میں نہیں
میرے ہمدم ہیں مرے سینے کے داغ
حاصل گل بھی یہی ہے ایک شوق
پر اسی سے ہے مرے دل کا ایاغ
گو بہت تاریک ہے راہ حیات
دے رہے ہیں لو مرے سینے کے داغ
رشتۂ حرف و جنوں قاتل نہ تھا
دے گیا ہے دم مجھے میرا فراغ
قید ہو مخلصؔ حریم ذات میں
ڈھونڈنا ہے دیکھو کس کا سراغ

مشہور شعراء پر ایک نظر

میر تقی میر

میر تقی میر اردو کے نہایت بلند پایا شاعر ہیں۔ میر کے تخلص میں ہی ان کی شاعری کی قدر و قیمت پر تو موجود ہے۔ میر تقی میر بلا شبہ اردو غزل کے میرِ کارواں ہیں۔انہوں نے اردو کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی مگر ان کا اصل میدانِ غزل ہے۔ان کی غزل کی سب سے بڑی خوبی سوز و گداز اور تاثیر ہے۔ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت ان کے کلام کی سادگی اور زبان و بیان کی اصلاح ہے۔جس کی بدولت اردو شاعری کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی۔میر کی غزلیں جذباتی زندگی اور تمدنی احوال کی ترجمان ہیں۔ان کی شاعری کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا بلکہ بعد میں آنے والے تمام اہم شاعروں نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

خاندانی پس منظر: میر تقی میر کے اسلاف ارضِ حجاز سے وارد ہندوستان ہوئے ان کے پردادا نے اکبرآباد میں بود و باش اختیار کی اور یہیں میر بھی پیدا ہوئے انکی پرورش دلی میں انجام پائی۔ان کے والد میر متقی۔ درویش کامل تھے اور گریہ و استغراق اور کیف مجذوبی میں گم رہتے تھے ان کے بچپن کے اتالیق سید امان اللہ تھے جبکہ والد اور اتالیق دونوں زیادہ دیر نہ جیئے میر کے سوتیلے بھائی نے ان کی جائداد پر قبضہ کرلیا اور ان کے اپنے ماموں سراج الدّین آرزو کی بدسلوکی سے طبیعت جنونی ہوگئی۔میر کے سید ہونے کے سلسلہ میں کچھ لوگوں نے تامل کیا ہے لیکن محمد حسین آزاد صاحب نے انہیں کے کلام سے استناد کرتے ہوئے انہیں سید تسلیم کیا ہے اور اس باب کو یہیں پر ختم کردیا ہے۔چنانچہ وہ کہتے ہیں ”پھر بھی اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی مسکینی، غربت، صبر و قناعت، تقویٰ، طہارت، محضر بن کے اداءِ شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے ورنہ زمانے کا کیا ہے کس کس کو کیا نہیں کہا ہے اگر وہ سید نہیں ہوتے تو خود کیوں کہتے پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔

کچھ لوگ میر صاحب کے بارے میں قطعی نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ پاگل پن کا شکار تھے اسی کے مقابل کچھ لوگ اسے میر کی حساس طبیعت سے جوڑ کر دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جس ماحول میں میر نے زندگی گزاری ہے اس ماحول میں جو کوئی بھی ہوتا اس قدر مصائب کی تاب نہ لا کر اسی کیفیت کا شکار ہو جاتا جو میر پر طاری تھی مع ذالک کچھ ادیبوں کا خیال ہے کہ ”میر بے حد نازک طبع اور غیور تھے چنانچہ بد دماغ اور مردم بےزار مشہور ہوگئے اس دور کے انتشار اور بدنظمی نے میر کو متاثر کیا اور ایک دائمی غم ان کے دل پر محیط ہو گیا میر کی شاعری ان کی داخلی واردات اور اس پریشان حال دور کی سماجی صورت کا آئینہ ہے، وہ زمانے کو بچشم نم دیکھا کئے اور دل کی زبان سے حالات زمانہ رقم کرتے گئے“۔میر کی جنونی کیفیت کے مختلف ابعاد پر طبی اور نفسیاتی نقطہ ہائے نظر سے انٹرنیٹ پر میر فن اور پاگل پن قابل دید ہے۔اگر بد دماغی کو پاگل پن کے زمرے میں رکھا جائے تو محمد حسین آزاد صاحب کے مطابق یہ ماننا ہی پڑے گا کہ وہ پاگل پن کا شکار تھے” اپنی بد دماغی کے سایہ میں دنیا و اہل دنیا سے بیزار گھر میں بیٹھے رہتے تھے اس کا اعتراف خود میر کو بھی تھا کہ زمانہ ان کو بد دماغ سمجھتا بیجا لات کی ستم ظریفی۔ میر کے دماغی خلل کو ان کے فنکارانہ شعور سے تعبیر کیا جائے یا اسے خاندانی پس منظر سے جوڑا جائے لیکن میر کے اوپر گزرنے والی کیفیات کے تعلق کو زمانے کی ستم ظریفیوں سے لاتعلق نہیں رکھا جا سکتا ہے۔میر جیسے حساس طبیعت کے مالک انسان کے لئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھنے کے لئے کیا کم ہے کہ وہ اپنے باپ کے انتقال کے وقت اتنے مجبور تھے کہ انہیں سپرد خاک کرنے کے لئے ان کے پاس دفن کفن کا انتظام نہ تھا بقول علی سردار جعفری”جب ان کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ تین سو روپے کے مقروض تھے اور انہوں نے اپنے ترکہ میں چند سو کتابوں کے سوا کچھ نہیں چھوڑا ان کی کتابوں پر میر کے سوتیلے بھائی نے قبضہ کرلیا اور میر نے باپ کے ایک مرید کی بھیجی ہوئی پانسو روپے کی ہنڈی لے کر قرض ادا کر کے لاش دفن کی۔

بعد از وفات والد: میر کے اوپر ان کے والد کی وفات کے بعد کیا گزری اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ اس زمانے میں تفصیلی حالات کا جائزہ ذرا مشکل ہے گرچہ خود میر کے قلم سے بکھرے ہوئے درد میں ڈوبے حروف کافی حد تک اس کرب کے بیان کرہیں جو میر پر بعد وفات طاری تھا ”درویش نے آنکھیں موندیں تو سارا عالم میری نظر میں تاریک ہو گیا بڑا حادثہ رونما ہوا آسمان مجھ پر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا صبر و شکیب جاتا رہا در و دیوار سے سر پھوڑتا تھا خاک پر لوٹتا تھا بڑا ہنگامہ بپا ہوا گویا قیامت نمودار ہو

گئی میرے بڑے بھائی نے طوطا چشمی اختیار کرلی۔“

سوتیلے بھائی کا سلوک: اپنے والد کی وفات کے بعد کچھ عرصہ میر دہلی جا کر اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزوؔ کے یہاں ٹھہرے لیکن حالات کچھ ہی دن سازگار رہے اور ان کے بھائی کے ماموں کے نام زہر بھرے خط نے ان کی زندگی میں زہر بھر دیا۔ میر لکھتے ہیں ”میرے بھائی کا خط ماموں کے نام پہونچا کہ میر محمد تفتیش روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ آرزو پکے دنیادار تھے اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا کا برا چاہنے لگے اگر سامنے پڑتا تو پھٹکارنے لگتے اور بچ بچ کر رہتا تو اول فول بکتے ہر وقت ان کی نگاہ میری نگرانی میں رہتی اور میرے ساتھ دشمنوں کا سا برتاؤ رکھتے میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا۔

دلّی کی ویرانی: جس قدر میر کے حالات کی ابتری نے انہیں رلایا اس قدر زمانہ نے بھی دل میر کی کیاری میں بے شمار زخموں کے پھول کھلائے میر کا اپنے والد کی وفات کے بعد جس قدر بے یار و بے یار ہونا کرب ناک ہے اسی قدر دہلی کا تاراج ہونا بھی جس قدر میر کو ان کی ذاتی محرومیوں نے رُلایا اتنا ہی دہلی کی ویرانی نے بھی خود لکھتے ہیں ”ہر قدم پہ رویا اور عبرت حاصل کی جب آگے بڑھا تو حیران ہوا مکان پہچان میں نہ آوے در و دیوار نظر نہ آئے عمارت کی بنیادیں نظر نہ آئیں رہنے والوں کی کوئی خبر نہ ملی“ دہلی پر تاخت و تاز کو عبرت کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: شہاں کے کحل جواہر تھی خاک پا جن کی آنکھوں میں۔ نہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں۔

یہ شعر اس تاریخی پس منظر کا حامل ہے کہ جس میں جمیل جالبی کے بقول ”1857 میں صفدر جنگ کی حمایت سے مرہٹوں نے پھر دلی کو تاراج کیا اور عماد الملک نے احمد شاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھرا کر اندھا کر دیا۔ دلی جس کا ذکر بار باران کی (میر) شاعری میں آتا ہے صرف کسی شہر کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عظیم مرتی ہوئی تہذیب کی رُوح کا اشارہ ہے“ دلی کی ویرانی نے میر کو اس قدر افسردہ کیا کہ جب ایک معاشرے میں عجیب و غریب حلیہ لئے پہونچے اور لوگوں نے وطن دریافت کیا تو جب شمع ان کے سامنے آئی تو فی البدیہہ فرمایا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساتھیو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

خصائل وفطرت: جہاں میر کی زندگی کا وہ حصہ اپنے اندر عبرتیں لئے ہوئے ہے جس کا تعلق حالات اور زمانے سے ہے وہیں خود میرؔ کے ذاتی خصائل اور ان کی فطری جبلّت بھی اہل ذوق کے مطالعہ کے لئے بے سود نہیں ہے۔

خودداری وقناعت: میر کی شخصیت میں جو چیز ہر انسان کو ان کی شخصیت کا گرویدہ بنا دیتی ہے وہ ان کی خودداری اور قناعت پسندی ہے خودداری کا تو خیر ذکر ہی کیا لیکن قناعت کا عالم یہ ہے کہ بقول محمد حسین آزاد صاحب ”قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کو بھی برداشت نہ رکھتے تھے نتیجہ یہ کہ فاقے کیا کرتے اور دُکھ بھرتے تھے خوددار اس قدر تھے کہ اپنے عصری تقاضوں کے برخلاف کبھی انعام واکرام کے لالچ میں کسی بڑے سے بڑے نواب یا بادشاہ کے لئے حرف بھی نہ کہے چاہے کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور اُمراء واشراف کی خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے قطعی طور پر ان کی مدح سرائی سے گریز کرتے تھے حتیٰ کہ ان کی جانب سے پیش کئے جانے والے اعزازی اور تشویقی تحائف وانعامات سے بھی بیزار رہتے اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتے” کہ وہ ہونگے بادشاہ اپنے دیار کے ہم اپنے من کے بادشاہ ہیں یہ ان کی عدم خوشامد اور شاہانِ وقت کی مدح سرائی سے گریز کا ہی خاصہ ہے اُمراء کی تعریف میں اکثر شعراء کا کلام مل جائے گا لیکن میر کہیں نظر نہیں آئیں گے چنانچہ محمد حسین آزاد اُمراء کی تعریف میں قصائد نہ کہنے کا سبب ان کے توکل اور ان کی قناعت پسندانہ زندگی کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ”اُمراء کی تعریف نہ کرنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انہیں بندوں کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔“

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں ---میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

ان کے لئے محمد حسین آزاد کی یہ تعبیر بہت مناسب معلوم ہوتی ہے ”یہ سمجھ لو کہ قسام ازل نے ان کے دسترخوان سے مدح وقدح کے پیالے اُٹھا کر سودا کے یہاں دھر دئے تھے۔ ان کی یہ سوچ تھی کہ بادشاہ اپنے ملک کا حاکم ہے تو ہم اپنے ملک کے بادشاہ ہیں تو بھلا کیوں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں یا کیوں کسی کا عطیہ قبول کریں بلا وجہ کچھ لینے کو اپنے لئے عار سمجھتے

تھے اور اپنی فقیری کو اپنا سرمایہ چنانچہ محمد حسین آزاد صاحب نے تحریر کیا ہے ''اکثر صاحبان عالیشان جب لکھنؤ جاتے تو میر صاحب کو ملاقات کے لئے بلاتے مگر یہ پہلوتہی کرتے اور کہتے مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب، صاحب لوگوں کو خاندان سے غرض نہیں میرا کلام سمجھتے نہیں البتہ کچھ انعام ضرور دیں گے ایسی ملاقات سے ذلّت کے سوا کیا حاصل'' ان کی یہی سوچ تھی جس نے انہیں فقر کے بعد بھی بادشاہ بنائے رکھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو کسی بادشاہ سے کم نہ سمجھتے تھے سو کسی کے سامنے دست دراز کرنا تو کجا دینے والے کے ساتھ وہ روّیہ اختیار کرتے کہ وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ کون سی دولت اس شخص کے پاس ہے جس پر تکیہ کرتے ہوئے ہمیں بھی خاطر میں نہیں لا رہا یہ سچ ہے میر اپنے من اور اپنے دل کے بادشاہ تھے تبھی تو بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ ''ایک دن نواب (سعادت علی خان) کی سواری جا رہی تھی یہ تحسین کی مسجد پر سرراہ بیٹھے تھے سواری سامنے آئی سب اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے سید انشاء خواص میں تھے نواب نے پوچھا انشاء یہ کون شخص ہے جس کی تمکنت نے اسے اُٹھنے بھی نہ دیا عرض کی جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا کرتا ہے (گزارے کا وہ عالم اور مزاج کا یہ عالم) سعادت علی خان نے آ کر خلعت بحالی کی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا جب چوبدار لے کر گیا میر صاحب نے واپس کر دیا اور کہا مسجد میں بھجوایئے یہ گناہگار اتنا محتاج نہیں ہے۔ سعادت علی خان جواب سن کر متعجب ہوئے مصاحبوں نے سمجھایا غرض نواب کے حکم سے سید انشاء خلعت لے کر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر بلکہ عیال پر رحم کیجئے اور بادشاہ وقت کا ہدیہ قبول فرمائیں میر صاحب نے کہا صاحب وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔

بیباک انداز گفتگو اور ٹوک لہجہ: میر لگی لپٹی کہنے کے عادی نہیں تھے وہ اور چار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جوبات ہوتی بغیر کمی و کسر کے سامنے اور بلا جھجھک و تکلف کہہ ڈالتے تھے اور اس قدر برجستہ اور صریح انداز اپناتے کہ سامنے والا اگر غلطی پر ہے تو پانی پانی ہو جائے۔ محمد حسین آزاد صاحب نے اس بے دھڑک اور برجستہ انداز گفتگو کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں ملاحظہ ہوں ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے نواب کی سواری سامنے آئی دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے میرؔ صاحب آپ نے بالکل ہی ہمیں چھوڑ دیا ہے کبھی تشریف بھی نہیں لاتے میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا ادب شرفاء نہیں ہے یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ لکھنؤ کے چند عمائدین و اراکین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میرؔ سے ملاقات کریں اور اشعار سنیں میر صاحب تشریف لائے مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انہوں نے فرمائش اشعار کی میرؔ صاحب نے اول تو کچھ ٹالا پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے اگر چہ ناگوار ہوا مگر بنظر آداب و اخلاق ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت! انوری اور خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں آپ کا ارشاد کیوں نہیں سمجھیں گے؟ میر نے کہا یہ درست ہے مگر ان کی شرحیں، مصطلاحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لئے فقط محاورہ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم ہیں یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا: عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا.. کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا۔

میر قمر الدین دلی میں ایک شاعر گزرے ہیں علوم رسمی کی قابلیت سے عمائد دربار شاہی میں تھے وہ میرؔ صاحب کے زمانے میں مبتدی تھے شعر کا بہت شوق تھا اصلاح کے لئے اردو کی غزل لے گئے میر صاحب نے وطن پوچھا انہوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا آپ نے فرمایا سید صاحب اردوئے معلّیٰ خاص دلی کی زبان ہے آپ اسمیں تکلف نہ کیجئے اپنی فارسی وارسی میں کہہ لیا کیجئے۔ سعادت یار خان رنگیں نواب طہماسب بیگ خان قلعدار شاہی کے بیٹے تھے 15.14 برس کی عمر تھی شان وشوکت سے گئے اور غزل اصلاح کے لئے پیش کی سن کر کہا صاحب زادے آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں نیزہ بازی، تیر اندازی کثرت سے کیجئے شہ سواری کی مشق فرمایئے شاعری دل خراشی وجگر سوزی کا نام ہے آپ اسکے درپے نہ ہوں انہوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں یہ آپ کو نہیں آنے کا، خوامخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرورت ہے۔ میر کی زندگی میں اس طرح کے ڈھیروں نمونے مل جائیں گے کہ جن سے میر کی حساس طبیعت کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت طبع لہجہ کی شفافیت، زبان کی شائستگی اور صداقت، اور ان کی رُوحی بالیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ میر کی زندگی میں بکھرے ہوئے درد اور جراحتوں کا اندازہ خود ان کے اشعار سے بھی کیا جا سکتا ہے ان کی گہری نظر اور آفاقی سوچ کا آج بھی کوئی ثانی نہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کربلا کے سجدہ

آخر کو یوں تو بہت سے شعرا نے نظم کیا ہے لیکن میر تقی میر نے جو کچھ اپنے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے وہی میر کی حساس طبیعت اور لہجہ کی انفرادیت کے لئے کافی ہے۔

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

جب تک دنیا میں احساس باقی ہے میر کا نام اُفق ہستی پر اپنی روشنی بکھیرتا رہے گا۔ یقیناً میر جیسا تڑپتا ہوا احساس ہی اتنے برجستہ انداز میں کہہ سکتا ہے۔

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے مری کیا دوانے نے موت پائی ہے

لحظے لمحوں میں لمحے سالوں میں سال صدیوں میں بدل جائیں گے لیکن میر کی درد میں ڈوبی آواز ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا عمر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

خورشید احمد جامی صاحب

پیدائش 15 مئی 1915ء نئی غزل کے اہم شاعروں میں ایک، نظم، نثر نگار اور معروف شاعر ”خورشید احمد جامی صاحب“ کا یومِ ولادت نام خورشید احمد جامی ہے۔ جامی کی پیدائش ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کا خاندان مہاراشٹر کا تھا لیکن ان کے نانا قاضی احمد فہیم حیدرآباد چلے آئے اور وکالت کرنے لگے اور حیدرآباد ہی کو اپنا مستقر بنا لیا۔ جامی کے والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا اس لئے بہت جلدی معاشی مشکلات میں گھر گئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فاضل کی سند حاصل کی اور روزگار کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ عرصے تک محکمہ آبکاری میں ملازمت کی پھر طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے مستعفی ہو گئے جامی کی شاعری اپنے ڈکشن اور اپنے موضوعات کے حوالے سے اپنی انفرادی شناخت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری نے اردو میں نئی غزل کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جامی کی غزل اپنے عہد کے مسائل اور اردگرد بکھری ہوئی تلخ حقیقتوں کو تخلیقی انداز میں پیش کرتی ہے۔ جامی کے شعری مجموعے ’رُخسارِ سحر‘ اور ’یاد کی خوشبو‘ بہت مقبول ہوئے۔ جامی نے بچوں کیلئے بھی نثر اور نظم دونوں صورتوں میں لکھا۔ بچوں کیلئے لکھی گئی ان کی نظمیں ’تاروں کی دنیا‘ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

رنجور عظیم آبادی صاحب

پیدائش / 15 مئی 1863 ۔ اردو شاعری کے عزیم آباد اسکول کے علمبرداروں میں ایک نمایاں نام ”رنجور عظیم آبادی صاحب“ کا یومِ ولادت... رنجور ان شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری عظیم آباد کو ایک الگ دبستانی حیثیت دینے میں معاون رہی۔ ان کی پیدائش 15 مئی 1863ء کو صادق پور (بہار) میں ہوئی۔ نام محمد یوسف جعفری تھا، رنجورؔ تخلص اختیار کیا۔ شمس العلما اور خان بہادر خطاب پائے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچازاد بھائی مولانا عبدالحکیم سے حاصل کی اور 1883 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے رکن منتخب کئے گئے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے صدر مدرس رہے اور بورڈ آف اگزامیننگ کے رکن منتخب کئے گئے۔ رنجور مولاناا ابوالکلام آزاد کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ آزاد نے اپنے خطوط میں متعدد جگہوں پر رنجور کا ذکر کیا ہے۔ رنجور نے اپنی شاعری کی اشاعت میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اسی بنا پر وہ ایک لمبے عرصے تک پردہ خفا میں رہے۔ خدا بخش لائبریری سے دستیاب ہونے والی ان کی بیاضوں کو دیوان رنجور کے نام سے شائع کیا گیا۔ رنجور کی شاعری میں سنجیدہ فکری مضامین کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی صورتیں بھی نظر آتی ہیں۔

سرورؔ بارہ بنکوی صاحب

اردو کے ممتاز شاعر، فلم ساز اور ہدایت کار سرورؔ بارہ بنکوی صاحب کا یومِ وفات 3/ اپریل 1980 سرورؔ بارہ بنکوی اصل نام سعید الرحمن تھا۔ وہ 30 جنوری 1927ء کو بارہ بنکی (یو پی۔ بھارت) میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے کراچی اور پھر ڈھاکہ میں سکونت اختیار کی۔ جہاں انہوں نے فلم تنہا کے مکالمے لکھ کر اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا اور پھر چندا، تلاش، ناچ گھر، کاجل، بہانہ، ملن، نواب سراج الدولہ، تم میرے ہو، آخری اسٹیشن، چاند اور چاندنی، احساس، سونے ندیا جاگے پانی اور کئی دیگر فلموں کے نغمات لکھے جو بہت مقبول ہوئے اسی دوران انہوں نے تین فلمیں آخری اسٹیشن، تم میرے ہو اور آشنا پروڈیوس اور ڈائریکٹ بھی کیں۔ آخری دنوں میں وہ بنگلہ دیش کے اشتراک سے ایک فلم ”کیمپ 333“ بنانا چاہتے تھے۔ وہ اسی سلسلے میں ڈھاکہ گئے ہوئے تھے کہ دل کا دورہ پڑنے کے باعث ۳۔ اپریل 1980 کو ڈھاکہ میں

وفات پا گئے۔ ان کا جسد خاکی کراچی لایا گیا جہاں وہ سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ سرور بارہ بنکوی کے دو شعری مجموعے سنگِ آفتاب اور سوزِ گیتی کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔

جگر مرادآبادی

شہنشاہِ تغزل، رئیس المتغزلین، ممتاز ترین قبل از جدید شاعروں میں نمایاں، بے پناہ مقبولیت کے لئے معروف، مترنّم لب و لہجے کے مشہور شاعر ”حضرتِ جگر مرادآبادی صاحب“ کا یومِ ولادت... ۶۔اپریل ۱۸۹۰۔ جگر مراد آبادی، نام علی سکندر تخلص جگر۔ ولادت ۱۶ اپریل ۱۸۹۰ء مرادآباد (اتر پردیش)۔ قرآن پاک، فارسی اور اردو کی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ ان کے والد علی نظر شاعر تھے۔ جگر کے خاندان کے دوسرے اصحاب بھی شاعر تھے، اس طرح جگر کو شاعری ورثے میں ملی۔ چنانچہ جگر کی شعرگوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ۱۴ برس کے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے حیات بخش رسا کو کلام دکھایا، پھر حضرتِ داغ سے رجوع کیا اور کچھ عرصہ امیر اللہ تسلیم سے بھی اصلاح لی۔ جگر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ مختلف اضلاع میں گزرا۔ ان کا پیشہ چشموں کی تجارت تھا۔ اصغر گونڈوی کی صحبت نے جگر کی شاعری کو بہت جلا بخشی۔ جگر مشاعروں کے بہت کامیاب شاعر تھے۔ ان کا ترنم بہت اچھا تھا۔ بحیثیت انسان وہ نہایت شریف واقع ہوئے تھے۔ بھارتی حکومت نے انھیں ”پدما بھوشن“ خطاب دیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے جگر کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ ان کے آخری مجموعہ کلام ”آتش گل“ پر ان کو ساہتیہ اکیڈمی سے انھیں پانچ ہزار روپیہ کا انعام ملا۔ اور دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ”آتش گل“ کے علاوہ ”داغ جگر“ اور ”شعل طور“ ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ شراب ترک کرنے کے بعد ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ مستقل طور پر گونڈہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو تقریباً صبح ۶ بجے اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

(بحوالہ پیمانہ غزل (جلد اول)، محمد شمس الحق، صفحہ:315)

سراجؔ اورنگ آبادی صاحب

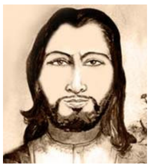

6 مارچ ۱۸۶۳ سراجؔ اورنگ آبادی صاحب کا یوم پیدائش ہے۔ صوفی شاعر جن کی مشہور غزل ’خبر تحیرِ عشق‘ بہت گائی گئی ہے، بزرگ صوفی شاعر ”سراجؔ اورنگ آبادی صاحب“ کا یومِ وفات ۶/ اپریل ۱۸۶۳ سراجؔ اورنگ آبادی نام سیّد سراج الدین تخلص سراج۔ ۱۱/ مارچ ۱۸۱۲ ولادت مارچ وطن اورنگ آباد۔ وہیں تعلیم وتربیت پائی۔ آپ سادات کے ایک برگزیدہ خاندان کے فرد تھے۔ بارہ برس کی عمر میں ان پر وحشت طاری ہوگئی اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ کیفیت ساتھ سال تک رہی۔ وہ ایک درویش اور باکمال صوفی بزرگ تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد بہ کثرت تھے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اردو کی ایک ضخیم کلیات، فارسی اساتذہ کے کلام کا انتخاب اور ایک مثنوی ”بوستانِ خیال“ ان کی یادگار ہے۔ ولی کے انتقال کے بعد سراجؔ شاعری میں ان کے قائم مقام سمجھے جاتے ہیں۔ سراجؔ اورنگ آباد، ۶۔ اپریل ۱۷۶۳ء کو انتقال کر گئے۔ بحوالہ: پیمانہ غزل (جلد اول)، محمد شمس الحق، صفحہ:47) صوفی شاعر سراجؔ اورنگ آبادی کے یومِ وفات پر منتخب اشعار بطورِ خراجِ عقیدت..

آئی ہے ترے عشق کی بازی دل و جاں پر
اس وقت نظر کب ہے مجھے سود و زیاں پر

آشنائی سیں وگرنہ مجلسِ عشاق میں
ظلم ہے غم ہے قیامت ہے خرابی اے صنم

اس ادب گاہ کو توں مسجد جامع مت بوجھ
شیخ بے باک نہ جا گوشۂ مے خانے میں

تحقیق کی نظر سیں آخر کوں ہم نے دیکھا
اکثر ہیں مال والے کم ہیں کمال والے

ترے سخن میں اے ناصح نہیں ہے کیفیت
زبان قلقل مینا سیں سن کلامِ شراب

جس کوں تجھ غم سیں دل شگافی ہے
مرہم وصل اس کوں شافی ہے

حاکمِ عشق نے جب عقل کی تقصیر سنی
ہو غضب حکم دیا دیس نکالا کرنے

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

دو رنگی خوب نہیں یک رنگ ہو جا

سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا
دیکھا ہے جس نے یار کے رُخسار کی طرف
ہرگز نہ جاوے سیر کو گل زار کی طرف
سنا ہے جب سیں تیرے حسن کا شور
لیا زاہد نے مسجد کا کنارا
عشق کا نام گرچہ ہے مشہور
میں تعجب میں ہوں کہ کیا شے ہے
سراجؔ ان خوب روّیوں کا عجب میں قاعدہ دیکھا
بلاتے ہیں دکھاتے ہیں لبھاتے ہیں چھپاتے ہیں

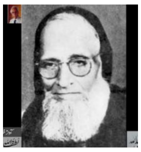

حضرتِ منوّرؔ بدایونی صاحب

شاعر محشرؔ بدایونی 6/اپریل 1984 معروف شاعر محشرؔ بدایونی کے برادر اکبر اور اردو کے ممتاز نعتیہ شاعر ”حضرتِ منورؔ بدایونی صاحب“ کا یومِ وفات...منورؔ بدایونی کا اصل نام ثقلین احمد تھا۔ وہ 2دسمبر 1908ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ان کے شعری مجموعوں میں منورنعتیں،منورغزلیں،منورنغمات اورمنورقطعات کے نام شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کے نعتیہ کلام کی کلیات بھی اشاعت پذیر ہوچکی ہے۔منورؔ بدایونی کے چھوٹے بھائی محشرؔ بدایونی بھی اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔۶۔اپریل ۱۹۸۴ءکومنورؔ بدایونی کراچی میں وفات پاگئے اور عزیز آباد کےقبرستان میں آسودہ ءخاک ہوئے۔ممتازشاعرمنورؔ بدایونی کے یوم وفات پرمنتخب اشعاربطورخراجِ عقیدت...

جو دل کو دے گئی اک درد عمر بھر کے لیے
تڑپ رہا ہوں ابھی تک میں اس نظر کے لیے
اب کُنجِ لحد میں ہوں میسر نہیں آنسو
آیا ہے شب ہجر کا رونا مرے آگے
علاج کی نہیں حاجت دل و جگر کے لیے
بس اک نظر تری کافی ہے عمر بھر کے لیے
نظر آتی ہیں سوئے آسماں کبھی بجلیاں کبھی آندھیاں
کہیں جل نہ جائے یہ آشیاں کہیں اُڑ نہ جائیں یہ چار پر
پیچھے مڑ مڑ کر نہ دیکھو اے منورؔ بڑھ چلو
شہر میں احباب تو کم ہیں سگے بھائی بہت
جب تری شانِ کریمی پہ نظر جاتی ہے
زندگی کتنے مراحل سے گزر جاتی ہے
ہے حشر کا دن حاضرِ دربار ہیں بندے
یا رب تری رحمت کے طلب گار ہیں بندے
جب اپنے حسن کی محفل سجانے کا خیال آیا
چراغِ بزمِ امکاں کو جلانے کا خیال آیا
گئے خلوت میں وہ عرشِ الٰہی کا اُٹھا پردہ
کہ دونوں طالب و مطلوب تھے دونوں میں کیا پردہ
یہ حسرت ہے ترے روضے کو جا کر ہم بھی دیکھیں گے
جبینِ شوق اس در پر جھکا کر ہم بھی دیکھیں گے
دعاؤں میں اثر دے یاالٰہی،مرادیں پوری کردے یاالٰہی
جسے چاہا در پہ بلا لیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے

منورؔ بدایونی

رُخصتیں ملیں جب بھی، رنجشیں بھلا دینا
کون جانے سانسوں کی، مہلتیں کہاں تک ہیں
آؤ جانچ لیتے ہیں، درد کے ترازو پر
کس کے غم کہاں تک ہیں،شدتیں کہاں تک ہیں
ایک شام آ جاؤ، کھل کر حالِ دل کہہ لیں
کون جانے سانسوں کی،مہلتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے، پوچھنا تو پڑتا ہے
آج کل محبت کی، قیمتیں کہاں تک ہیں
فرصتیں ملیں جب بھی، رنجشیں بھلا دینا
کون جانے سانسوں کی، مہلتیں کہاں تک ہیں!!

عرشؔ صدیقی صاحب

افسانہ نگار، نقاد اور ممتاز و معروف شاعر ”عرشؔ صدیقی صاحب“ کا یومِ وفات..نام ارشادالرحمن اور تخلص عرشؔ تھا۔
۱۲ جنوری ۱۹۲۷ءکو گورداسپور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ایم اے (انگریزی) گورنمنٹ کالج، لاہور سے کیا۔پی ایچ ڈی ورلڈ یونیورسٹی اری

زونا (امریکہ) سے کیا۔ پروفیسر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج ملتان، چیئرمین پروفیسر شعبہ انگریزی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان اور رجسٹرار بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۸/اپریل ۱۹۹۷ء کو ملتان میں انتقال کر گئے۔ شاعری کے علاوہ افسانہ اور تنقید بھی لکھتے تھے۔ ان کی تصانیف کے چند نام یہ ہیں' دیدہ یعقوب'، 'محبت لفظ تھا میرا'، 'ہر موج ہوا تیز' (شعری مجموعے)، 'باہر کفن سے پاؤں' (افسانے) پر آدم جی ایوارڈ ملا۔ 'تکوین'، 'محاکمات'، 'شعور'، 'سائنسی شعور اور ہم' (تنقید)۔

(بحوالہ: پیمانہ غزل (جلد دوم) محمد شمس الحق، صفحہ:200)

منیؔر نیازی صاحب

بیسویں صدی میں اردو اور پنجابی زبان کے اہم ترین شاعروں میں شمار، منفرد لب و لہجے کے نامور شاعر ''منیؔر نیازی صاحب'' کا یومِ ولادت۔ نام محمد منیر خاں اور تخلص منیؔر ہے۔ ۹/اپریل ۱۹۲۸ کو خان پور، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں بی اے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے۔ مختلف اخبارات اور جرائد سے وابستہ رہے۔ فلمی نغمہ نگاری کی۔ غزل ان کی بنیادی شناخت ہے۔ پابند اور آزاد نظمیں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں۔ نثری نظمیں بھی لکھتے تھے۔ پنجابی کے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ وہ اردو اور پنجابی کے ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ اردو شاعری کے چند مجموعوں کے نام یہ ہیں: *'تیز ہوا اور تنہا پھول'، 'جنگل میں دھنک'، 'دشمنوں کے درمیان شام'، 'ماہِ منیر'، 'اس بے وفا کا شہر'، 'چھ رنگین دروازے'۔ ان کو یکجا کر کے ''کلیاتِ منیر'، 'غزلیاتِ منیر'، اور 'نظمِ منیر' چھپ گئی ہے۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ انہیں اکادمی ادبیات پاکستان کا 'کمالِ فن' ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں حسن کارکردگی ایوارڈ کے علاوہ دو مرتبہ ستارہ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔

(بحوالہ پیمانہ غزل (جلد دوم) محمد شمس الحق، صفحہ:۲۲۱)

مشہور شاعر منیؔر نیازی کے یومِ ولادت پر منتخب اشعار بطورِ خراجِ عقیدت

اپنی ہی تیغِ ادا سے آپ گھائل ہوگیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہوگیا

خمارِ شب میں اسے میں سلام کر بیٹھا
جو کام کرنا تھا مجھ کو وہ کام کر بیٹھا

غیروں سے مل کے ہی سہی بے باک تو ہوا
بارے وہ شوخ پہلے سے چالاک تو ہوا

غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں

کل میں نے اس کو دیکھا تو دیکھا نہیں گیا
مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی بہت غم سے چور تھا

عبدالحمید عدؔم صاحب

10 اپریل 1910 مقبول عام شاعر، مقبول عوام غزل گو شاعر، زندگی اور محبت پر مبنی رومانی شاعری کیلئے معروف شاعر ''عبدالحمید عدؔم صاحب'' کا یومِ ولادت.. عدؔم، عبدالحمید نام سیّد عبدالحمید، تخلص عدم۔ ۱۰/ اپریل ۱۹۱۰ء کو تلونڈی، موسیٰ خاں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور اکاؤنٹس افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اوائل عمر ہی سے شعر وشاعری کا شوق تھا۔ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ملک سے باہر بھی رہے۔ نظم، غزل، قطعہ میں طبع آزمائی کی، لیکن غزل سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ عدم ایک مقبول عوام غزل گو شاعر تھے۔ ''نقشِ دوام' عدؔم کا اولین مجموعہ کلام تھا۔ اس کے بعد ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ چند نام یہ ہیں خرابات'، 'چارہ درد'، 'زُلفِ پریشاں'، 'سرو سمن'، 'گردشِ جام'، 'شہرِ خوباں'، 'گلنار'، 'عکسِ جام'، 'رم آہو'، 'بط مے'، 'نگارخانہ'، 'سازِ صدف'، 'رنگ و آہنگ'۔ ۱۰ مارچ ۱۹۸۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ مقبول شاعر عبدالحمید عدؔم کے یومِ ولادت پر منتخب اشعار بطورِ اظہارِ عقیدت

آنکھ کا اعتبار کیا کرتے
جو بھی دیکھا وہ خواب میں دیکھا

آنکھوں سے پلاتے رہو ساغر میں نہ ڈالو
اب ہم سے کوئی جام اُٹھایا نہیں جاتا

اجازت ہو تو میں تصدیق کر لوں تیری زلفوں سے
سنا ہے زندگی اک خوبصورت دام ہے ساقی

اک حسیں آنکھ کے اشارے پر
قافلے راہ بھول جاتے ہیں

اے دوست محبت کے صدمے تنہا ہی اٹھانے پڑتے ہیں
رہبر تو فقط اس رستے میں دو گام سہارا دیتے ہیں

اے غمِ زندگی نہ ہو ناراض
مجھ کو عادت ہے مسکرانے کی

بارش شراب عرش ہے یہ سوچ کر عدم
بارش کے سب حروف کو اُلٹا کے پی گیا

بعض اوقات کسی اور کے ملنے سے عدمؔ
اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے

پہلے بڑی رغبت تھی ترے نام سے مجھ کو
سن کے ترا نام میں کچھ سوچ رہا ہوں

آوارگی کا شوق بھڑکتا ہے اور بھی
تیری گلی کا سایہ دیوار دیکھ کر

آنکھوں کے تصادم میں حکایات کی دنیا
ہونٹوں کے تصادم میں خرابات کا عالم

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

توبہ کا تکلف کون کرے حالات کی نیت ٹھیک نہیں
رحمت کا ارادہ بگڑا ہے برسات کی نیت ٹھیک نہیں

خالی ہے ابھی جام میں کچھ سوچ رہا ہوں
اے گردشِ ایّام میں کچھ سوچ رہا ہوں

تکلیف مٹ گئی مگر احساس رہ گیا
خوش ہوں کہ کچھ نہ کچھ تو مرے پاس رہ گیا

جن سے انساں کو پہنچتی ہے ہمیشہ تکلیف
ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اصل خدا والے ہیں

جیب خالی ہے عدمؔ مے قرض پر ملتی نہیں
ایک دو بوتل پہ دیواں بیچنے والا ہوں میں

دروغ کے امتحاں کدے میں سدا یہی کاروبار ہوگا
جو بڑھ کے تائید حق کرے گا وہی سزاوار دار ہوگا

سو بھی جا اے دلِ مجروح بہت رات گئی
اب تو رہ رہ کے ستاروں کو بھی نیند آتی ہے

ساقی مجھے شراب کی تہمت نہیں پسند
مجھ کو تری نگاہ کا الزام چاہیئے

شیخ امام بخش ناسخؔ صاحب

لکھنؤ کے ممتاز اور رجحان ساز کلاسیکی شاعر غالبؔ کے ہم عصر، بانی زبان دان دبستانِ لکھنو اور زبان شناس مقبول استاد شاعر ''شیخ امام بخش ناسخؔ صاحب'' کا یومِ ولادت..نام شیخ امام بخش، ناسخ تخلص۔ ۱۰/اپریل 1772ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمی خدا بخش خیمہ دوز نے، جو لاہور کا ایک دولت مند سوداگر تھا اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی، ان کو متبنّیٰ بنالیا تھا۔ ناسخ سے اسے اولاد کی طرح محبت تھی اور ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا۔ محمد عیسیٰ جو مصحفی کے شاگرد تھے ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن وتوش اور قوی ہیکل آدمی تھے۔ خوراک بہت تھی۔ تمام عمر مجرد رہے۔ بہت وضع دار آدمی تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔ بادشاہ موصوف ان کو دربار سے متعلق کرنا چاہتے تھے اور ملک الشعرا کا خطاب دینا چاہتے تھے۔ ناسخ نے خطاب قبول نہیں کیا۔ بادشاہ کو غصہ آ گیا اور ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اگست 1838ء کو انتقال کر گئے۔ دو دیوان ان کی یادگار ہیں۔

وزیرؔ، بحرؔ، برقؔ، رشکؔ، منیرؔ ان کے شاگرد تھے۔ ناسخ کو دبستان لکھنؤ کا بانی زبان دان اور زباں شناس کہا گیا ہے۔ تاریخ گوئی میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ ممتاز شاعر امام بخش ناسخؔ کے یوم ولادت پر منتخب اشعار بطورِ خراجِ عقیدت۔

آنے میں سدا دیر لگاتے ہی رہے تم
جاتے رہے ہم جان سے آتے ہی رہے تم

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا
انگڑائی اس نے نشے میں لی جب اٹھا کے ہاتھ

دیکھ کر تجھ کو قدم اٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں
فُرقتِ یار میں انسان ہوں میں یا کہ سحاب
ہر برس آکے رلا جاتی ہے برسات مجھے

ساحرلدھیانوی

دنیا سے وابستگی ان کی عوام تک پہنچنے کی اسی خواہش کی آئینہ دار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ساحرفلمی دنیا میں اپنی آئیڈیالوجی ساتھ لے کرآئے، اور دوسرے ترقی پسند نغمہ نگاروں کے مقابلے میں انھیں اپنی آئیڈیالوجی کوعوام تک پہنچانے کے مواقع بھی زیادہ ملے، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انھوں نے جن فلم سازوں کے ساتھ زیادہ کام کیا وہ خودترقی پسندانہ خیالات کے مالک تھے۔ اس سلسلے میں گرودت، بی آر چوپڑااورویش راج چوپڑا کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ میں صرف ایک مثال دوں گا مقبول شاعر۔ ساحرکتنے بااثر فلمی شاعر تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کم ازکم دوایسی انتہائی مشہورفلموں کے گانے لکھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی کہانی ساحرکی اپنی زندگی سے ماخوذتھی۔ ان میں گرودت کی پیاسااورویش راج کی کبھی کبھی شامل ہیں۔ پیاسا کے گانے تو درجہ اول کی شاعری کے زمرے میں آتے ہیں:

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے
اور یہ گانا جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا

اسی طرح کبھی کبھی میں ”کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے ” کے علاوہ“ میں پل دوپل کا شاعر ہوں“ ایسے گانے ہیں جوصرف ساحرہی لکھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی اور فلمی شاعرکو یہ چھوٹ نہیں ملی کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی پر مبنی نغمے لکھے۔

بی گریڈ موسیقار۔ بعد میں انہوں نے کئی بی گریڈ موسیقاروں کے ساتھ کام کیا، جن میں خیام کے علاوہ روّی، این دتا اور جے دیو شامل ہیں۔ اوران درجہ دوم کے موسیقاروں کے ساتھ بھی ساحؔر نے کئی لافانی نغمے تخلیق کیے، جیسے روّی کے ساتھ ”ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی“، ”نیلے گگن کے تلے“، ”چھو لینے دو نازک ہونٹوں کو“ وغیرہ، این دتا کے ساتھ ”میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی“، ”میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں“ اور ”دامن میں داغ لگا بیٹھے“، وغیرہ اور جے دیو کے ساتھ ”ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں“، ”میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا“، ”رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی“ وغیرہ شامل ہیں۔

مجروح شکیل بدایونی اورساحر

ساحراورمجروح سلطان پوری کا نام اکثر ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے،لیکن میرے خیال سے دونوں شعرا کا پس منظرایک جیسا ہونے کے باوجودساحرمجروح سے کہیں بہترفلمی شاعر تھے۔ مجروح کی فلمی نغمہ نگاری اکثرکھوکھلی نظرآتی ہے، وہ شاعری کے ادبی پہلو سے مکمل انصاف نہیں کر پاتے۔ جوکام ساحر بہت سہولت سے کرگزرتے ہیں، وہاں اکثر مجروح کی سانس قدم اُکھڑنے لگتی ہے۔ مجروح کی فلمی بولوں کی ایک نمایاں بات یہ ہے کہ وہ سننے میں بہت بھلے لگتے ہیں لیکن جوں ہی کاغذ پر لکھے جائیں، ان میں عیب نظرآنے لگتے ہیں۔ اس کے مقابلے پرساحرکی فلمی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نک سک سے درست اور عام طور پرادبی لحاظ سے بےعیب ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ کاغذ پرلکھنے کے معیار پربھی پورا اترتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اورفلمی گیت نگار کے گیتوں کے اتنے ایڈیشن نہیں چھپے جتنے ساحرکے ”گاتا جائے بنجارا“ اور ”گیت گاتا چل“ کے۔ ایک اور فلمی شاعرشکیل بدایونی ہیں جن کا نام ساحرکے ساتھ لیا جاتا ہے۔لیکن دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ شکیل کے ہاں بعض جگہ عروض کی غلطیاں بھی نظرآتی ہیں، مثال کے طور پروہ لفظ ”نہ“ کو بروزنِ ”نا“ بھی باندھ جاتے ہیں، جوعروض کے اعتبار سے غلط ہے۔ اس کے علاوہ شکیل کے ہاں زبان و بیان کی کوئی تازگی نظرنہیں آتی، وہی لگی بندھی تشبیہات، پامال استعارات اور استعمال شدہ ترکیبوں کی بھرمارشکیل کا خاصہ ہے۔

ساحرلدھیانوی پر لکھے گئے مقالات

* ۔ مقالات پی ایچ ڈی: ساحرلدھیانوی: حیات اورشاعری، ڈاکٹرضیاء الدین نگران ڈاکٹرمحمد مطیع الرحمٰن، للت نرائن متھلا یونیورسٹی۔ دربھنگہ، 1989ء۔

* ۔ ساحرلدھیانوی: حیات اور شاعری، ڈاکٹر آنسہ پروین نگران ڈاکٹر افغان اللہ خاں۔ دین دیال اپادھیائے یونیورسٹی۔ گورکھپور، 1999ء

*۔ساحرلدھیانوی اور معاصر شعراء۔ ایک جائزہ، ڈاکٹر عبدالرؤف شاد نگران ڈاکٹر یونس غازی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی۔ میرٹھ، 2003ء

*۔مقالات ایم فل ساحر: شخص اور شاعر، انور ظہیر نگران ڈاکٹر اسلم پرویز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی۔ دہلی، 1988ء

*۔کِتابیات۔ تنہائیاں، ساحر لدھیانوی، لاہور، جہانگیر سنز بک سیلرز سرخ ستارہ، قومی دارالاشاعت، ت ن ص 39

*۔تلخیاں، ساحرلدھیانوی، لاہور، مکتبہ دستور، 1958ء

*۔مضامین محمد علی صدیقی، کراچی، ادارہ عصرِ نو، 1991ء ص 237

*۔سُرورِ رفتہ، امیر چند بہار، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 1998ء ص 257

*۔نکہتِ اُردو، پروفیسر درخشاں کاشف، کراچی، قمر کتاب گھر، 2004ء ص 255

*۔جامعات میں اُردو تحقیق، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اسلام آباد، ہائر ایجوکیشن کمیشن، 2008ء ص 156

کِتابیات (ساحرشناسی)

*۔ساحر: شخص اور شاعر، ناز صدیقی، دہلی، سٹار پبلی کیشنز، 1978ء، 191 ص

*۔ساحر اور اُس کی شاعری، پرکاش پنڈت، دہلی، سٹار پبلی کیشنز، 140 ص

*۔ساحرلدھیانوی: ایک مطالعہ، مخمور سعیدی

شکیب جلالی

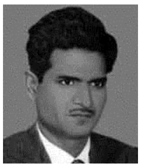

اصل نام۔ سید حسن رضوی۔ یکم اکتوبر 1934ء کو اُتر پردیش کے علی گڑھ کے ایک قصبے سیدانہ جلال میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے شعور کی آنکھیں بدایوں میں کھولیں جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔ لیکن والدہ کی حادثاتی موت نے سید حسن رضوی کے ذہن پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ شکیب جلالی بن گئے۔ انہوں نے 15 یا 16 سال کی عمر میں شاعری شروع کر دی اور شاعری بھی ایسی جو لو دیتی تھی جس میں آتش کدے کی تپش تھی۔ شکیب جلالی پہلے راولپنڈی اور پھر لاہور آ گئے یہاں سے انہوں نے ایک رسالہ ''جاوید'' نکالا۔ لیکن چند شماروں کے بعد ہی یہ رسالہ بند ہو گیا۔ پھر ''پاکستان'' نام کے سرکاری رسالے سے وابستہ ہوئے۔ مغربی پاکستان چھوڑ کر کسی اور اخبار سے وابستہ ہو گئے۔

خودکشی۔ تعلقاتِ عامہ کے محکمے میں بھی انہیں ایک ذمہ دارانہ ملازمت مل گئی۔ لیکن وہ ان سب چیزوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی شاعری ویسے ہی شعلہ فشانی کرتی رہی اور پھر احساسات کی اس تپش کے آگے انہوں نے سپر ڈال دی اور محض 32 سال کی عمر میں سرگودھا اسٹیشن کے پاس ایک ریل کے سامنے کود کر خودکشی کر لی اور اس طرح شعلوں سے لہلہاتے ہوئے ایک شاعر کا خاتمہ ہو گیا۔ موت کے بعد ان کی جیب سے یہ شعر ملا:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

نمونہ کلام::

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے
ستارے مشعلیں لے کر مجھے بھی ڈھونڈنے نکلے
میں رستہ بھول جاؤں جنگلوں میں شام ہو جائے
گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت جیسا تھا

فیض احمد فیض

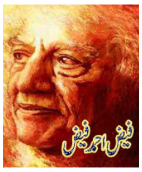

فیض احمد فیض کا نام شعر و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا 99واں یوم پیدائش ہفتہ 13 فروری کو ہے۔ اردو ادب کے بہت سے ناقدین کے نزدیک فیض احمد فیض غالب اور اقبال کے بعد اُردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ میر غالب اور اقبال کے بعد جو داد و تحسین اور مقبولیت ان کے حصے میں آئی وہ شاید ہی کسی کے نصیب میں آئی ہو۔ فیض ایک لازوال شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی نثر بھی با کمال اور منفرد اسلوب کی حامل ہے۔ فیض نے شاعری شروع کی تو اس وقت بہت سے قد آور شعراء موجود تھے جن کے درمیان خود کو منوانا آسان کام نہ تھا۔ جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ لیکن فیض کے منفرد انداز نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان کی شعری تصانیف میں نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ، شام شہر یاراں سر وادیِ سینا، مرے دل مرے مسافر اور نسخہ ہائے وفا شامل ہیں۔ فیض انگریزی، اردو اور پنجابی کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے ان زبانوں کی کلاسیکی شاعری سے براہ راست

استفادہ کیا۔اردو کی کلاسیکی شاعری پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔وہ 13 فروری 1911 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔انجمن ترقی پسند تحریک کے فعال رکن اور ایک ممتاز کمیونسٹ رہے۔فیض احمد فیض نے 1930 میں لبنانی شہری ایلس سے شادی کی۔وہ بھی شعبۂ تحقیق سے وابستہ تھیں اور فیض کی شاعری اور شخصیت سے متاثر تھیں۔فیض نے 1935 میں ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت کی پھر 1942 میں فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے شامل ہو گئے اور فوج کے محکمۂ تعلقات عامہ میں کام کیا۔1943 میں میجر اور پھر 1944 میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا گئے۔1947 میں انھوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا اور 1959ء میں پاکستان آرٹس کونسل میں سیکریٹری تعینات ہوئے پھر 1962 تک وہیں کام کیا۔اس کے علاوہ ادبی رسالہ ادبِ لطیف کے مدیر اور اس کے بعد روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ۹/مارچ 1951ء کو فیض احمد فیض راولپنڈی سازش کیس میں معاونت کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے۔انہوں نے چار سال سرگودھا، ساہیوال، حیدرآباد اور کراچی کی جیل میں گزارے۔دو اپریل 1955 کو انہیں رہا کر دیا گیا۔کلاسیکی شعراء کی گہری چھاپ ان کے ہاں نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی کی تند و تیز آندھی میں بھی ان کی شاعری کا معیار برقرار رہا۔ ایک کامیاب اور نشیب و فراز سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد فیض احمد فیض 20 نومبر 1984 کو انتقال کر گئے۔

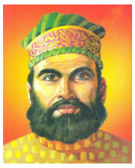

مرزا داغ دہلوی

پورا نام نواب مرزا خاں اور تخلص داغ تھا۔25 مئی 1831ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ابھی چھ سال ہی کے تھے کہ ان کے والد نواب شمس الدین خاں کا انتقال ہو گیا۔آپ کی والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے شادی کر لی۔اس طرح داغ قلعہ معلیٰ میں باریاب ہوئے ان کی پرورش وہیں ہوئی۔بہادر شاہ ظفر اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے۔لہٰذا داغ کو بھی ذوق سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔داغ کی زبان بنانے اور سنوارنے میں ذوق کا یقیناً بہت بڑا حصہ ہے۔غدر کے بعد رام پور پہنچے جہاں نواب کلب علی خان نے داغ کی قدردانی فرمائی اور باقاعدہ ملازمت دے کر اپنی مصاحبت میں رکھا۔داغ چوبیس سال تک رام پور میں قیام پذیر رہے۔اس عرصے میں انہوں نے بڑے آرام و سکون اور عیش و عشرت میں وقت گزارا یہیں انہیں ’’حجاب‘‘ سے محبت ہوئی اور اس کے عشق میں کلکتہ بھی گئے۔مثنوی فریادِ عشق اس واقعۂ عشق کی تفصیل ہے۔نواب کلب علی خان کی وفات کے بعد حیدر آباد دکن کا رُخ کیا۔نظام دکن کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔دبیر الدولہ۔فصیح الملک،نواب ناظم جنگ بہادر کے خطاب ملے۔1905ء میں فالج کی وجہ سے حیدر آباد میں وفات پائی۔داغ کو جتنے شاگرد میسر آئے اتنے کسی بھی شاعر کو نہ مل سکے۔اس کے شاگردوں کا سلسلہ ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔اقبال، جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی اور احسن مارہروی جیسے معروف شاعروں کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

محمد ابراہیم ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق (1789 1854) ایک اردو شاعر تھے۔ذوق ان کا تخلص تھا۔ابتدائی زندگی۔دبستان دہلی میں ذوق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔محمد ابراہیم نام اور ذوق تخلص تھا۔ایک غریب سپاہی محمد رمضان کے لڑکے تھے۔1789ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔پہلے حافظ غلام رسول کے مکتب میں تعلیم پائی۔حافظ صاحب کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ذوق بھی شعر کہنے لگے۔اس زمانے میں شاہ نصیر دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ذوق بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔دل لگا کر محنت کی اور ان کی شاعرانہ مقبولیت بڑھنے لگی۔بہت جلد علمی و ادبی حلقوں میں ان کا وقار اتنا بلند ہو گیا کہ قلعہ معلیٰ تک رسائی ہو گئی۔اور خود ولی عہد سلطنت بہادر شاہ ظفر ان کو اپنا کلام دکھانے لگے۔شاہ اکبر ثانی نے ایک قصیدہ کے صلہ میں ملک الشعراء خاقانی ہند کا خطاب مرحمت فرمایا۔شروع میں چار روپے ماہانہ پر ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔آخر میں یہ تنخواہ سو روپیہ تک پہنچ گئی۔مسلسل عروسِ سخن کے گیسو سنوارنے کے بعد 16 نومبر 1854ء میں دنیائے ادب کا یہ مہرِ درخشاں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔مرنے سے چند ساعت پہلے یہ شعر کہا تھا۔

کہتے آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق کو عربی فارسی کے علاوہ متعدد علوم موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔طبیعت میں جدّت و ندرت تھی۔تمام عمر شعر گوئی میں بسر کی۔

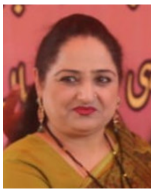

روبینہ ممتاز

تعارف: نام،روبینہ ممتاز۔قلمی نام: روبی۔تاریخ پیدائش: 25 نومبر سنہ 1964۔جائے پیدائش لاہور۔مستقل رہائش: کراچی۔پیشہ تدریس۔شعبہ:حیاتیات(سرپرست)رابطہ نمبر: 03472088067۔مکمل پتہ:مکان نمبر 8،943عزیز آباد، فیڈرل بی ایریا،کراچی

rubinamumtaz8@gmail.com

سماجی سرگرمیاں:

بیوروچیف ماہنامہ روابط انٹرنیشنل میگزین۔

۲۔بیوروچیف ادبی تنظیم انجمن۔تسکینِ ذوق

۳۔رکن ادبی تنظیم بزمِ اساتذہ ءاردوسندھ۔

۴۔رکن ادبی سہ ماہی رسالہ ارمغانِ ادب اسلام آباد

۵۔رکن بین الاقوامی ادبی تنظیم الفانوس۔

۶۔رکن ادبی تنظیم شہر۔قائد ادبی فورم۔نائب صدر ادبی تنظیم یارانِ نمک دان۔شاعرہ وادیبہ۔

تصانیف: 1۔مسکراتی تلخیاں (شعری مجموعہ)۲۔روبی (شعری مجموعہ)منتخب کلام:

غزلیات

زخم کھاتی ہوں، مسکراتی ہوں
یوں غم زندگی نبھاتی ہوں
روز کرتا ہے وہ جفا مجھ پر
اور میں روز بھول جاتی ہوں
ہوں بکھرتی میں روز ہی لیکن
روز خود کو سمیٹ لاتی ہوں

دھوپ خوشیوں کی بڑھ گئی ہے بہت
غم کا پھر سائبان کر دیجیے
چشم نم کھول دے نہ راز مرا
مجھ کو پھر بے زبان کر دیجیے
تخم خواہش نہ جس میں اگ پائے
بانجھ وہ گلستان کر دیجیے

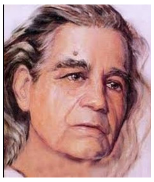

علی سردار جعفری

29 نومبر 1913 مشہور و معروف شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار علی سردار جعفری کا یوم پیدائش ہے۔

علی سردار جعفری اتر پردیش کے گونڈہ ضلع میں بلرامپور میں 29 نومبر 1913ء میں پیدا ہوئے تھے۔انہوں نے لکھنؤ میں ایک مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی۔تعلیمی اعتبار انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا تھا جعفری کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ آٹھ سال کی عمر میں وہ انیس کے مرثیوں میں سے 1000 اشعار روانی سے پڑھتے تھے۔وہ صرف پندرہ برس کے تھے جب انہوں نے خامہ فرسائی شروع کی تھی.انہوں نے ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا تھا۔

1938 میں ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ منزل شائع ہوا تھا۔مگر اس کے بعد انہوں نے شاعری کا رُخ کیا۔علی سردار جعفری نے انقلابی اور حب الوطنی سے جڑی شاعری کی تھی جس کے سبب 1940 میں گرفتار ہوئے تھے۔وہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک رکن کے طور پر کام کرتے تھے اور اس کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں مستعدی سے اپنی شاعری کے ذریعے، وہ عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے.شاعری کے علاوہ جعفری ڈرامے اور افسانہ نگاری میں بھی خاصا عبور رکھتے تھے۔وہ ممبرء سے چھپنے والے سہ ماہی نیا ادب کے مدیر تھے۔وہ شیکسپئر کی کچھ تحریروں کا اردو میں کامیاب ترجمہ کر چکے تھے۔ ہندی اور اردو میں حد فاصل کو گھٹانے کے ایک تجربے کے طور پر انہوں نے چار روایتی شعرا غالب، میر، کبیر اور میرا کے کلاموں کو ایک ہی کتاب میں یک جا کیا تھا۔ جعفری کو ان کی ادبی خدمات کی وجہ سے 67 میں پدما شری کا قومی اعزاز دیا گیا تھا۔علی سردار جعفری اپنی آپ بیتی کی ابتدا یوں کرتے ہیں ”مجھے انسانی ہاتھ بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے“ پھر کہتے ہیں ”میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے۔اس لیے جب قلم جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو

گئے ، میں ہر ادیب سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کرے گا کیوں کہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔'' شمالی ہند میں ہمالیہ کی ترائی کے دامن میں ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست بلرام پور تھی، علی سردار جعفری کا خاندان یہاں آباد تھا۔ یہ بڑا ایمان دار، مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا۔ محرم بڑے جوش سے مناتے تھے، مجلسیں ہوتی تھیں، علی سردار لکھتے ہیں ''میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علما اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیے ہیں'' یہ اس ماحول کا اثر تھا کہ پانچ چھ برس کی عمر سے وہ منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگے۔ پندرہ سولہ کی عمر میں خود مرثیے کہنے لگے، مرثیے کہنے کے ساتھ ساتھ علی سردار جعفری حدیث خوانی بھی کرتے تھے اس لیے روایات اور قرآن کی بہت سی آیات انھیں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ لکھتے ہیں ''ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا، انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔'' اس زمانے میں چند سوالات نے سردار جعفری کو بہت بے چین کیا اور پھر ان سوالات نے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ لکھتے ہیں ''مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے لیکن اس سوال نے ہمیشہ بے چین رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے؟ اس سوچ کی ابتدا میرے بچپن ہی میں ہو گئی تھی'' سردار جعفری سوچتے تھے کہ یہ غریب، محتاج، ٹوٹے پھوٹے چہروں کے لوگ، دکھی دلوں کے مالک کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں؟ ان پر مظالم کیوں ہو رہے ہیں؟ اس پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا؟ اس ذہنی کیفیت میں وہ 1933ء میں علی گڑھ پہنچے، اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی چونکہ انھوں نے ابتدائی چند سال عربی اور فارسی کی تعلیم میں گزارے تھے، پھر انگریزی اسکول میں داخلہ لیا تھا، اس لیے تعلیم کے اعتبار سے جب وہ انٹر میں تھے تو ان کے ہم عمر بی اے اور ایم اے کے طالب علم تھے۔ علی سرداری جعفری جس زمانے میں علی گڑھ پہنچے اس وقت ترقی پسند تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے اور ادب اور سیاست ایک ہو رہے تھے۔ اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، حیات انصاری، سعادت حسن منٹو، جان نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے بعد میں عصمت چغتائی اور جذبی بھی وہاں پہنچ گئے، مجاز سے بھی ان کی اسی زمانے میں ملاقات ہوئی تین سال وہاں گزارے تھے کہ حکومت کے خلاف طلبا کی ہڑتال میں شریک ہونے پر یونیورسٹی سے نکال دیے گئے، کچھ دن بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں پہلے ایل ایل بی میں اور پھر ایم اے (انگلش) میں داخلہ لیا، اس وقت لکھنؤ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

جنگ عظیم کے دوران ممبئی کمیونسٹ پارٹی کا مرکز بن گیا، سردار جعفری بھی پارٹی کے کل وقتی ممبر بن کر ممبئی چلے گئے اور وہاں پارٹی کے اخبار میں کام کرنے لگے۔ ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ ممبئی کے دوران قیام وہ دو مرتبہ گرفتار بھی ہوئے، وہیں ان کی سلطانہ سے شادی ہوئی دونوں کمیون میں رہتے تھے بڑی سادہ زندگی تھی۔ برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے نظریے اور اس کے اغراض و مقاصد کو پھیلانے کی مہم میں سردار جعفری کا نہایت اہم حصہ ہے، صدیق رحمان قدوائی لکھتے ہیں۔ ''کمیونسٹ پارٹی سے ان کے گہرے تعلق کی بنا پر وہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے اردو ادب میں ترقی پسند اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان رابطے مضبوط کیے اور پارٹی اور ادبی تحریک ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔'' اپنی عمر میں علی سردار جعفری نے آزادی کے خواب دیکھے اور ان کو ٹوٹتا ہوا بھی دیکھا۔ اشترا کی انقلاب کی آرزو کے ساتھ سوویت یونین کا عروج و زوال بھی دیکھا۔ ترقی پسند تحریک کا ہندوستان کے ادبی منظر نامے پر حاوی ہونا دیکھا اور پھر نظریاتی بکھراؤ کے ساتھ اس کا وہ زور بھی ٹوٹتے دیکھا۔ بقول گوپی چند نارنگ تاریخی اعتبار سے کتنے ہی نشیب و فراز آئے لیکن سردار جعفری کے کمٹمنٹ میں کمی نہیں آئی۔ ان کی شاعری کی امتیازی اقدار انسان دوستی، حریت پسندی اور وطن پرستی تھیں۔ وہ عوام کے دکھ درد کے ترجمان اور سماجی انصاف کے علم بردار تھے۔ اپنی شاعری کے بارے میں علی سردار جعفری اپنے مضمون ''میں اور میرا فن'' میں لکھتے ہیں۔ ''میں شاعری کو بنیادی طور پر گانے کی چیز یا بلند آواز سے پڑھنے اور سنانے کی چیز سمجھتا ہوں، شاعری کے جوہر اس کے بغیر نہیں کھل سکتے، لیکن اس کے باوجود شاعری کو اس قابل ہونا چاہیے کہ کاغذ کے صفحے پر چھپ سکے اور خاموشی سے پڑھی جا سکے اور صدیوں کا سفر طے کر سکے لیکن کاغذ پر پڑھنے میں بھی الفاظ کا آہنگ اور لحن، تخلیق کا صوتی تلاطم اور ترنم روح کو محسوس ہوتا ہے، خاموشی سے پڑھنے میں بھی انسان کے دل و دماغ لفظ کی آواز کو سنتے ہیں۔ شاعری اس حد تک مقصود

بالذات ہے کہ اس کی تخلیق میں کرب کے باوجود ایک لذت ہے اور یہ لذت شاعر کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ شاعر کا موضوع زندگی کا کرب و نشاط ہے، انسانی دکھ اور سکھ میں میری شاعری میں محنت کش ہاتھوں کی قصیدہ خوانی ہے۔'' علی سردار جعفری نے اپنی شاعری کی تخلیق میں جس کرب کا ذکر کیا ہے وہ ان کے ان تین شعروں میں عیاں ہیں، یہ شاعر کا مقدر ہے اور ہر شاعر کو اس سے گزرنا پڑتا ہے۔

ابھی ابھی میری بے خوابیوں نے دیکھی ہے
فضائے شب میں ستاروں کی آخری پرواز
خبر نہیں کہ اندھیرے کے دل کی دھڑکن ہے
یا آ رہی ہے اُجالے کے پاؤں کی آواز
بتاؤں کیا تجھے نغمے کے درد کا عالم
لہو لہان ہوا جا رہا ہے سینۂ ساز

علی سردار جعفری ممبئی میں یکم اگست 2000 میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔

منتخب کلام

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں کوچۂ قاتل کے سوا
باعث رشک ہے تنہا روی رہ روئے شوق
ہم سفر کوئی نہیں دورٔ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اُٹھایا دل کو
لیکن ایک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا

اسحاق ساجد (جرمنی)

شہزادہ قمرالدین مبشر گلاسگو

لسانی تعصّبات، ریشہ دوانیوں، سازشوں اور اپنوں کے منفی رویوں کا شکار ہونے کے باوجود اردو نہ صرف آج بھی زندہ و پائندہ ہے بلکہ اس کی جڑیں نئے نئے منطقوں میں بھی پیوست ہونے لگی ہیں جنہیں اردو کی نئی بستیوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو۔ کی ہمہ گیریت کا یہ روشن ثبوت ہے۔ یہ امر طمانیت بخش ہے کہ ان نئی بستیوں میں آباد اردو کی شخصیتیں زبان اردو کی ترویج وفروغ کیلئے ہمہ تن مصروف کار ہیں۔ ان ہی محترم شخصیتوں میں اسحاق ساجد صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے جو جرمنی میں آباد ہیں اور سہ ماہی رسالہ ''سمند'' کے ذریعہ دیار مغرب میں بھی اردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ پورا نام محمد اسحاق ساجد ہے۔ کچھ عرصہ تک آئی ایم ساجد کے نام سے بھی لکھتے رہے لیکن اب اسحاق ساجد ہی ان کی مستحکم شناخت ہے 30 اپریل 1964ء کو جھنگ (پاکستان) میں ولادت ہوئی۔ نفسیات میں ایم۔اے کیا اور روشن مستقبل کا سنہرا خواب آنکھوں میں سجائے 1990ء کو جرمنی آ گئے جہاں ایک جرمن فرم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں اور ساتھ ہی تخلیقی عمل بھی جاری ہے۔ یوں تو نویں کلاس سے شاعری شروع کردی تھی مگر ۱۹۸۰ کے آتے آتے ان کی پہچان مستحکم ہونے لگی اور تبھی سے ہندو پاک اور یورپی ممالک کے بیشتر ادبی رسائل میں ان کی نثری وشعری تخلیقات تواتر سے زینت بن رہی ہیں۔ افسانے، نظمیں اور گیت بھی لکھتے ہیں لیکن غزل ہی ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ 2007ء میں اولین شعری مجموعہ ''جمال دوست'' منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکا ہے۔ گیتوں کا مجموعہ ''گیت میرے میت'' اسی سال ۲۰۰۸ میں متوقع ہے جبکہ افسانوی مجموعہ ''منظر دھواں دھواں'' آئندہ سال منظر عام پر آئیگا۔ شاعری میں سلاستِ زبان وبیان، مانوس لفظیات اور اسلوب بیان کی شائستگی کا انہوں نے خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی شاعری۔ پر کسی بھی ازم کی چھاپ۔ نہیں اسلئے جہاں کلاسیکی شعریات کی جمال آفرینی ہے وہیں جدید تر شعری رجحانات بھی ان کی عصری آگہی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان کی شاعری تہذیبی رویوں سے گزرتی ہوئی عہد حاضر کے سلگتے مسائل کا ایک ایسا معمورہ بن گئی ہے جس میں زندگی کی جمال وجلال اور اس کے نشیب وفراز کے سبھی پہلو عکس ریز ہیں۔ شامل مجموعہ غزل ان کے احساس جمال کی آئینہ دار ہے جس میں سلاست و سادگی بھی ہے اور جمالیاتی اقدار کے روشن پہلو بھی دامن کھینچتے ہیں۔

اللہ کی قدرت

حضرت آدمؑ :- بغیر ماں باپ کے پیدا کیا۔
حضرت نوحؑ :- دنیا کو ختم کر کے صرف اللہ کو ماننے والوں کو بچایا۔
حضرت ابراہیمؑ :- ۴۰ دن اگ میں رکھ کر حفاظت کی۔
حضرت اسمٰعیلؑ :- ذبح ہونے سے بچایا، اور آب زم زم کا تحفہ دیا۔
حضرت یونسؑ :- ۴۰ دن مچھلی کے پیٹ میں رکھ کر حفاظت کی۔
حضرت زکریاؑ :- بڑھاپے میں بیٹا ہونے کی خوشخبری سنائی۔
حضرت داودؑ :- لوہے کو موم کی طرح نرم کر دیا۔
حضرت سلیمانؑ :- تمام انسان، جن، چرند، پرند، ہوا، پانی پر بادشاہت دی۔
حضرت صالحؑ :- پہاڑ میں سے اونٹنی نکالی، اور اس نے باہر آ کر بچہ جنا۔
حضرت عزیزؑ :- ۱۰۰ سال تک سلایا، اور کھانا گرم رکھا۔
حضرت یوسفؑ :- غلامی کی زندگی میں جیل بھیجا، اور اسی ملک کا بادشاہ بنایا، خوابوں کی تعبیر جیسی دولت عطا کی۔

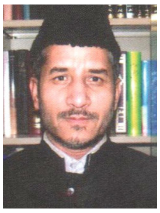

قریشی داؤد احمد ساجدؔ

(شہزادہ قمرالدین مبشر گلاسگو۔ اسکاٹ لینڈ)

''سرراہ چلتے چلتے'' کی روشنی میں قریشی داؤد احمد ساجد کا خمیر سیالکوٹ کے گردونواح کی اس مردم خیز مٹی سے اُٹھا ہے جس نے آفاق ادب کو فیض و اقبال جیسے گوہر آبدار و تابدار عطا کئے۔ موصوف کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں مذہب سے عقیدت، علم سے رغبت اور شعر و ادب سے چاہت ہوتی ہے۔ آپ کو مغربی افریقہ کے ملک گھانا (غانا) میں فروغ۔ اسلام کیلئے کی جانیوالی جدوجہد میں سات سال سے زیادہ عرصہ تک خدمت کی توفیق ملی۔

اس کے بعد لندن اور مانچسٹر میں خدمات سر انجام دینے کے بعد آجکل واسکاٹ لینڈ کے تاریخی شہر گلاسگو میں خدمت کی توفیق پا رہے ہیں۔ آپ ایک وسیع المشرب، کشادہ ذہن، منکسر المزاج، دردمند، روادار، خوش رفتار، خوش گفتار اور انسانیت نواز قسم کے صاحب کردار انسان واقع ہوئے ہیں۔ انہیں زمانۂ طالبعلمی سے ہی شعر و شاعری کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد فرصت کے لمحات میں وہ شاعری بھی کرتے رہے۔ شہرت اور نام و نمود سے کوئی دلچسپی نہ ہونے کے سبب وہ شاعروں اور شعری نشستوں سے عام طور پر خود کو فاصلہ پر ہی رکھتے ہیں لیکن اگر باصرار مشاعرے کی محفلوں میں مدعو کیا جائے تو بشکر یہ خودسپردگی بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی چند نظمیں اور غزلیں آفاق ادب میں ان کی شناخت نامہ بن چکی ہیں۔ میں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ایوانوں میں بھی ان کے مداحوں کو ان کی تعریف کرتے سنا ہے۔

راقم السطور ان کے مداحوں میں سے ایک ہے اپنے علم و ادب کے پروگرام جو کہ گلاسگو کے ریڈیو آواز ایف ایم سے نشر ہوتا ہے گاہے گاہے ان کا کلام پیش کرتا ہے۔ ان کے مداح اکثر ان کا کلام نشر کرنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ان کے گلاسگو آنے سے قبل رسائل اور اخبارات میں ان کی شعری تخلیقات سے متاثر ہو کر ایک وقت میں ان سے ملاقات کا متمنی رہا ہوں۔ علمی اور مذہبی نوعیت کی ترجیحی مصروفیت میں گم رہتے ہوئے ادبی قسم کی تخلیقی سرگرمیوں۔ کا مظاہرہ کرنے کیلئے انہیں بہت کم وقت نصیب ہوتا ہے۔ تنگی اوقات کے باوجود۔ انہوں نے جو شعری و ادبی سرمایہ اردو ادب کو دیا ہے وہ کسی معرکہ سے کم نہیں۔ اگر وقت اجازت دیتا تو شاید۔ ان کے تخلیقی گلزار کا کچھ اور۔ ہی نقشہ ہوتا۔

موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ان کا طرز نگارش روایت کی صالح۔ کا پاسدار نظر آتا ہے۔ انہوں نے روایت کے پیمانے میں جدید موضوعات کی شراب۔ ڈالنے کی کوشش کی ہے ان کے اشعار عصری زندگی کے تلخ و شیریں حقائق اور ارضی صداقت کے عکاس و ترجمان نظر آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کی شاعری عہد جدید سے شاکی بھی ہے مگر اس سے ہم آہنگ بھی نظر آتی ہے مثلاً ان کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس عہد کا تو بھی حصہ ہے میں بھی اس عہد کا حصہ ہوں
جس عہد کی قدروں کو انساں سینے سے لگانا بھول گیا
وہ جس کی خاطر یہ انہیں ہر وقت درازاں رہتی تھیں
یہ نئے عہد کا تحفہ ہے وہ ہاتھ ملانا بھول گیا

اور یہ شعر۔

نئے عہد کی قید میں میرا دم گھٹ جائے نہ
مجھ کو اپنا حال پرانا اچھا لگتا ہے

غزل میں یوں تو تصوف اور نفسیات جیسے موضوعات کو بھی وسیلہ اظہار بنایا جاتا ہے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ طے ہے کہ 'بنتی نہیں ہے بادہ ساغر کہے بغیر' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصل شاعری تو حکایت بیار گفتن با حدیث دل یہ دلبراں ہی ہے۔ ہر لفظ بھرے جام کی مانند ہے جس کا ساجدؔ کے میخانے سے غزل آپ کے لئے قریشی داؤد احمد ساجد کی شاعری میں قاری کو یہ تمام چیزیں پڑھنے کو ملیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ قریشی صاحب کے۔ اولین شعری مجموعے 'سرِ راہ چلتے چلتے'' کو ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی نصیب ہوگی اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ***

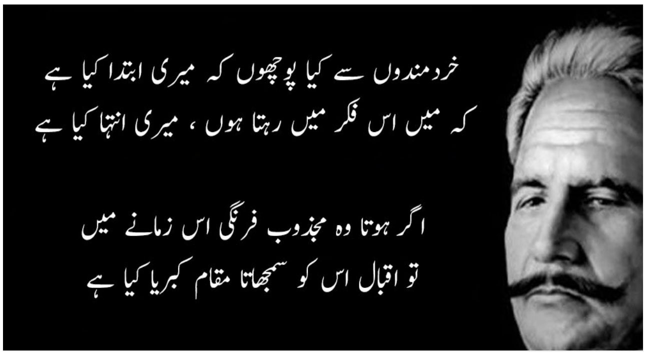

نیاز جیراجپوری کا شخصیت نامہ

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی یڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن (یوپی)، انڈیا

دیارِ شبلی اعظم گڑھ علمی، ادبی اور شعری لحاظ سے بڑا مردم خیز واقع ہوا ہے۔ اُس کے گرد ونواح کی بستیاں بھی علمی ادبی سرسبزی وشادابی کے لیے مشہور رہی ہیں۔ تخلیق ادب اور ادب پروری تو اس پورے علاقے کے خمیر میں داخل ہے اور یہی اس کا خاص طرۂ امتیاز بھی تصور کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا اسلم جیراج پوری، حمیدالدین فراہی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ،سرشاہ سلیمان، مولانا اقبال سہیل، راہل سنس کرتاین، کیفی اعظمی، رحمت الٰہی برقؔ، علی جواد زیدی، پروفیسر سید احتشام حسین، فضا ابن فیضی، اثر انصاری ـلکشمی نرائن مشرا، ایودھیا سنگھ اُپادھیائے ہری اودھ، یحیٰ اعظمی، شمیم کرہانی ،قاضی اطہر مبارکپوری، صفی الرحمٰن مبارکپوری، امجد غزنوی، احسان بیگ اور شمس الرحمن فاروقی جیسے علم وادب کے ماہ وانجم نہ جانے اس علاقے نے کتنے پیدا کیے ہیں۔ نیازؔ جے راج پوری بھی اِسی دیار کے پروردہ ہیں۔ وہ ۲۱ رمئی ۱۹۶۰ء کو جیراجپوری میں پیدا ہوئے۔ وہی جیراجپوری جو مولوی عبداللہ جے راج پوری، مولانا اسلم جے راج پوری اور پروفیسر شمیم جے راج پوری کی بھی جائے پیدائش ہے۔ اور جہاں کی علمی ادبی روایت بڑی مستحکم رہی ہے اور آج بھی ہے جس کی زندہ مثال نیازؔ جیراج پوری ہیں۔ موصوف کی ابتدائی تعلیم اسی گاؤں میں ہوئی، یہیں پلے بڑھے۔ ثانوی تعلیم شبلی اِنٹر کالج اعظم گڑھ میں ہوئی، اس کے بعد مزید حصولِ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے اور تقریباً چودھ سالوں تک بحیثیت متعلم قیام پذیر رہے اور پی۔ یو۔ سی، بی۔ اے، ایم۔ اے۔ (معاشیات)، ایل ایل۔ بی۔ اور ایل ایل۔ ایم۔ کی ڈگریاں لے کر جے راج پور واپس ہوئے۔ شعرو شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، گھر خاندان اور گاؤں میں بھی شعرفہمی عام تھی ـآپ کے والد عظیم اللہ عبدالرشید بھی شعروشاعری کے دلدادہ تھے۔ اس لیے اندر باہر کا ماحول بھی شاعری آشنا تھا جس کے اثرات معصوم نیاز کے ذہن ودل پر بھی مرتب ہوئے اگرچہ انھوں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں کیا اور اپنی پہلی غزل ۱۹۷۹ء میں کہی۔

علی گڑھ طالب علمی کے زمانے میں ہی جب ہال میگزین 'مسعود' کے ایڈیٹر بنائے گئے تو یہیں سے شاعری کے ساتھ ساتھ پہلی بار ادبی صحافت سے بھی وابستگی شروع ہوگئی اور انھوں نے اسی ہال میگزین ''مسعود'' کے لئے بی۔ بی سی۔ لندن سے وابستہ رضا علی عابدی سے پہلا انٹرویو بھی لیا۔ جو ''دوران گفتگو'' کے عنوان سے ہال میگزین ''مسعود'' میں شائع بھی ہوا۔ اسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے کہانیوں کے مقابلے میں شرکت کی اور ان کی کہانی ''مسافر کی دستک'' اوّل انعام کے لیے منتخب کی گئی اور وہ شاعری وادبی صحافت کے ساتھ افسانہ نگاری کی طرف بھی مائل ہو گئے اور متعدد کہانیاں بھی لکھیں جو بعد میں معاصر اخبارات ورسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ جن میں کتاب نما، فلمی ستارے، گلفام، اور انشاء جیسے رسالے بغور خاص قابل ذکر ہیں۔ اسی دوران ان کی بہت سی شعری تخلیقات یکے بعد دیگرے ماہنامہ ''شمع'' وغیرہ میں بھی شائع ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب ''شمع'' میں کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق شائع ہو جانا معراج تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شمع میں شعری تخلیقات کی اشاعت نے ملک گیر شہرت ومقبولیت کے لیے راہ ہموار کر دی۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی بہت سی نظمیں، غزلیں، اور ٹاک نشر ہوئے اور نیازؔ جیراجپوری ایک نوجوان اردو شاعر وادیب کی حیثیت سے متعارف ہو گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فراغت کے بعد جب جَے راجپور واپس آ گئے تو معروف فلمی اداکار اور پروڈیوسر منوج کمار سے ان کا تعارف ہوا اور تعلقات بھی استوار ہو گئے اور انھیں کے ایما پر نیاز ممبئ بھی گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے لیکن بعض ناگزیر وجوہات کے باعث وہ وہاں زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکے اور جَے راجپور آ کر گھر گرہستی اور زمین جائداد کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ شادی شُدہ نیاز اعظم گڑھ شہر کے محلہ جالندھری میں اپنے والد کے بنوائے ہُوئے مکان میں رہنے لگے اور بچو کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت کی نگرانی میں لگ گئے۔ شعرو شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور قرطاس وقلم کا کاروبار بھی بحال رہا اور ان

کی غزلیں، نظمیں اور دیگر شعری اصناف اُردو کے مختلف اخبارات ورسائل میں تواتر کے ساتھ شائع بھی ہوتی رہیں لیکن نثر نگاری کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔موصوف نے ''گیت غزل'' جیسی تجرباتی صنف شاعری میں بھی طبع آزمائی کی جو دراصل گیت اور غزل جیسی دوسری شعری اصناف کی خصوصیات سے آراستہ ایک مرکب صنف شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔اس صنف نے انھیں نئی شہرت ومقبولیت سے ہمکنار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔نیاز جیراج پوری کے گیتوں اور نظموں کا ایک مجموعہ''بہاروں کی اداسی'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں دیوناگری رسم خط میں شائع ہوا۔میں نے وہ مجموعہ دیکھا نہیں ہے صرف اس کے بارے میں سنا ہے اور میرے ایک دوست بلکہ ہم دونوں کے مشترکہ دوست ان کے اس مجموعہ کو ان کی ''متبنیٰ اولاد'' کہتے ہیں اس وضاحت کے ساتھ کہ تخلیقی اعتبار سے نہیں رسم خط کے اعتبار سے۔نومبر ۲۰۰۳ء میں نیاز جیراج پوری نے اعظم گڑھ سے ایک رسالہ ماہنامہ''شاندار'' کا اجرا کیا جواب بھی جاری ہے مگر تسلسل سے نہیں،پھر بھی ''شاندار'' میں کئی ہم شاعروں اور ادیبوں کے خصوصی گوشے بھی شائع کئے جو اردو کے ادبی حلقوں میں پسند بھی کئے گئے۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں راقم نے بھی مئو سے ایک ادبی رسالہ ماہنامہ'' ادب نکھار'' کا اجراء کیا تھا جو تقریباً سولہ سالوں تک جاری رہا،اسّی کی دہائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جن طالب علم قلم کاروں نے ماہنامہ''ادب نکھار'' میں اپنی شعری اور نثری تخلیقات ونگارشات کے لیے رابطہ قائم کیا تھا ان کی نگارشات وتخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں ان میں ابوالکلام قاسمی،اسعد بدایونی،شمس بدایونی ،پیغام آفاقی ،غضنفر علی غضنفر،شہپر رسول اور نیاز جیراجپوری وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔نیاز جیراج پوری کی تخلیقات تو ایک عرصہ تک کثرت سے شائع ہوتی رہیں اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اسی زمانے سے جو تعلق قائم ہوا تو وہ آج بھی باقی ہے اور اس تعلقاتی موسم میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ ساحل سمندر کے علاقے کے موسموں کی طرح بدستور یکساں اور معتدل ہے اور ہم دونوں تقریباً ہم عمر بھی ہیں ہم عصر بھی اور ہم مشرب بھی۔نیاز جیراج پوری کو میں ۱۹۷۹ء سے جانتا ہوں۔وہ شروع سے ہی یار باش،مجلسی اور باتونی قسم کے واقع ہوئے ہیں۔بڑے نفاست پرست اور ہر دم لیے دیئے رہنے والے آدمی ہیں۔گفتگو بہت شگفتہ اور دلکش کرتے ہیں۔اور اکثر حقیقت پسندی میں زیب داستاں اور رنگینئ عبارت کے لیے مناسب مبالغہ آرائی سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں مگر نفس مضمون کی صداقت کی اساسی برقرار رکھنے میں بھی اٹل رہتے ہیں۔جس سے مخاطب لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور فیض یاب بھی۔گفتگو کا موضوع کوئی بھی مقامی،علاقائی،ادبی،سیاسی،معاشرتی،ملی،مذہبی یا حالات حاضرہ،ان کا اپنا مخصوص انداز اور نقطۂ نظر ہوتا ہے اور اس سے یک سرمو انحراف کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتے۔رائی کو پربت اور پربت کو رائی بنانے کا فن بھی خوب جانتے ہیں مگر اسے وہ عموماً ریزرو رکھتے ہیں۔لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو ممکن تھا کہ مولانا اقبال سہیل کے ثانی ثابت ہوتے۔موصوف فطرتاً حقیقت پسند ہیں اور حق گوئی وصداقت کو بچائے رکھنے کے لئے کوشاں بھی رہتے ہیں۔ایک بار کسی گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ آپ نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہے اگر وکالت کا پیشہ اختیار کیے ہوتے تو اپنے زمانے کے کامیاب وکیل ہوتے،انھوں نے فوراً جواب دیا''لیکن سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بھی ثابت کرنا پڑتا'' میں نے ازراہ مذاق مزید کہا کہ اور اس میں آپ کو خاصی مہارت بھی ہے پھر اپنے مخصوص انداز میں جواب دہی لگاتے ہوئے بولے''اسی لیے تو میں نے علی گڑھ جیسی یونیورسٹی سے قانون کی اعلیٰ ڈگری کے باوجود اس پیشے سے قصداً گریز کیا ہے۔''

عبدالحمید حمیدی

عاصی صحرائی

ایک ایسے شاعر وادیب سے تعارف کروانا چاہتا ہوں۔جو ادب دوست اور ادب نواز بھی ہے۔اپنے اشعار کو جب خدا دادلحنِ داؤدی سے سُروں میں گاتا ہے تو ایک سماں باندھ دیتا ہے۔اور محفل پر ایک جادو کر دیتا ہے۔ادب پرستی کا یہ عالم ہے کہ ادب سے متعلق کوئی کام بھی ہو تو شوق سے اسے نبھاتا ہے۔جولائی ۲۰۲۲ء سے انہوں نے کاروانِ ادب کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکالا ہے۔یوں اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں کو دیارِ مغرب میں اردو ادب کی آبیاری کی بھی توفیق سے نواز رہا ہے۔بندہ اس قابل احترام شخص کے لئے دعا گو بھی ہے۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کرامت راج ایک ادبی شخصیت

صفی اللہ راجپوت، ملٹن، کینیڈا

میں ہوں صدائے قلب، محبت ہے میرا نام

قدرت نے ایک بے قرار روح کو قلندوں کا مزاج، درویشوں کا غناء اور شاعرانہ تخیل دے کر جِس پیکرِ خاکی میں جلوہ گر کیا اسے گھر والوں نے کرامت اللہ، علمی دنیا نے پروفیسر کرامت راجپوت اور حلقہ بزم وسخن نے کے۔راجؔ کے نام سے موسوم کیا۔

کرامت اللہ راجپوت صاحب، پیدائش فروری ۱۹۶۴ء کراچی، چوہدری عظمت اللہ راجپوت و محترمہ مقبول جان صاحبہ کی پانچویں اولاد تھے۔ آپ پیدائشی احمدی تھے اور ماں اور باپ، دونوں کی طرف سے آپ کا شجرہ صحابہ حضرت مسیحِ موعودؑ سے ملتا تھا۔آپ کے دادا حضرت میاں جان محمد صاحب ہیلائیؓ، نانا حضرت حافظ ملک مشتاق احمد صاحب پشاوریؓ اور پڑ دادا میاں عبدالعزیز صاحبؓ کو حضرت مسیحِ موعودؑ کو دیکھنے اور اُن ہی کے ہاتھ پر مشرف بہ بیعت ہونے کی سعادت نصیب ہوئی، الحمدللہ۔کرامت اللہ راجپوت نے ابتدائی تعلیم کراچی میں ہی حاصل کی اور ۱۹۵۵ میں، ون یونٹ کے قانون کے باعث، اپنے والد صاحب، جو وفاقی سیکریٹیریٹ میں سرکاری ملازم تھے، کے لاہور تبادلہ کے بعد، باقی تعلیم لاہور میں ہی مکمل کی۔آپ نے ۱۹۶۶ء میں جامعہ پنجاب سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور حصولِ روزگار کے لئے کراچی آ گئے۔آپ نے کراچی میں ۵۵ سال کا طویل عرصہ گذارا۔ ۲۰۱۶ء میں آپ کینیڈا منتقل ہوئے اور مارچ ۲۰۲۲ء میں اپنے انتقال کے وقت تک مِلٹن اونٹاریو میں رہائش پذیر رہے۔ابا جان مرحوم ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔آپ ایک سعادت مند بیٹا، خبر گیر بھائی، مثالی شوہر، مشفق باپ، باوصف استاد، باکمال شاعر اور باوفا دوست تھے۔آپ ایک خوددار، با مروت، دیانت دار، اصول پسند، قانع اور نافع الناس وجود تھے۔ساری عمر رزقِ حلال کمایا، کوئی جائیداد تو نہیں بنائی لیکن ورثہ میں ایک علمی اور درویشانہ میراث چھوڑی ہے، اب جِس کی امین اُن کی روحانی و جسمانی اولاد ہے۔

درس وتدریس محض آپ کا پیشہ نہیں، محبت و عبادت تھی۔اپنے شاگردوں سے آپ کا قلبی تعلق تھا اور اُن کے لئے ہمہ وقت میسر ہوتے۔آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں جو آج اپنے اپنی شعبوں میں کامیاب ہیں اور اپنی کامیابی کی کلید پروفیسر کرامت راجپوت کو ہی جانتے ہیں۔ اِس بات کی گواہی سیکڑوں جاننے والے دیں گے کہ ہمارے گھر میں مہمانوں والا کمرہ ہمہ وقت اُن کے شاگردوں سے ہی بھرا رہتا تھا۔وہ محض ایک استاد نہیں تھے بلکہ ایک دوست، ہمدرد اور رہبر بھی تھے۔میں کئی ایسے شاگردوں کو جانتا ہوں جن کے داخلہ کی فیس بھی آپ نے ادا کی، پڑھایا بھی خود ہی، امتحانی فیس بھی دی اور پھر نوکری تک کی کوششیں ایسے کیں جیسے کوئی اپنی سگی اولاد کے لئے کرتا ہے۔ان کی شخصیت میں ایک کشش تھی جس کی وجہ اُن کا اخلاص تھا، جِس بھی کام کا بیڑہ اٹھاتے، اُس میں جُت جاتے اور کام مکمل کر کے ہی دم لیتے تھے۔یہ حیرت کی بات نہیں کہ اُن کے شاگردوں میں سے ایک وزیرِ اعظم پاکستان بھی ہوا اور کئی ایسے ہیں جو سول سروس میں کامیاب ہوئے۔ڈاکٹرز اور انجینیرز کا تو شمار ہی ممکن نہیں۔

آپ کی علمی زندگی کی معراج وہ وقت تھا جب ۱۹۹۸ میں آپ کو اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی کا ناظم الامتحانات مقرر کیا گیا۔یہ ایک کلیدی عہدہ تھا اور احمدی ہونے کی وجہ سے اِس تعیناتی کی شدید مخالفت کی گئی۔شاید ہی کوئی ایسا اخبار تھا جِس میں آپ کے خلاف خبر نا لگی ہو۔آپ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور تین ماہ کی قلیل مدت میں تمام امتحانات کروائے۔ایک محتاط اندازہ کے مطابق، اُس سال تقریباً تین لاکھ کے قریب طلباء اعلیٰ ثانوی امتحانات میں شریک ہوئے۔آپ نے ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ امتحانات کے نتائج انٹرنیٹ پر دیئے جو ۱۹۹۸ء میں ایک آسان کام نہیں تھا۔ آپ کی خودداری، رزقِ حلال کمانے کی لگن اور شہرِ کراچی کی سیاسی صورتِ حال آپ کے عہدہ پر رہنے کے حق میں نا تھی، اسی وجہ سے نتائج کے اعلان کے بعد آپ نے اس عہدہ سے استعفیٰ دیا اور درس وتدریس کی طرف واپس آ گئے۔آپ نے ۲۰۰۶ء میں منگھوپیر ڈگری کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹارمنٹ لی لیکن کسی نہ کسی صورت میں ۲۰۱۶ء تک درس وتدریس سے منسلک رہے۔شاعری آپ کی روح تھی۔آپ نے نوجوانی سے ہی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔آپ کی بڑی ہمشیرہ محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ منیر صاحبہ بھی جماعت کی صفِ اول کی شاعرہ تھیں۔اپنی شاعری کے متعلق ابا جان بتاتے تھے کہ ۱۹۷۰ء کے عشرہ سے مشاعروں میں شامل ہوئے، اوّل اوّل آپ نے ثاقب زیرویؔ صاحب کی

زیرِ مدارت ہفت روزہ لاہور میں اپنی غزلیں بھجوانا شروع کیں تو زیروی صاحب نے کمال شفقت سے نا صرف حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ اصرار کے ساتھ تازہ کلام کی فرمائش بھی کرتے رہتے۔ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۶۹ء تک آپ باقاعدگی سے مشاعروں میں شرکت کرتے، جوش ملیح آبادی، عبید اللہ علیمؔ، سلیم کوثرؔ، شبنم رومانیؔ، حمایت علی شاعر اور صابر ظفرؔ جیسے نامور شعراء سے ذاتی دوستی تھی اور اکثر ان احباب کو مشاعروں میں لے کر جانا اور واپس لانے کی ذمہ داری بھی نہایت محبت سے انجام دیتے۔

آپ کی شاعری میں جماعت اور خلافت سے محبت و وارفتگی فطری تھی۔ ۱۹۹۱ میں جب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحم اللہ قادیان تشریف لائے تو جلسہ سالانہ کے ایام میں قادیان میں ہونے والے مشاعرہ کی صدارت کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا جب کہ مہمانِ خصوصی مکرم حافظ مظفر احمد صاحب تھے۔ اس موقع پر جلسہ کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس میں آپ کو اپنی مشہور غزل تجدیدِ عہد ترنم کے ساتھ سنانے کا موقع ملا اور شرکا جلسہ کو بے اختیار ثاقب زیروی صاحب یاد آ گئے۔ اُس غزل کے چند اشعار یہ تھے۔

کئے ہیں تُجھ سے جو عہدوپیماں ہمارے دل میں جواں رہیں گے
زمانہ کِتنے سِتم ہی ڈھائے ترے رہیں گے جہاں رہیں گے
چراغ ہم نے لہو سے اپنے قدم قدم پہ جلا دیئے ہیں
جُنوں کے صحرا میں کہکشاں سے ان آبلوں کے نشاں رہیں گے
کبھی جو مقتل بھی راہ میں تھا نا ہم رُکے تھے نا رُک سکیں گے
یہ قافِلے ہیں صداقتوں کے یہ سوئے منزل رواں رہیں گے
اُٹھیں گے گر چہ اُدھر سے طُوفاں رقابتوں کے اذیتوں کے
اِدھر بھی لیکن یقین و ایماں سپر رہے ہیں سِناں رہیں گے
ہماری چاہت نا چُھپ سکی ہے، ہمارے جذبے نا چُھپ سکیں گے
جو ضبطِ غم سے نہ لب ہلیں گے تو اشک بنکر عیاں رہیں گے
قسم ہے تیری اَے جانِ جاناں یہ جاں امانت ترے لئے ہے
ابھی چُکا دییہ قرض جاں کا، نہ جانے کل تک کہاں رہیں گے

اِسی طرح ۱۹۸۸ء میں بھی قادیان ہی میں جلسہ سالانہ میں پڑھی گئی یہ غزل بھی بہت مقبول ہوئی۔

ہے کاروانِ عِشق ازل سے رواں دواں
باطِل کے کوہسار ابد تک دھواں دھواں
پروانے سجدہ ریز ہیں ابتک وہاں وہاں
روشن ترے لہو سے یہیں شمعیں جہاں جہاں
لالے کا سوز، رنگِ شفق، سُرخیٔ حنا
پہنچے ترے لہو کے شرارے کہاں کہاں
نہرِ فرات اپنے مقدر پہ خندہ زن
جذبِ حسین تِشنہ لبی میں جواں جواں
ظُلمت کدوں کو تونے زمیں بوس کردیا
تیری جبیں سے نور کی کِرنیں عیاں عیاں

آپ کی قادیان دارالایمان کی محبت میں کہی گئی نظم وہ قادیاں کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں! تو زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اسی نظم سے آپ کو جہاں گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس نظم کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

وہ قادیاں کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں!
خدا کرے ہمیں ملیں، جہاں کہیں بھی ہم رہیں
ہر اک طرف سے کارواں، تھے سوئے قادیاں رواں
ہر ایک طفل و مرد و زن کشاں کشاں، جواں جواں
قدم قدم تھے ضوفشاں، مسیح وقت کے نشاں
''بڑھے چلو، بڑھے چلو'' یہ کہہ رہی تھیں دھڑکنیں
وہ قادیاں کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں!
خدا کرے ہمیں ملیں، جہاں کہیں بھی ہم رہیں
طبیعتوں میں اک الگ، عجیب سا نکھار تھا
آرزو تھی مضطرب، ہر ایک دل میں پیار تھا
نفس نفس تھا مطمئن ہر اک طرف قرار تھا
جبیں جبیں تھی سجدہ ریز، برس رہی تھیں رحمتیں
وہ قادیاں کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں!
خدا کرے ہمیں ملیں، جہاں کہیں بھی ہم رہیں

سال ۲۰۲۱ کے اُوائل میں آپ کو جگر کا عارضہ لاحق ہوا تو صحت گرنی شروع ہوئی لیکن آپ کے مشاغل میں کوئی فرق نا آیا۔ آپ معمول کے مطابق والدہ کو ڈائیلیسز کے لئے لے کر جاتیاور اپنے حلقہ احباب کے ساتھ تعلق قائم رکھتے۔ صحت کی بتدریج گراوٹ کی وجہ سے آخری چند ہفتوں میں نقاہت وکمزوری بڑھتی گئی اور ۳۰ مارچ کو اسپتال میں مختصر علالت کے بعد دائی اجل کو

لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آج جب اُن کی زیرِ تکمیل مجموعہ کلام 'دارورسن' کو دیکھ رہا تھا، اور ۱۹۷۲ کی لکھی ایک غزل سامنے آئی تو یوں لگا جیسے اُن کی زندگی کا نچوڑ اور خلاصہ ہو۔ اسی غزل پر اپنے پیارے والد صاحب کا ذکرِ خیر مکمل اس دُعا کے ساتھ مکمل کرتا ہوں، حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا!

ہر گام پر دیا سا جلاتا چلا گیا
یُوں شامِ غم کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
میں ہوں صدائے قلب، محبت ہے میرا نام
میں دِل کو دِل کی بات سُناتا چلا گیا
دینے کو میرے پاس فقط ایک جام تھا
میں قطرہ قطرہ سب کو پلاتا چلا گیا
دستِ دُعا تھا کوئی مرے ساتھ اِس طرح
سوئے نصیب جوکہ جگاتا چلا گیا
دُشمن نہیں ہے کوئی مرا، سُن میرے رفیق
رُوٹھے ہُووں کو روز مناتا چلا گیا
پہنچا دیارِ عشق میں مَیں اسطرح ندیم
میں آگ نفرتوں کی بُجھا تا چلا گیا

خراج تحسین

عزت مآب سر افتخار احمد ایاز۔KBE

جناب Chris Cotton صاحب۔ڈپٹی لیفٹیننٹ

(مورخہ 19 مئی 2022ء بمقام لندن)

عزت مآب سر افتخار احمد ایاز۔KBE, OBE, PhD تنزانیہ میں پلے بڑھے اور برطانیہ وامریکہ میں اپنی یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالسلام یونیورسٹی، The Centre on Integrated Rural Development for Africa، Commonwealth Fund for Technical Cooperation، UNDP اور UNESCO میں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا۔ آپ نے United Nations Human Rights Council میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالہ سے بھی خدمات سرانجام دیں نیز مذہبی آزادی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارہ میں UNHRC کے اجلاسات میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ آپ امن کے سفیر ہیں اور انسانی فلاح و بہبود، غربت کے خاتمہ نیز تنازعات کے حل کیلئے اپنے ماہرانہ مشورہ جات پیش کرتے ہیں۔ آپ International Human Rights Committee کے چیئرمین بھی ہیں۔ آپ 1996ء سے برطانیہ میں طوالو کے اعزازی قونصل کے طور پر خدمات پیش کر رہے ہیں۔ آپ کامن ویلتھ میں طوالو کے ہائی کمشنر اور UN Human Rights Council میں طوالو کے سفیر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ سر افتخار ایاز نے متعدد اعزازات حاصل کئے ہیں جن میں:

Role Model of the Year 2016, O.B.E. (Officer of the Most Excellent Order of the British Empire)

K.B.E. (Knight Commander of the Most Excellent Order of the British Empire)

شامل ہیں۔ 2020ء میں آپ کو انسانی خدمات کیلئے ملکہ کے تمغہ (Queen's Medal) سے نوازا گیا اور امسال بھی آپ کو Queen's Medal for Platinum Jubilee کا اعزاز دیا گیا ہے۔ آپ احمدیہ مسلم کمیونٹی کے ایک ممتاز و معروف فرد ہونے کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں کمیونٹی کے سابق نیشنل امیر بھی رہے ہیں۔ آپ طوالو میں جماعت احمدیہ کے پہلے نمائندہ کی حیثیت میں خدمات بجالا رتے رہے ہیں۔ آپ ایک انمول وبارآور مصنف و مقرر کے طور پر متعدد کتب و مضامین شائع فرما چکے ہیں نیز کئی اعلیٰ سطحی فورمز بشمول Peace and Climate Change Conferences وغیرہ میں مختلف ممالک میں مؤثر تقاریر فرما چکے ہیں۔ سر افتخار کو یہ اعزازات آپ کی غیر معمولی خدمات واقدامات کے نتیجہ میں دئے گئے ہیں خاص طور پر آپ کی خدمت جو طوالو کے مفاد میں بہتر ثابت ہوئیں نیز اس چھوٹی سی ریاست کی ترقی و بہبودی اور عالمی پہچان بنانے میں مدد مددگار بنی۔ تقریباً 40 سال سے سر افتخار Small Island States میں تعلیم و بنیادی ڈھانچے کی ترقی کیلئے ایسی پالیسیوں پر کام کر رہے ہیں جو کہ معیشت کی بہبودی نیز تعلیم وصحت کے نظام کو معیاری بنانے میں مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ کامن ویلتھ کے ایک فیلڈ ایکسپرٹ ہونے کے طور پر آپ نے ایک جدید پروگرام Education For Life کو متعارف کرایا جو کہ جزائر میں رہنے والوں کو پیشہ وارانہ اعلیٰ تعلیم مہیا کر رہا ہے۔ یہ آپ کی اس پُرجوش فلاسفی کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کی ترقی، بہبودی اور معیار کی بلندی کیلئے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہنا چاہئے۔ یہ جذبہ آپ کی طرف سے پیش کی گئی بے لوث خدمات کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ برطانیہ میں طوالو کے اعزازی قونصل کے طور پر سر افتخار کا یہ طے شدہ مستحکم نظریہ رہا ہے کہ طوالو کی وراثت اور کامن ویلتھ میں طوالو کی قابل فخر پہچان پروان چڑھے۔ اس کیلئے سر افتخار نے کمال کی مستقل مزاجی سے اپنا غیر معمولی کردار ادا کرتے ہوئے عالمی سطح پر طوالو کے مظبوط روابط استوار کئے ہیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے رضا کارانہ طور پر اپنے اخراجات پر کیا۔ حال ہی میں آپ نے طوالو اور St. Kitts Island کے مابین کامیاب سیاسی روابط قائم کئے ہیں۔ سن 2000ء میں کامن ویلتھ کے فیلو کے طور پر سر افتخار نے طوالو کی حکومت سے بار بار پُرزور درخواستیں کیں اور بالآخر حکومت کو قائل کرلیا کہ ملکہ معظّمہ کی دولت مشترکہ کی مکمل ممبرشپ کیلئے درخواست کی جائے۔ دولت مشترکہ کی مکمل ممبرشپ کو حاصل کرنے میں آپ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ بعدۂ یونائیٹڈ نیشنز کی مکمل ممبرشپ حاصل کرنے میں رہنمائی کی اور نتیجۃً یونائیٹڈ نیشنز میں طوالو کا مستقل مشن قائم ہوا۔ یہ حصولیابی ایک سنگ میل ثابت ہوئی اور طوالو عالمی دنیا کے ایک اہم اور قابل قدر ممبر کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا۔ ان ممبرشپس کی وجہ سے دنیا میں طوالو کی عزت ووقار میں گراں قدر اضافہ ہوا اور دنیا کے مختلف ممالک سے طوالو کے دوطرفہ تعلقات قائم ہوئے۔ ان تعلقات کو قائم کرنے میں سر افتخار نے فعال اور مؤثر کردار ادا کیا۔ سر افتخار نے یوروپین یونین، نیدرلینڈ، ترکی، UAE، مورکو، مالٹا، اٹلی اور انڈیا سے مظبوط روابط استوار کئے۔ اب آپ حکومت طوالو کو کامن ویلتھ فاؤنڈیشن کا مکمل ممبر بننے کیلئے قائل کرنے میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ سر افتخار نے اہم مسائل جیسے کہ ماحولیاتی تبدیلی پر بھی بات کی ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی، ان کئی موضوعات میں سے ایک موضوع ہے، جس کے حوالہ سے سر افتخار نے پُرجوش اور مستحکم رنگ میں ان ریاستوں کی بات پیش کی ہے جن کو اس سے خطرہ ہے۔ اس تعلق سے اُٹھائے گئے آپ کے ذاتی اقدامات کے نتیجہ میں آپ نے یوروپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور ان ممالک کی یونی ورسٹیز نیز برطانیہ کے مختلف ادارہ جات میں ماحولیاتی تبدیلی پر سیر حاصل لیکچرز دئے جن میں ماحولیاتی تبدیلی سے متعلقہ کئی ادارے و تنظیمیں بھی موجود تھیں۔ ان کاوشوں کا زبردست اثر ہوا اور کئی ممالک نے اس چیلنج سے نپٹنے کیلئے مطلوبہ ذرائع فراہم کئے۔

آپ نے Caribbean اور South Pacific کی Small Island States میں باہم تعاون وروابط کو فروغ دینے کیلئے پُرزور کاوشیں کیں۔ جس کے نتیجہ میں پچھلے ماہ اکتوبر میں COP 26 کے دوران طوالو، Antigua اور Barbados میں ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ سر افتخار اب برطانیہ میں Small States APPG کے قیام کیلئے کام کر رہے ہیں۔ رفیوجیز کی بھلائی و بہبودی نیز سلطنت ملکہ معظّمہ برطانیہ کی چھوٹی ریاستوں کی فلاح و ترقی کیلئے آپ کی انسانی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اسی طرح دنیا کے مختلف ممالک میں حقوق انسانی کے قیام اور مختلف انسانی خدمات آپ کو ان اعزازات و میڈلز کا حقیقی مستحق بناتی ہیں جن سے آج آپ کو نوازا جارہا ہے۔

منجانب: قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

ڈاکٹر منور احمد کنڈے (برطانیہ)

شہزادہ قمر الدین مبشر گلاسگو

(پاکستان) میں ان کی ولادت ۱۰، دسمبر ۱۹۴۹ کو ہوئی تعلیمی مدارج پاکستان اور برطانیہ میں طے کئے۔ ہومیو پیتھک اور ہربل میڈیسن کی ہائر ڈگری لینے کے بعد سردست، طبابت کے پیشہ سے منسلک ہیں۔ ۸ دسمبر ۱۹۶۵ سے برطانیہ ہی ان کا وطن ثانی بن چکا ہے۔ شعروشاعری کا شوق بچپن سے تھا جو عمر کے ساتھ پروان چڑھتا رہا اور اب اقلیم سخن میں وہ اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں، ہومیوپیتھی اور اس کے طریق علاج پر ان کی متعدد کتب اردو اور انگریزی میں مقبول ہوچکی ہیں جس کے لئے انہیں اعزازات بھی بخشے گئے ہیں۔ ''نوائے وقت'' لندن میں ہومیو پیتھک ہیلتھ پر ان کا مستقل کالم بھی ۱۹۹۹ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ادبی تصنیفات میں پنجابی شاعری کے دو مجموعوں کے علاوہ اردو کے دو شعری مجموعوں ''بیدا دل'' اور ''طاق دل'' کی پذیرائی بھی ہوچکی ہے۔ حالانکہ ان کی تصنیفات کے بالراست مطالعہ کا شرف حاصل نہیں تاہم رسائل کی وساطت سے جتنی غزلیں میری نظر سے گزری ہیں ان سے یہ مجموعی تاثر اُبھرتا ہے کہ جدید غزل کے ایوان میں انہوں نے اپنی آواز سے ایک ایسا ارتعاش پیدا کیا ہے جو مضراب کی مانند زندگی کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور جس سے آج کے انسان کو درپیش مسائل سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔ یہاں ان کی ایک ایسی غزل پیش ہے جس سے ان کی صالح فکری اور تعمیری رُجحانات مترشح ہیں۔

میں نے شاعری اور ادب کے بارے میں مروجہ نظریات و مفروضات کو بالائے۔ طاق رکھتے ہوئے اپنی راہ۔ خود وضع کرنے کی کوشش میں تاریخ وادب کا یہ قرض چکانے کی جو سعی کی ہے اسے بھی میری باغی روح کا ایک اور ردعمل سمجھئے۔ کیونکہ میں نے صرف مور ہی کو نہیں دیکھا۔ مور کے پاؤں بھی دیکھے ہیں...انسانیت کی تمام تر خوبصورتی اور عظمتوں کے باوجود میں نے انسان کے اس پیچیدہ کردار کو نظرانداز نہیں کرسکتا جس کے انسانی حرمت، شرافت، خوابوں اور خواہشوں کی راکھ ازل سے گرم اور روشن ہے میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس عہد پر آشوب کو رفتگاں کی تاریخ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں پایا۔ تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ وہ ایک عہد کے

واقعات من وعن بیان تو کردیتی ہے مگر اس دور کے ردعمل اور محسوسات کو نظر انداز کردیتی ہے۔ میرے نزدیک تاریخ و ادب کے باہمی ارتباط سے اس خلاء کو پر کیا جاسکتا ہے اور یہی میں نے کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں احمدیت اور احمدیوں کے خلاف عالمی سازشوں کا جو تانا بانا بنا گیا۔ اس میں ذاتی سطح پر مجھے دو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ جنہیں آئندہ برپا ہونے والی قیامت کا پیش خیمہ سمجھنے کے لئے کسی ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔ ارباب اختیار کے ہاتھوں میرے والد ڈاکٹر محمد حبیب الرحمن کی جبری ریٹائرمنٹ اور میرے عزیز دوست ابرار احمد سوری فلائنگ آفیسر شہید کا بہیمانہ قتل... دیگر حادثات کے علاوہ یہ واقعات میرے محسوسات کو اس لرزہ خیز ماحول۔

میں مہمیز لگانے کے لئے کافی تھے، جس میں اجتماعی سطح پر آج بھی پاکستانی احمدی اپنی بقا کی جدوجہد میں برسرپیکار ہیں۔ اپنی شاعری (یا جو کچھ بھی یہ ہے) قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی بے پناہ شفقت کو یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کی حوصلہ افزائیوں نے مجھے ہر قدم پر ایک نیا اعتماد، عزم اور حوصلہ بخشا، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔ کاش میں یہ کتاب ان کی خدمت اقدس میں پیش کرسکتا۔

محترم صاحبزادہ مرزا مظفر احمد ابن ڈاکٹر حضرت مرزا منور احمد، مکرم محمد اکرم محمود، محترم پروفیسر جناب محمد خالد، اور ڈاکٹر خالد احمد عطاء صاحب کا بھی میں بوجود ممنون ہوں کہ وہ۔ میرے اس سفر میں کسی نہ کسی رنگ میں ہر طرح شریک رہے ہیں۔ خاص طور پر میں استاذی المکرم محترم جناب ڈاکٹر پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی کا انتہائی شکر گزار ہوں جنہوں نے انتہائی خلوص و محبت سے اس۔ کتاب کا دیباچہ رقم کرنے کی زحمت اُٹھائی۔

یہ کتاب میرے والدین بہن بھائیوں اور بیوی۔ کی دعاؤں کا لازوال ثمرہ اور اپنے بچوں، زارا، نینا اور دانیال رحمان کی طرح نئی نسل کے لئے وہ تحفہ ہے جس کے حرفوں کی روشنی میں امید ہے کہ انہیں اپنے ماضی کی تاریخ سے محسوسات کی سطح پر روشناس ہونے کا موقع میسر آئے گا اور وقت کے طاق میں بفضل ایزدی جب احمدیت کی گوناگوں عظمتوں اور رفعتوں کے نئے چراغ روشن ہونگے تو ایسے میں محبت کے بلند میناروں سے انہیں ماضی کی راہ میں پھیلے ظلم و نفرت کے وہ سائے ضرور نظر آجائیں گے جنہوں نے ان کے اجداد کو نگلنے کی ناکام کوشش کی تھی شائد ایسے میں وہ یہ جان کر کہ زندہ قومیں تاریخ کا قرض کس طرح ادا کرتی ہیں۔ میرے حق میں بھی دعائے خیر کرسکیں۔

حرف آخر کے طور پر مجھے صرف یہی کہنا ہے اگر میری والدہ کی دُعائیں اور خواہشیں میرے شامل حال نہ ہوتیں تو یہ کتاب کبھی منظر عام پر نہ آتی۔ ربّ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس فریضہ سے سبکدوش ہوا۔ کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کا فیصلہ میں وقت کی عدالت پر چھوڑتا ہوں۔

رانا عبدالرزاق خان صاحب ایڈیٹر انچیف اور ان کے معاونین کو مبارک صد مبارک

طارق احمد مرزا، آسٹریلیا

بن چکا ہے اک حوالہ صد مبارک
یہ رسالہ جو نکالا، صد مبارک
اس کا جشنِ دس سالہ صد مبارک

آندھیوں کا ہے یہ پالا، صد مبارک
ہو جہاں میں بول بالا صد مبارک
اس کا جشنِ دس سالہ صد مبارک

شش جہت پہنچے ہے اس کی ہر کرن
یعنی لنڈن تا بٹالہ، صد مبارک
اس کا جشنِ دس سالہ صد مبارک

ہر طرف اس کا اجالا صد مبارک
حاسدوں کا منہ ہے کالا، صد مبارک
اس کا جشنِ دس سالہ صد مبارک

پان ہے میٹھا ادب آداب کا
یا ہے گل قندی نوالہ، صد مبارک
جو بھی لکھ بھیجا اسے تو بے دھڑک
مِن و عن ہی چھاپ ڈالا، صد مبارک
سادگی، اپنائیت، اخلاص کیش
نہ تو گڑبڑ نہ گھٹالہ، صد مبارک
اس کا جشنِ دس سالہ صد مبارک

’’لبِّ لباب‘‘

کلامِ ڈاکٹر طارق انور باجوہ صاحب

ڈاکٹر منور احمد کنڈے، ٹیلفورڈ، انگلینڈ

’’لبِّ لباب‘‘ ڈاکٹر طارق انور باجوہ صاحب کی تصنیفِ اوّل ہے جسے قاری کی سہولت و آسانی کے لئے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔کتاب کا انتساب دعاؤں کے ساتھ شاعر نے اپنی شہید والدہ محترمہ اور مرحوم و مغفور والد صاحب کے نام کیا ہے۔

’’اپنی کہانی‘‘ کے زیرِ عنوان اظہارِ ذات میں خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ عقیدت اور ایمان وایقان کو بہت ہی سُندر الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں باغِ سخن کے گُل بُوٹے سجاتے ہیں۔منظومات میں روحانی بزرگوں کی شفقتوں سے قلبی محبت و عقیدت کا بھرپور ذکر کرتے ہیں۔صبر و تقویٰ کی نورانی شکشا خیالات میں اس قدر بھرپور ہے کہ قاری کو تاریکی کہیں نظر نہیں آتی۔

خاکسار ’’لبِ لباب‘‘ پر ان چند حقیری سطور کے بعد محترم مصنف کے لئے دست بہ دعا ہے: ’’اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!۔۔آمین

اختتام پر ذیل میں ایک توشیحی نظم ڈاکٹر طارق باجوہ صاحب کے لئے احترام کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔۔گر قبول افتد!

☆

توشیحی نظم۔ ڈاکٹر طارق انور باجوہ

(ڈاکٹر)

(ڈ) ڈوبتا دیکھا اندھیرا تو چمن روشن ہوا
حضرتِ طارق کے دامن میں سخن روشن ہوا
(ا) اختیارِ قلب سے باہر نکل آئی دعا
عرش تک پہنچی، محبت کی، دلوں سے التجا
(ک) کہکشاں احساس کی نوکِ قلم پر آ گئی
یوں لگا زرّیں گھٹا قرطاس پر ہے چھا گئی
(ٹ) ٹمٹماتے ہر ستارے کا یقیں پختہ ہوا
چاند سے نکلا محبت کی غزل کا سلسلہ
(ر) رنگ جو قوسِ قزاح کے ہیں سبھی نظموں میں ہیں
واہ واہی کے خزانے شعر کی رمزوں میں ہیں

(طارق)

(ط) طرّہء علم و ادب ہر سر پہ تو سجتا نہیں
ساز اِس پُستک کے جیسا ہر کہیں بجتا نہیں
(ا) ارتعاشِ قلب کو تسکیں ملے الفاظ سے
یہ بھی طارق نے ہے پایا فکر کی پرواز سے
(ر) رفعتِ کہسار تک تو زاغ نہ پہنچے کبھی
جذبۂ اشعار میں پرواز ہے شاہین کی
(ق) قصّۂ افکار کا مرکز فقط شیریں حروف
شوق سے تسکین پائیں جن سے مومن کے ظروف

(انور)

(ا) ابرِ بارانِ سخن ہے مہرباں ’’ لُبِّ لباب ‘‘
ہیں عقیدت کے ترانے اس کے اندر بے حساب
(ن) نو بہ نو اظہار کی کلیاں چٹکتی ہیں ہزار
نظم کی خوشبو سَحَر کی روشنی پہ ہے سوار
(و) وقت کے لمحات نے چرچے غزل کے کر دئے
صحبتِ نورانیت نے شب میں تارے بھر دئے
(ر) راز دارِ عزم و ہمت کھولتا ہے راز کو
آسماں تک لے کے جائے لفظ کے شہباز کو

(باجوہ)

(ب) بے بدل احساس سے ہے سج رہا ’’لُبِّ لباب‘‘
فکر و فن کے مست جھونکوں میں سرورِ لاجواب
(ا) ایک بابِ آبِ زر ہے آہنی دیوار میں
دولتِ الفت نکل کے آگئی شاہکار میں
(ج) جوہرِ علم و ادب کا ایک دفتر کھُل گیا
نُور کے پانی سے طارق کا قلم بھی دھُل گیا
(و) وادیِ صبر و قناعت میں محبت کا چمن
دوریوں میں قربتیں بھرنے میں ہے شاعر مگن
(ہ) ہادیِ برحق سے الفت رحمتِ حق کا شعور
خوش نصیبی ہے، غزل اور نظم پر یکساں عبور

(نتیجۂ فکر: ڈاکٹر منور احمد کنڈے، ٹیلفوڈ، انگلینڈ)

ڈاکٹر شمس الحق طیب
شہید ایک ماہر سرجن

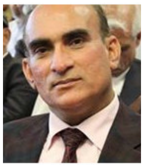

مرسلہ: شفیق مراد جرمنی

رپورٹ: ضیغم سامی

عصر حاضر میں سائنسی ایجادات وتحقیقات نے ہر میدان زندگی کو حیران کن حد تک متاثر کیا ہے۔کل تک جو چیز ناممکن تھی آج عین ممکن نظر آتی ہے۔آج فاصلے سمٹ گئے ہیں۔انسانی زندگی مجموعی طور پر زیادہ پر آسائش اور پر تعیش ہوگئی ہے۔لیکن مشینی دور سے کئی ایک حادثے بھی جنم لیتے ہیں۔جس سے بسا اوقات موت یا معذوری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہ بھی سائنس کا کمال ہے کہ ایک طرف اگر حادثے ہو رہے ہیں تو دوسری طرف اس کا موثر علاج بھی موجود ہے۔طب کے میدان میں ریسرچ بہت آگے نکل چکی ہے۔آج جہاں تبدیلی دل وگردہ کے آپریشن ہو رہے ہیں تو وہیں آنکھوں میں بینائی بھی بانٹی جا رہی ہے۔

سائنس ہر لمحے نئے جہان تلاش کر رہی ہے۔مشینی دور میں کسی بھی وقت ایسا کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے جب کسی شخص کا کوئی عضو ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اگلی زندگی معذوری کی حالت میں گزار دیتا ہے۔ایسا ہی ایک واقعہ فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے نواحی گاؤں، گیدڑ پنڈی کے عدنان بشیر نامی بارہ سالہ بچے کے ساتھ پیش آیا۔جب اس کا دایاں ہاتھ ایک مشین میں آکر جسم سے الگ ہوگیا۔خیال یہی کیا جاتا تھا کہ بچہ اب عمر بھر کے لیے معذور ہوگیا۔کیونکہ اکثر دیکھنے میں یہی آیا ہے۔لیکن فیصل آباد شہران کے لیے خوشیوں کی ایک کرن بن کر آیا جہاں اس بچے کا کٹا ہوا ہاتھ دوبارہ جوڑ دیا گیا۔آج اس آپریشن کو دس بارہ دن ہو گئے ہیں۔تکنیکی طور پر بچے کی حالت بہت بہتر ہے۔اس کی انگلیوں میں خون کی گردش ہے اور وہ چیزوں کو محسوس کر سکتا ہے۔میرے بچے کا جب ہاتھ کٹا تو ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہم کیا کریں۔گاؤں کے لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کا دوبارہ جڑنا ناممکن ہے۔اس کو تو پتہ نہیں کیونکہ عمر چھوٹی ہے اور وہ ناسمجھ ہے۔لیکن دائیں ہاتھ کا نہ ہونا ایک بہت بڑی معذوری ہے۔اس کے کامیاب آپریشن کے بعد اس بچے کو ہی نہیں، ہمیں بھی دوبارہ زندگی ملی ہے اور ہم اپنے آپ کو انتہائی خوش قسمت تصور کرتے ہیں۔

یہ ہیں اس مریض بچے کی ماں کے تاثرات جس نے انتہائی پریشانی کے بعد انتہائی خوشی کا مقام بھی دیکھا۔واقعہ یوں ہے کہ جب اس بچے کا ہاتھ علیحدہ ہوا تو خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔انہوں نے بازو کو اوپر سے ذرا زور سے باندھ دیا اور کٹے ہوئے ہاتھ کو پلاسٹک کے بیگ میں ڈالا اور اپنے گاؤں کے قریب ترین سرکاری ہسپتال، تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال سمندری میں لے آئے۔جہاں اسے ابتدائی طبی امداد دی گئی۔اور یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا کہ اس کا ہاتھ دوبارہ جوڑا جا سکتا ہے۔گاؤں کے تمام لوگوں کے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی بلکہ اکثر پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی حیران کن خبر ہے۔انہیں بتایا گیا کہ بہاولپور کے سرکاری ہسپتال میں پروفیسر تحسین چیمہ ان کے لیے امید کی کرن ہیں۔پروفیسر صاحب سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ یہاں پہنچتے پہنچتے دیر ہو جائیگی جس کی وجہ سے نتائج بھی اتنے بہتر نہ ہوں گے۔لہٰذا بچے کو جلد از جلد فیصل آباد لے جائیں۔تاکہ اس کا آپریشن ہو سکے۔فیصل آباد کے ایک ٹرسٹی ہسپتال میں ماہر امراض ہڈی پٹھہ و جوڑ ڈاکٹر شمس الحق طیب نے یہ آپریشن کیا جو پانچ سے چھ گھنٹے پر محیط تھا۔اور فیصل آباد میں اپنی نوعیت کا انوکھا آپریشن۔میرے پاس جب یہ بچہ آیا تو سات آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔انہوں نے کٹا ہوا ہاتھ پلاسٹک کے بیگ میں ڈالا ہوا تھا اور اس میں برف پڑی ہوئی تھی۔ہمارے ہاں نہ تو باقاعدہ آلات ہیں اور نہ ہی اس کیس کے لیے ہم ذہنی طور پر تیار تھے پھر بھی ہمت کی اور خدا نے ہمیں ہماری توقعات سے بڑھ کر پھل دیا۔ہم نے جہاں اس بچے کے پٹھوں کو جوڑا وہیں اس کی شریانوں، وریدوں اور اعصاب کو بھی جوڑا۔ابھی ایک دو مراحل اور آئیں گے تب اس کا ہاتھ مکمل طور پر جڑ سکے گا لیکن نہ تو اب تک اس آپریشن کی کوئی پیچیدگی ہوئی ہے اور نہ ہی نتیجہ حوصلہ شکن ہے ہم اس چیلنج میں کامیاب ہوئے ہیں۔میں اس بچے کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو اس امر سے بے خبر ہے کہ وہ پاکستان کی طبی تاریخ کا ایک مثالی بچہ بن چکا ہے اور جسے ایک بڑے آپریشن کے ذریعے مستقل معذوری سے بچا لیا گیا ہے۔کٹے ہوئے اعضاء کو جوڑنے کی ابتداء چین سے ہوئی اور آج بھی ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ اتنے گھنٹے طویل آپریشن کے بعد فلاں مریض کا ہاتھ جوڑ دیا گیا۔لیکن یورپ اور امریکہ میں ایسے کئی سنٹرز بن چکے ہیں جہاں اعضاء کی پیوند کاری ہوتی ہے۔پاکستان میں اس تکنیک کا فقدان

ہے۔ اور باقاعدہ کوئی یونٹ نہیں بنایا گیا اور نہ ہی ایسا دور دور تک دکھائی دیتا ہے۔ بہاولپور میں پروفیسر تحسین چیمہ نے کئی ایک ہاتھ جوڑے، ان کی کامیابی کی شرح تقریباً بیس فیصد ہے جبکہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح پچاس فیصد ہے۔ میں بھی انہی کا شاگرد ہوں۔ چند ایک کیسوں میں، میں نے ان کی معاونت کی ہے... اور آج اس قابل ہوا ہوں کہ خود اس بڑے آپریشن کو کر سکوں۔

میرے ایک سوال پر کہ اگر کسی کا بازو کٹ جائے تو اس کے جوڑنے کے امکانات کیا ہوتے ہیں، کے جواب میں ڈاکٹر شمس الحق طیب نے بتایا کہ چھوٹی عمر یا جوانی میں بہتر نتائج ملتے ہیں۔ پھر ایک سیدھا سادا اصول یاد رکھیں کہ جوں جوں ہاتھ سے بازو کی طرف جائیں جوڑنے کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح زخم کی نوعیت اور وہاں پر گندگی وغیرہ بھی دیگر عوامل میں شامل ہیں۔ زخم جتنا صاف ہوگا۔ ظاہری بات ہے کہ توقعات بہتر ہوتی جائیں گی۔ اگر مریض کو ابتدائی چھ گھنٹوں میں آپریشن تھیٹر لے جایا جائے تو بہتر نتائج مل سکتے ہیں۔ لیکن اتنی جلد مریض آپریشن کے قابل کہاں ہوتا ہے کیونکہ اسے علم ہی نہیں ہوتا کہ کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے، میں نے پوچھا۔ دراصل ڈاکٹرز کو تو علم ہے کہ کہاں کہاں ایسا ممکن ہے۔ ان سے معلومات لی جاسکتی ہیں۔ کٹے ہوئے عضو کو براہ راست برف میں نہ ڈالیں بلکہ اس کو ایک صاف ستھرے پلاسٹک کے بیگ میں ڈالیں اور اس کے باہر برف یا ٹھنڈا پانی ڈال دیں اور اسے کولر میں رکھیں۔

مریض کو خون کی اشد ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس کا بھی بروقت انتظام کرنا چاہیے۔ ان تمام معاملات کے انتظامات کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپریشن کامیاب ہوگا یا نہیں۔ اور اگر کسی بم دھماکے میں یا کسی ایکسیڈینٹ میں کسی کا پاؤں کٹ جائے تو....

دراصل ٹانگ کٹنے کی صورت میں مصنوعی ٹانگیں اس نوعیت کی آ گئی ہیں کہ گزارا اچھا ہو جاتا ہے ویسے بھی ٹانگ جڑنے کی شرح ذرا کم ہے۔ ہاتھ زیادہ فنکشنل چیز ہے لہٰذا اس پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شمس الحق صاحب نے بتایا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جذبوں اور پروفیشنل ازم کے ذریعے ہی ایسے کیس کیے جا سکتے ہیں اور فیسوں کے لالچ میں ایسا کرنا ناممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ کیس یورپ کے کسی ملک میں کیا جاتا تو سرجن لاکھوں روپے اپنی فیس لے لیتا... میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے یہاں ایک نیا باب رقم کیا ہے اور میں اس کا تمام تر کریڈٹ اپنے محترم استاد پروفیسر تحسین چیمہ کو دیتا ہوں۔

(ڈاکٹر شمس الحق طیب 1960ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی سعید الفطرت، سادہ مزاج اور انتہا درجہ کے ذہین تھے۔ سکول اور کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی شرکت کرتے اور تلاوت، نظم اور تقریری مقابلہ جات میں عموماً پوزیشن حاصل کرتے۔ متحمل مزاج، نیک سیرت اور نیک صورت ہونے کے ساتھ انسانیت کا درد رکھنے والے انسان تھے۔ ملک و قوم کی خدمت کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ فیصل آباد میں بطور آرتھوپیڈک سرجن تعین تھے۔ سن 2000 میں جب آپ الائیڈ ہسپتال سے ڈیوٹی کر کے گاڑی میں بیٹھے تو ایک شخص نے کہا کہ اس کی والدہ قریب المرگ ہے۔ چنانچہ آپ چل دیئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چند اور درندے بھی موجود تھے۔ جو آپ کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور بعد ازاں شہید کر دیا۔ آپ کی شہادت پر نہ صرف فیصل آباد میں سوگ کا سماں ہوا۔ بلکہ آج تک فلک اس معصوم کی شہادت پر نوحہ کناں ہے۔ انسانوں کو زندگی کی نوید دینے والے مسیحا کی زندگی ان ظالموں نے لے لی۔) (شفیق مراد)

آسماں سر پر زمیں نے دھر لیا۔ ظالموں نے جانے کس کا سر لیا

نوٹ۔ ڈاکٹر شمس الحق طیّب کی جس دن شہادت ہوئی اس وقت وہ ساحل ہسپتال میں جاب کیا کرتے تھے۔

نظم

''سفرِ آخرت'' میں موت کے حوالے سے ان کے عرفان و آگہی کا ایک اور ثبوت ؎

وقتِ نازک کچھ نہ پچھتا نے سے ہوگا فائدہ
روح کرنا قبض تو ہے موت کا اک قاعدہ
لاکھ منت کیجئے باتوں میں آئے گی نہیں
آ گئی تو جاں لئے بن گھر سے جائے گی نہیں
روح نکلے گی منوّر عرش پر لہرائے گی
خاک دولت اس جہاں کی خاک میں مل جائے گی

''حرف منوّر'' سے منوّر نے ثابت کر دیا ہے کہ نظم نگاری میں بھی وہ ایک قد آور اور اپنے وقت کے ایک ممتاز و معتبر شاعر ہیں۔

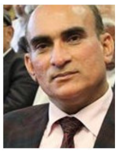

صفیہ سلطانہ کے افسانوں کے مجموعہ
'مشتِ خاک کا سفر' پر

تبصرہ۔ شفیق مراد، جرمنی

مشتِ خاک کا سفر جو لفظ ''کُن'' سے شروع ہوا اور پھر یہی سفر مختلف مراحل تہہ کرتا ہوا کبھی حسنِ ماہتاب تو کبھی جلوہ آفتاب بن کر انجانی منزلوں کی تلاش میں رواں دواں ہے۔ جس سفر کو کبھی رات کی خاموش گہرائیاں اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں تو کبھی دن کے ہنگامے اسے اپنے اکیلے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ سفر بانسری کی لے پر رقص کرتا ہوا جنگل کے درختوں اور باغ کے پھولوں کو عروسی نقاب سے ڈھانپ لیتا ہے۔ جس پر زندگی رقص کرتی نظر آتی ہے۔ ایسا رقص جس میں غموں، دکھوں، خوشیوں اور حسرتوں کی آمیزش ہوتی ہے جو کبھی شرافت کی پائل اور کبھی مجبوریوں کے گھنگرو پہنے راز ہائے سربستہ کا انکشاف کرتا ہے۔ مشتِ خاک کا سفر کبھی خوشبو کا سفر بنکر اسرار ورموز کھولتا ہے تو کبھی اپنے پُر اسرار مزاج سے زندگی کو خیرہ کر دیتا ہے۔ یہ خاک جب خاکدانِ جہاں میں مل جاتی ہے تو بھی اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ کبھی لالہ وگل کی شکل میں نمایاں ہو کر باغِ ہستی میں خوبصورتیاں بکھیرتی ہے تو کبھی خاردار جھاڑیوں کی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔

صفیہ سلطانہ کے اِس سفر میں اگر نغمے کا حُسن زندگی کی خوبصورتیوں کی علامت ہے تو ندی کی آہیں انکے دل پر دستک دے کر اُنہیں فہم وادراک کے وسیع سمندر میں اترنے پر مجبور کرتی ہیں یہاں شعورِ ذات اور علم و آگہی کے دُرِ نایاب اُنکی روح کو تازگی اور آنکھوں کو روشنی عطا کرتے ہیں۔ انہوں نے دہر کی ہنگامہ انگیزیوں پر قلم اُٹھاتے ہوئے اگر بہار کی پُر سرور صبح سے لطف اندوز ہونے کا منظر پیش کیا تو خزاں کی بے کیف دوپہر کو زندگی کا جزوِ لاینفک سمجھا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں شگفتہ قہقہوں، اضطراب کے لمحوں، ملن کی آس، جدائی کا خوف، بادِ سحر کے خوشگوار جھونکوں، دوپہر کی چلچلاتی دھوپ اور شام کے دھندلکوں کو اس سلاست اور روانی سے بیان کیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو افسانے کا کردار تصور کرتا ہے۔ صفیہ سلطانہ کے افسانوں کے کردار اشکوں کے غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں وہ انہیں گلاب کی پتیوں کی طرح نکھارنا بھی جانتی ہیں۔ اور پھر خود شبنم کے قطروں کی طرح ٹپک کر ان نکھرتی ہوئی پتیوں کے حُسن و جمال کی آرائش کرنا بھی جانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طوالت کے باوجود اُنکے افسانوں کے کردار اُنکی گرفت میں رہتے ہیں۔ وہ اس بات کا ادراک رکھتی ہیں کہ کس موڑ پر کس کردار کو بدلنا ہے کب مشتِ خاک کو خاکساری کا لبادہ پہنانا ہے تو کب اِس مشتِ خاک کے ایک ذرّے کو توڑ کر اسکی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ انکے افسانے معاشرتی مسائل، انسانی نفسیات اور رویوں کے کئی باب وا کرتے ہیں۔

''کربِ نارسائی'' کی شاعرہ
فہمیدہ مسرت احمد

ڈاکٹر نذیر فتح پوری: مدیرِ اعلیٰ ''اسباق'' پونے

شعر کبھی نہیں مرتا، کسی نہ کسی صورت میں، کسی نہ کسی دل میں پرورش پاتا رہتا ہے۔ پھول صرف بہار کے موسم میں کھلتے ہیں لیکن شعر گوئی کے لئے کوئی موسم مختص نہیں ہے۔ جب کسی حساس دل پر کوئی واردات گزرتی ہے، جب کہیں سے درد کا جھونکا آ کر کسی دل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو اظہار کے لب کھلتے ہیں۔ اور پھر درد لفظوں میں ڈھل کر شاعری کے پیکر میں نمودار ہونے لگتا ہے۔ یہ حساسیت فہمیدہ کے شعر کو زندگی بخش رہی ہے۔ شاعرہ نے کلاسیکی انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ ذیل کے دو اشعار ان کی سوچ و فکر کی گواہی دیتے ہیں، اور یہی رجحان و جذبات ان کے مجموعۂ اوّل ''کربِ نارسائی'' میں نظر آتے ہیں۔ یہ اردو غزل کے لئے ایک دیرینہ مگر خوبصورت، حسین اور با اثر تخلیقی صورت ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تم اس کی بے رخی پہ پریشاں ہو کس لئے
دل توڑنا تو اس کا سدا مشغلہ رہا
اک شخص جس کو دل سے بھلایا تھا بار بار
یہ دل کہ پھر اسی کو سدا سوچتا رہا

جب تک یہ فکرِ قلب باقی رہے گی اور جذبات کا یہ اظہار شعری پیکر میں ڈھلتا رہے گا، تب تک فہمیدہ مسرت احمد کے چمن میں تخلیقی پھول کھلتے رہیں گے، محبتوں کی خوشبوئیں بکھرتی رہیں گی، خلوص کے چراغ جلتے رہیں گے، خوبصورت و دلگداز اشعار کی تتلیاں رقص کرتی رہیں گی اور بھنورے گنگناتے رہیں گے۔ (فروری ۲۰۱۸)

ڈاکٹر نجمہ شاہین

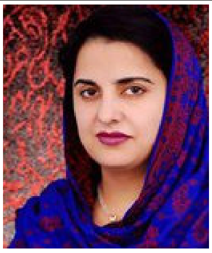

ان کی تصنیفِ ثانی
”میں آنکھیں بند رکھتی ہوں“
پر مختصر اظہارِ خیال مع ہدیہ ءتبریک

از ڈاکٹر منور احمد کنڈے، ٹیلفورڈ، انگلینڈ

خزینہ ءعلم وادب لاہور کے زیرِ اہتمام شائع شدہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ صاحبہ کا مجموعہ ءکلام ثانی ”میں آنکھیں بند رکھتی ہوں“ تین صد سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ دنیائے سخنوری میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جن میں انتساب کو بھی منظوم کیا گیا ہے۔

نجمہ شاہین کی یہ تصنیف بھی انہیں میں سے ایک ہے:

اسے کہو میں اس کے ذکر میں رہوں نہ رہوں
وہ ہے مرا حرفِ طلب، میرا انتساب پڑھ لے

”میں آنکھیں بند رکھتی ہوں“ کا گراں کتابی رنگ روپ اور اس میں موجود معیارِ نظم دونوں سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یعنی حُسنِ ظاہری سے بھی اور بیانِ باطنی سے بھی دورانِ مطالعہ حِظ اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ سخنوری کے گُلہائے حقیقت کی مہک پیہم دل و دماغ کو معطر کرتی، غزل میں خیالات کی پختگی اور نظم میں موضوعات کے تنوع کی موجودگی تخلیقات کو مزید زور آور بنا رہی ہیں:

تلخیاں اور بے بسی ویرانیاں۔ چار جانب ہیں عجب حیرانیاں
اے موجِ صبا اسے کہنا، اب کوئی نہیں جو اس کی راہ تکتا ہے !

ہر حقیقت پسند شاعر محبوبِ حقیقی کو رنگِ مجاز میں دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے، اور یہی خواہش اس کی شاعری کو معتبر و پُر اثر کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ نجمہ شاہین فرماتی ہیں: کاش کوئی تو ایسا لمحہ ہو۔ جس میں تُو مجھ کو حاصل ہو

ڈاکٹری کے مہان پیشے سے منسلک نجمہ شاہین یقیناً ایک مصروف انسان کا نام ہے جنہیں نصیب سے چشمِ بینا اور اشکِ سلامتی کے ہمراہ قلبِ پُرسوز و محبت حاصل ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں کے ذریعہ اپنے ہمعصر انسانوں کی لغزشوں کی آسانیوں کے لئے یوں دعا گو ہیں:

میں جی بھر کے روؤں میں آنسو پروؤں
میں حال اپنا رو رو کے اُن صلی اللہ علیہ وسلم کو سناؤں
اے خدا تو محتسب ہے مجھ پہ اک احسان کر
بھول کر لغزش مری یہ زندگی آسان کر
پاکیزگی کردار کو سلام۔

ان کی شاعری پر اس مختصر گفتگو کے بعد بطورِ ہدیہ ءتبریک ذیل میں ایک توشیحی نظم ڈاکٹر نجمہ شاہین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

ڈ۔ڈگر احساس کی کُھل جائے تو آگے قدم رکھوں
پھر اس کے بعد میں منزل کی سمتوں کا بھرم رکھوں

ا۔ ادب کی آبیاری فکر و فن کی آبیاری ہے
حقیقت میں یہ گلزارِ سخن کی آبیاری ہے

ک۔کرشماتِ سخن کے جلوے دیکھے بند آنکھوں سے
کئی خوابوں کے ہم نے چہرے دیکھے بند آنکھوں سے

ٹ۔ ٹھہر اے جذبہء دل یہ سخن کی ارجمندی ہے
نظر کے روبرو اب فکرِ شاہیں کی بلندی ہے

ر۔رسائی ہے کہاں تک کون بتلائے تصور کی
حدیں آخر کہاں تک کون سمجھائے تصور کی

ن۔ نئے احسا س کی حامل، نئے ادراک کی حامل
ہیں ایسی شاعرہ، قدموں میں جس کے ہے نئی منزل

ج۔ جبینِ وقت پر مہتاب کی صورت منور ہے
ترے اندر چمکتا اور دمکتا جو سخن ور ہے

م۔محبت کے جہاں کو روشنی بخشی ہے شاہیں نے
غزل ہو کر غزل کو زندگی بخشی ہے شاہیں نے

ہ۔ہما ری اور تمہا ری زندگی کا ماحصل” فن“ ہے
کہانی فن، فسا نہ فن ہے ، احساسِ غزل فن ہے

ش۔ شعورِ ذات کا اظہار ہے یہ شاعری کیا ہے
حسیں جذبات کا اظہار ہے یہ شاعری کیا ہے

ا۔ ادب میں با ادب ہو نے سے اونچا نام ہو تا ہے
جو سچّے کام کرتے ہیں تو سچّا نام ہوتا ہے

ہ۔ ہزاروں خوا ہشیں مٹّتی ہیں تب اک شعر ہو تا ہے
بھلا اتنی بھی آسانی سے کب اک شعر ہو تا ہے

ی۔ یہ لفظوں کے جواہر ہیں،لٹا تی جارہی ہو تم
سخن کی خوب فیاضی دکھاتی جارہی ہو تم

ن۔ نجمِ تقدیر کا نجمہ رہے گا ہر گھڑی روشن
دعا ہے یہ منوّر کی رہے تابندہ تیرا فن

منوّر احمد کنڈے
اور اُن کی نظم گوئی

رفیقؔ شاہینؔ

ڈاکٹر منور احمد کنڈے کا نام آج آسمانِ ادب پر مہرِ نیم روز کی طرح تاباں و درخشاں ہے۔ ان کا غزلیات پر مبنی مجموعہ ''بیدار دل'' اور ''طاقِ دل'' بھی منصب شہود پر جلوہ گر ہوکر اربابِ اہل سخن اور حلقہ شائقین سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آپ کا اُردو اور پنجابی زُبان پر کماحقہ شعری عبور حاصل ہے۔ اور ان کے پنجابی شاعری کے مجموعے ''باغاں دے وِچ کار'' اور ''پینگ ہلارے'' کو بھی شرفِ پذیرائی نصیب ہوا ہے۔ اوراب ''حرفِ منوّر'' قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

منور احمد ایک اعلیٰ ظرف باوضع حلیم الطبع منکسر المزاج خوش خلق خوش مزاج رقیق اُلقلب، نیک سیرت نیک دل دردمند اور نہایت ہی شریف اُلنفس انسان واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے انگلستان کے زیرِ فلک ہر طرف پھیلی ہوئی رنگین اور آزاد فضاؤں میں عیش وعشرت اور لطف وسرور کی عام سہولیات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا رشتہ صرف شعروادب تک ہی محدود رکھا۔ وہ پردیس میں رہتے ہوئے بھی دیس سے لائی ہوئی اُردو کے احیاو ترویج کے لیے بڑی لگن اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے تھوڑے ہی وقت میں اُردو دنیا میں اپنی شناخت بنالی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ ان کی شعری تخلیقات دنیا بھر کے ادبی ومعیاری رسالوں اور جریدوں میں تواتر سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ عالم گیر سطح کے عہد آشنا شاعر ہیں اور دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی اُردو کی بستیاں آباد ہیں منوّر احمد کنڈے کا نام نامی زبان زدِ عام ہے۔

منوّر نے غزلوں کے علاوہ نظم گوئی پر بھی زورِ قلم صرف کیا ہے اور ان کا نام نظم گو شاعر کی حیثیت سے بھی خاصہ روشن ہو کر سندِ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ نظم ایک قدیم صنف سخن ہے جس کا بنیادی رشتہ ہماری کلاسیکی شاعری کے ساتھ استوار ہے۔ باعتبار ہیئت نظم رباعی کی طرح بحر کی اور غزل کی طرح مخصوص ومنفرد وہیئت کی پابند نہیں ہے۔ موضوع اور مزاج کی مناسبت و مطابقت کے لحاظ سے نظم کی ہیئت شاعر خود ہی وضع کرتا ہے۔ قدما کی پابند نظمیں عام طور پر مسدس، مخمس اور مثنوی کی شکل میں پائی جاتی ہیں جبکہ عصرِ حاضر میں تو آزاد نظموں اور نثری نظموں کا چلن بھی زور پکڑ چکا ہے۔ مگر منوّر فقط پابند نظم کے ہی قائل ہیں کیونکہ وہ نثری نظم کو نثر ہی سمجھتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں نظم گوئی کا رواج اپنی انتہائی کو پہنچ چکا تھا انگریزوں کو ہندوستان سے بھگا کر مکمل آزادی حاصل کرنا۔ محنت کشوں اور مزدوروں کو ان کی محنت کا جائز حق دلانا اور معاشرے سے ناخواندگی اور غریبی کو دور کرنا ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد تھا لہٰذا عوامی بیداری کو ہوا دینے اور محنت کشوں سے خطاب کے لیے بجائے غزل کے نظم گوئی ہی موثر وموزوں ہتھیار ثابت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اسی دور میں خاص طور پر نظم کو عروج حاصل ہوا اور بڑے بڑے نظم گو شاعر عالم ظہور میں آئے جن میں ن۔م۔ راشدؔ، میراں جی اختر الایمان، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، جاں نثار اختر حفیظ جالندھری مخدوم محی الدین ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا نے جنگ آزادی کی لڑائی میں شریک ہوکر ہندوستان بھر میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ آخرش انگیز نے اپنی شکست قبول کرلی اور ہندوستان برس ہا برس کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کے بعد مکمل طور پر آزاد ہوگیا۔ لیکن برِصغیر کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ جو سنگین مسائل اسے آزادی سے قبل درپیش تھے وہ آج بھی بدستور موجود ہیں۔ آج بھی غریبی، بے روزگاری اور ناخواندگی کا دور دورہ ہے۔ جو مذہبی مخاصمت اور قومی تعصب آزادی سے پہلے برائے نام تھا دوقومی نظریے کی داغ بیل پڑ جانے کے بعد اب جنون اور وحشت و بربریت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ غریب آج بھی انصاف سے محروم ہے۔ عدم مساوات اور سیاسی تعصب کی فضا جو پہلے تھی وہ اب بھی بدستور موجود ہے۔ ادھر استعماریت اور عسکریت کا مغربی بھوت بھی مسلمانوں کے کئی کمزور ملکوں پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ لہٰذا منتشر عوام کو یکجا کر کے ظلم و بے انصافی کے خلاف محاذ قایم کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ ایسے میں نظم کی اہمیت اور ضرورت ہماری نظم میں جتنی کل تھی اتنی آج بھی ہے۔

آج جبکہ آزادی اور نثری نظموں کا رواج جڑ پکڑ چکا ہے ڈاکٹر منور احمد کنڈے نے انہیں صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنا رشتہ پابند نظم کے ساتھ استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بھی خیال اور مضمون کو برتنے کے لیے انہوں نے مثنوی کی ہیئت کا انتخاب کیا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں باانداز

مثنوی مطلعوں کی شکل میں تخلیق کی گئی ہیں۔حال ہی میں جرمنی کے سہ ماہی ''سمندر'' میں شائع ہوئی ان کی نظم ''بلبلے'' بھی ایسی ہی نظم ہے جو بے ثباتی حیات کے سُراغ کا استعارہ بلبلے کو گردانتی ہے۔ان کی نظموں میں ''بلبلے''، ''مزدور''، ''غربت''، ''بے روزگاری''، ''قوموں کا عروج و زوال''، ''شہرت''، ''شکر گذاری''،''بغداد پر اسرائیلی حملے''،''عریانی''،''نئی نسل کے نام''اور''محبت''ان کی مایہ ناز اور گرانقدر نظمیں ہیں۔

منورؔ کی نظموں میں ذرا سا تصنع اور پیچیدگی نہیں ہے۔اس کے برعکس ان کا طرز اسلوب اور زبان وبیان نہایت سادہ فطری اور دل آویز ہے۔وہ خیال وخواب کی دل کش جنتوں اور حور و پری کی خیالی اور فرضی محبتوں کی دل گداز داستانوں سے ماورا ہو کر اپنی حقیقی دنیا اور اپنے پاؤں تلے دبی ہوئی مٹی کی بو باس کو ہی اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔وہ حالات حاضرہ اور اپنے اطراف واکناف کے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی نظمیں عصری مسائل کی سنگینی اور موجودہ وقت کے اہم تقاضوں کا ہمیں بھر پورا احساس دلاتی ہیں۔عصری حسیت ان کی نظموں میں دل بن کر دھڑکتی ہے۔

گو کہ کائنات کا سارے کا سارا ارتقا پہئے (Wheel) پر ٹکا ہوا ہے برقی آلے اور ٹکنولوجی اپنی ترقی کے سفر میں انتہائی بلندیوں پر ہیں اس کے باوجود بھی مزدور کی اہمیت اور ضرورت کا معیار آج بھی وہی ہے جو کل تھا ۔مزدور کے بغیر نہ تاج محل تعمیر ہو سکتے ہیں اور نہ قطب مینار۔ یہ تو محض مزدوروں کے دو ہاتھوں کی ہی کرامت ہے کہ سنسان ویرانے خوبصورت شہر بنے ہوئے ہیں مزدور کے انہیں ہاتھوں نے نہریں نکالی ہیں۔پہاڑ کاٹ کر میدانوں میں بستیاں آباد کی ہیں۔مشرق سے مغرب اور شمال سے دکھن تک عظیم شاہراہوں کے جال بچھائے ہیں۔ریل کی پٹریاں زمین پر بچھا کر ملکی فاصلوں کے وجود کو فنا کر دیا ہے۔اب وہ مزدور جو ایسے ایسے عظیم کار نامے انجام دیتا چلا آرہا ہے وہ کس طرح حقیر ہو سکتا ہے؟ دیکھا جائے تو صحیح معنوں میں حقیر تو وہی معاشرہ ہے جو اس کی خدمات کے صلے میں نہ تو پہننے کے لئے اسے مکمل لباس مہیا کرتا ہے اور نہ بھر پیٹ روٹی۔وہ ایک حساس اور دردمند انسان بھی ہیں اس لئے انہوں نے اس کی خدمات کو نہ صرف دل کھول کر سراہا ہے بلکہ اس کی عظمت اور اس کے دکھ درد کو شدت سے محسوس بھی کیا ہے۔ان کی مقبول عام نظم ''مزدور'' مزدور کو جس طرح خراج عقیدت پیش کرتی عصر حاضر کو اگر اس بات پر فخر حاصل ہے کہ بلند آسمان کو مادی ارتقا کا استعارہ کہا جا رہا ہے تو دوسری طرف اس کی اجلی پیشانی پر اس کلنک کی گہری چھاپ بھی موجود ہے کہ روحانیت کی فلک بوس روشن مینار آج ریزہ ریزہ ہو کر تاریک پستیوں کے عمیق غار میں دفن ہو کر رہ گئی ہے۔فی زمانہ اقدار کی شکست وریخت سے اعلی اقدار کا مفہوم اور اس کے معنی ہی بدل کر رہ گئے ہیں۔اب اعلیٰ ظرفی، وضعداری اور شرافت کو حماقت سے منسوب کیا جا رہا ہے۔عیاری ومکاری اور اداکاری کو اب ہنرمندی اور فنکاری سے تعبیر کیا جا رہا ہے زرگری کے موجودہ کلچر میں بدترین گناہوں کو ثواب عظیم کا نام دیا جا رہا ہے۔تہذیب واخلاق کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔نیکی پر بدی کو ترجیح دی جا رہی ہے۔عریانیت اور فحاشی کی جو وبا کبھی یورپ اور امریکہ کی سرحدوں تک ہی محدود تھی اب پھیل کر مشرقی دنیا تک کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ بے حیائی بے عزتی اور بے شرمی کے عام رجحان نے جسموں سے کپڑے نوچ لئے ہیں۔جنسی بے راہ روی کو جسم کی ضرورت قرار دے کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔منور احمد کنڈے جو اعلیٰ معاشرے میں جنمے میں اور خود بھی اعلی قدروں کے حامل ہیں۔

صنعتی دنیا اور مشینوں کی حکومت میں رہ کر آج کے انسان نے مادی وسائل تو جٹا لئے ہیں لیکن غیر معمولی مصروفیت کے سبب آج وہ اپنی ذات کے خول میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔اپنی لامحدود ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آج کا انسان حصول زر کی ایک اندھی اور کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ میں شامل ہو کر اپنا سکھ چین کھو بیٹھا ہے۔دولت کی اندھی ہوس سے مغلوب ہو کر وہ اپنوں سے بھی بیگانگی پر مجبور ہے۔خون کے حقیقی رشتے بھی آج بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔آج کی ناخلف اولادیں اپنے ضعیف والدین کو بھی اپنے اوپر بوجھ سمجھنے لگی ہیں اور یہ سب اپنی تہذیب سے لاتعلقی اور اپنے تمدن سے انحراف کا نتیجہ ہے۔منورؔ اپنی معیاری نظم ''نئی نسل کے نام'' میں ایسے گمراہوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔

ہزاروں غموں اور ہزاروں بیماریوں کی ایک بیماری غربت کہلاتی ہے چاہے وہ ایشیا ہو یا افریقہ یا مشرقی دنیا کا کوئی تاریک خطہ جہاں جہاں غربت ہے وہاں وہاں دکھ درد کے خوفناک جہنم اپنے ہولناک جبڑے کھولے ہوئے لگا تار بھڑکتے ہوئے شعلے اور کثیف دھواں اُگل رہے ہیں اور ان میں جل رہے ہیں اپنے تمام مسلوں اور دکھ دردوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بھوکے ننگے فاقہ کش نادار اور خونی بلغم کھانستے دق زدہ بیمار،

غربت کی لعنت واذیت کے شکار یہ بدنصیب اپنی مرضی سے نہ جی سکتے ہیں اور نہ مر سکتے ہیں۔اس کے برعکس جہاں دولت کی رحمت کے گھنے سائے خیمہ زن ہیں وہاں عیش وعشرت اور لذت وسرور کی پرشباب پریاں اور دنیاوی زرق برق حوریں ”بھنگڑا“ اور ”ڈسکو“ ناچتے وقت اپنے نیم عریاں شباب سے پھوٹتی قوس وقزح سے نگاہوں میں رنگینیاں اور لہو میں بجلیاں دوڑا کر اپنے جلووں کے تماشائیوں کو مست و بے خود کرتی رہتی ہیں۔منور احمد کنڈے نے اپنی نظم ”غربت“ میں عسرت و افلاس اور غربت وناداری کا بنیادی سبب دولت کی غیر مساوی تقسیم قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے دولت وغربت اور جنت وجہنم کے تقابل کا منظر نامہ بھی بڑی چابکدستی اور فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔غربت وافلاس اور عسرت وناداری کا اہم سبب بے روزگاری ہے۔زندگی کی گاڑی پیسے کے پٹرول سے حرکت پذیر ہوتی ہے اور پیسہ روزگار کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔انتظامیہ کی بے راہ روی سفارش کے چلن اور رشوت کی بدعت کے سبب مستحق اُمیدوار روزگار سے محروم رہ جاتے ہیں جبکہ نالایق اور غیر مستحق اور نسبتاً کم ضرورت والے افراد صاحب روزگار بن کر داد عیش پاتے ہیں۔ملک میں روزگار مہیا کرنا اگر چہ حکومت کی ذمے داری ہے پھر بھی ملک میں بے روزگاری کا اژدہا اپنا منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ظاہر ہے روزگار نہ ملنے پر کوئی کب تک فاقے کرسکتا ہے۔مسلسل بھوک اور فاقوں کا نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ انسان قانون کو بالائے طاق رکھ کر جرائم پر آمادہ ہوجاتا ہے۔اور جب غریبی کے ستائے اور بے روزگاری کے مارے شہری ارتکاب جرم پر کمربستہ ہوجائیں تو سارا ملکی نظام ہی درہم برہم ہوکر رہ جاتا ہے۔منور احمد نے بے روزگاری کے اسباب اور اس کے مہلک وتباہ کن نتائج کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ان کی مقبول عام نظم ”بے روزگاری“ ایسے ہی تلخ وترش حقائق سے پردہ اُٹھاتی ہے۔نظم کا اثر انگیز اقتباس ملاحظہ ہو۔منور احمد کنڈے کی نظم ”شہرت“ جمالیات واخلاقیات کے وجدان کے ساتھ ہی ہمیں دعوت غور وفکر سے بھی سرفراز کرتی ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شہرت خدا کی دین ہے۔اگر یہ مقدر میں نہ ہوتو انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرہی کیوں نہ جائے یہ موت بھی نصیب نہیں ہوتی۔شہرت ظرف انسانی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بھی ہے۔شہرت پاکر کم ظرفوں کے قدم بہکنے لگتے ہیں اور ایسے لوگ دوسروں کی تحقیر کرکے خوشی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ان میں کفر عود کر آتا ہے اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ انسان خاک کا حقیر ذرہ اور پانی کا کمزور بلبلہ ہے۔اس کی زندگی کی کمزور عمارت اس کے سانسوں کے ستون پر ٹکی ہوئی ہے اور اُسے بھی کسی نہ کسی دن پیوند زمین ہوجانا ہے۔اُن کی موثر نظم ”شہرت“ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

گھڑی بھر کے لیے منورؔ کنڈے نے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ کو بھی اپنی شاعری میں نظم کیا ہے۔ان کی نظم ”قوموں کا عروج و زوال“ اسی قبیل کی نظم ہے۔انہوں نے اس نظم کے ذریعے قارئین کو یہ تاثر دیا ہے کہ طاقت اور حکومت کے نشے میں چور ہوکر جو قومیں خدا کی نافرمانی کرتی ہیں حق پر ناحق کو ترجیح دیتی ہیں وہ خدا کے قہر سے لمحوں میں فنا ہوجاتی ہیں۔قرآن شریف میں فرعون نمرود اور شداد کا عبرتناک انجام بھی اس حقیقت کی گواہی پیش کرتا نظر آتا ہے۔ان کی یہ نظم ہمیں غرور وتکبر اور کفر سے بچنے کی تلقین کرتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

منورؔ ادب اور مذہب کے ساتھ ہی سیاسی سوجھ بوجھ کے بھی مالک ہیں۔مغربی استعماریت اور عسکریت کے افغانستان اور عراق میں بے خوف وبیباک مظاہروں کا حال ساری دنیا نے دیکھا ہے۔مسلمانوں کی بے چارگی ولا چاری ہزیمت اور پسپائی کو منورؔ احمد نے شدت سے محسوس کیا ہے۔امریکہ کی جارحیت اور اسلامی ملکوں کی جی حضوری پر وہ تلملا اٹھتے ہیں۔لبنان اور فلسطین پر اسرائیلیوں کے ظلم وتشدد کا سلسلہ طولانی ان کے دل پر زخم لگاتا ہے۔اسرائیلوں کے بمبار طیاروں سے برسنے والے بموں کی بارش سے ارض فلسطین اور سرزمین لبنان پر مکانوں کے ملبوں تلے دبی ہوئی معصوموں کی لاشوں کے دل دہلا دینے والے خونی منظر دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔اس موضوع پر ان کی دو نظمیں ”لبنان پر اسرائیلی حملے“ اور ”وادئی لبنان پر قہر اسرائیل“ استعماریت پسند عسکروں کے خلاف اپنا احتجاج درج کراتی ہیں۔نظم ”وادی لبنان پر ہے قہر اسرائیل کا“ مناظر خوں تاب کا عکس اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ڈاکٹر منور احمد کنڈے کی تمام تر شاعری ظلم واستبداد کے خلاف ایک کھلا احتجاج پیش کرتی ہے۔وہ سیاست مذہب اور سماج میں پھیلی ہر برائی کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔وہ انسان کو ہر طرح کے اندھ وشواس تعصب ومنافرت اور جہالت وغربت سے اوپر لاکر اسے اخوت ومحبت انسانیت اور انسان دوستی کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں ان کی شاعری تعمیری ہے جو بدکرداروں اور گمراہوں کو راہ راست پر لانے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ (ختم شد) ***

شہزادہ قمرالدین مبشر

ایک صحافی ادیب وشاعر کا تعارف

نام شہزادہ قمرالدین مبشرؔ ہے اور قلمی نام ’’مبشر شہزادؔ‘‘ ہے۔ پیدائش پاکستان کے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مورخہ 22 ستمبر 1951ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اور نواحی شہر گوجرہ میں حاصل کی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے میٹرک اور پنجاب کے دیگر مقامات سے تعلیم کے سلسلہ میں نقل مکانی کی اور ایف اے تک صوبہ پنجاب میں قیام کیا۔

یونیورسٹی ٹیوٹوریل کالج لندن سے، بی اے آنرز کے بعد نارتھ ویسٹ لندن یونیورسٹی سے، ڈپلومہ ان جرنلزم کا کورس اُردو میڈیم میں کیا۔ 1975ء سے 1977ء تک لاہور ٹیلی ویژن اسٹیشن میں ٹی وی کیفے ٹیریا مینیجر، اس سے قبل کراچی کے قیصر ہوٹل اور شیزان انٹرنیشنل میں بطور کیشیر ملازمت کا آغاز کیا۔ چند سال کے بعد بعض انٹرنیشنل فرموں میں بھی ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ کراچی میں ملازمت کے دوران کئی اردو اخبارات میں بطور پریس رپورٹر بھی کام کیا۔ 1977ء میں پاکستان سے یورپ کیلئے روانگی ہوئی۔ دُنیا کے بہت سے ممالک اور ان کے تاریخی مقامات کی سیر وسیاحت کا موقع بھی ملا۔ ان ممالک میں افغانستان، ترکی، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی قابل ذکر ہیں۔ بعدازاں مشرقی برلن سے مغربی برلن اور پھر چند ہفتوں کے قیام کے بعد (مغربی) جرمنی کے تاریخی شہر نیورن برگ میں رہائش اختیار کی۔ جرمنی میں قیام کے دوران مشہور ومعروف انٹرنیشنل کمپنی AEG اور Lufthansa ایئرلائن میں ملازمت کرنے کے علاوہ ٹریول ایجنسی کا ذاتی کاروبار بھی کیا اور جرمنی کی دیگر کمپنیوں اور فرموں میں بھی ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ جرمنی میں قیام کے دوران متعدد اخبارات و رسائل اور جرائد میں دینی، علمی، مذہبی و اخلاقی مضامین تحریر کئے۔ 1985ء میں جرمنی سے ’’فرینڈز انٹرنیشنل‘‘ کے نام سے ایک اُردو رسالہ جاری کیا۔ اور اس میگزین کا خاکسار خود ہی پبلشر اور ایڈیٹر تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے رسالہ جاری نہ رہ سکا۔ علمی ذوق کی وجہ سے بے شمار تربیتی، علمی مضامین اور مراسلات قومی، ملکی اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں شعروشاعری میں بھی شغف رکھنے کی وجہ سے خاکسار کا کلام ماہنامہ صدا لندن، ہفت روزہ نوائے وقت، جنگ لندن، دی نیشن لندن اور پاکستان و بھارت کے اخبارات وجرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ فروری 2004ء سے 27 سال جرمنی قیام کے بعد ایڈنبرا کے نواحی علاقے روسائتھ میں قیام کے بعد جنوری 2005ء میں گلاسگو شفٹ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے شعر وادب کا ذوق وشوق بچپن سے ہی ہے۔ 1968ء میں M.K.A ایسوسی ایشن پاکستان میں سالانہ اجتماع کے موقع پر تقریری مقابلہ معیار اوّل میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ 1988ء میں M.K.A ایسوسی ایشن لندن میں پانچویں یورپی اجتماع کے موقع پر سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر تقریر کرکے تقریری مقابلہ میں یورپ میں اول پوزیشن حاصل کی۔ 2007ء میں ایک معروف ادبی تنظیم بزم شعر ونغمہ کی جانب سے یوم پاکستان کے موقع پر 14 اگست یوم پاکستان کے حوالہ سے نظم لکھنے کے مقابلہ میں سکاٹ لینڈ میں اول پوزیشن حاصل کی۔ 2008ء میں N.H.S کے ذیلی ادارہ ’’پروجیکٹ امپاور‘‘ کے زیر اہتمام معذور افراد کی دیکھ بھال کے بارے میں نظم اور مضمون نویسی کے مقابلہ میں سکاٹ لینڈ میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ 2009ء سے گلاسگو سکاٹ لینڈ کے ایشین ریڈیو اسٹیشن ’’آواز ایف ایم‘‘ کے پروگرام علم وادب کا پریزنٹر مقرر ہوا۔ 2011ء میں گلاسگو میں ایک نئی قائم ہونے والی ادبی تنظیم بزم علم وادب کا چیئرمین مقرر ہوا۔ 2012ء میں گلاسگو سکاٹ لینڈ سے شروع ہونے والے ایک نئے اردو ادبی میگزین سہ ماہی علم وادب کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔

2013: سکاٹ لینڈ کی سیر کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا جو کہ بعد میں ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔ 2014ء: ملکہ برطانیہ کی طرف سے ایڈنبرا میں گارڈن ٹی پارٹی میں شمولیت کی اس سے چند سال قبل گلاسگو میں بھی آواز ایف ایم کی انتظامیہ کے ہمراہ ملکہ برطانیہ سے ملاقات کا تاریخی موقع ملا۔

2018ء: حرف مبشر کے عنوان سے اردو مجموعہ کلام شائع کیا۔

2019ء: ہم اور ہمارا خاندان کے موضوع پر خاندانی تاریخ کے بارے میں کتاب شائع کی۔ 2020ء: جنگ جمل۔ وجہ واقعہ اور اس کے اثرات کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔ اسی سال قندیل ادب انٹرنیشنل لندن کا نائب مدیر مقرر ہوا۔ 2021ء: صحابہ رسول ﷺ کا عشق الٰہی کے عنوان سے مقالہ لکھا اور مقالہ نویسی کے مقابلہ میں برطانیہ میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ جو 6 مارچ 2022ء کو روزنامہ امن انٹرنیشنل گلاسگو سکاٹ لینڈ سے اجراء کیا۔ 2022ء: اپنے پیر مُرشد کی زندگی کے حالات اور خلافت کی برکات کے حوالے سے مقالہ تحریر کیا۔ 2023ء: 27 مارچ 2022ء بزم شعر ونغمہ گلاسگو کی جانب سے اعزازی سند۔ دی گئی اور پوئٹری کی کتاب ’’حرف مبشر‘‘ کی

رونمائی بھی کی گئی۔ 6 ستمبر 2022ء کو ورلڈ سپورٹ کمیونٹی کلب کی جانب سے بیسٹ مسلم ایوارڈ دیا گیا۔ دسمبر 2022ء ''ہم اور ہمارا خاندان'' کے موضوع پر خاندانی تاریخی کتاب کا انگریزی ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ شعر و ادب سے ذوق و شوق بچپن سے ہی ہے۔ نوجوانی میں اہل ادب ہستیوں کی صحبت سے حد درجہ فیضیاب ہوا۔ ان میں سے کئی حضرات سے ذاتی رفاقت بھی رہی ،جن میں ڈاکٹر منور احمد کنڈےؒ، لئیق احمد عابدؒ، جمیل الرحمن جمیل، پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالدؒ، اور سید خالد احمد شاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن مخصوص شناساؤں میں جناب ثاقب زیروی صاحب اور عبید اللہ علیم صاحب کی صحبت نے میرے کلام میں زیادہ تقویت بخشی، پی ٹی وی لاہور میں ملازمت کے زمانے میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی محفلوں میں بہت کچھ سیکھا۔ صحافت میں دلچسپی ثاقب صاحب کی وجہ سے رہی، جس کیلئے میں ان کا ہمیشہ احسان مند اور دعا گو رہوں گا۔ اللہ ان کو فردوسِ بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ کراچی میں ہمارے ہمسائے ہر طبقۂ فکر میں ہر دلعزیز جناب عبید اللہ علیم کی مترنم شاعری سے ہمیشہ محظوظ ہوا۔ بچپن میں یہ شعر میں عموماً گنگنایا کرتا تھا:

چاہتا ہوں کہ دُنیا میں میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

باقاعدہ شاعری کا آغاز یورپ میں ہی آ کر کیا۔ میں جرمنی میں 28 سال رہا اور سکاٹ لینڈ میں 2004ء سے رہ رہا ہوں۔ کیفیتِ قلبی کا اظہار کسی نہ کسی رنگ میں بہرحال ہوتا رہا ہے۔ میری شاعری کا پہلا مجموعہ ''حرفِ مبشر'' پیش خدمت ہے۔

میرے نزدیک شاعر کا مطلب کسی صاحبِ شعور شخص کا نام ہے جو اپنی طبیعت میں غم و غصہ، خوشی و مسرت اور دیگر احساسات کی کیفیات کو منظور کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک شاعری کی بات ہے شاعری بلکہ اچھی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری کو انسانی کیفیات کے اظہار کا موثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ''حرفِ مبشر'' اسی پس منظر میں ایک چھوٹی سی جھلک آپ کی خدمت میں پیش ہے جس میں دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے اشعار اور مافی الضمیر خیالات کا اظہار مختلف حمدیہ، نعتیہ کلام اور نظموں اور غزلوں کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ امید ہے کہ آپ قارئین میری اس ادنیٰ سی کاوش کو پسند کریں گے اور میری حوصلہ افزائی بھی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا عطا فرمائے۔ بہت بہت شکریہ۔

(ادارہ)

امریکہ میں اردو کا سفیر
عبدالقادر فاروقی

ڈاکٹر محمد زاہد

زبان و ادب سے محبت کا شوق ہمیشہ انسان کے پاؤں کی زنجیر بنا رہتا ہے۔ آدمی اپنے وطن سے چاہے جتنی دور چلا جائے اسے اپنوں کی یاد بے قرار کئے رہتی ہے۔ مادری زبان سے وابستگی روحانی غذا کا درجہ رکھتی ہے۔ لوگ دفتر اور کاروبار میں رہ کر چاہے کسی اور زبان کو وسیلہ بنائیں لیکن گھر میں آ کر اپنی زبان میں گفتگو کرنا، گانے سننا، ٹی وی کے پروگرام دیکھنا، کتابیں پڑھنا، انٹرنیٹ پر اپنی دلچسپی کی سائٹس (SITES) تلاش کرنا، ای۔میل کا جواب دینا الگ فرحت بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادب کے دیوانے دنیا کے جس خطے میں موجود ہیں وہ اپنے وزن کا احساس دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ہر براعظم میں اور ہر ملک میں ایسے افراد کی معقول تعداد نظر آتی ہے۔ امریکہ ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ یہاں تقریباً تیس کروڑ لوگ بستے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر انگریزی بولتے ہیں، اسکے بعد ہسپانوی میں گفتگو کرنے والوں کا نمبر آتا ہے۔ اردو بولنے والے تقریباً تیس لاکھ ہیں جو نیویارک، شکاگو، لاس اینجلرز، ہوسٹن، واشنگٹن، سان فرانسسکو، میامی وغیرہ جیسے بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ ہر شہر میں اردو انجمنیں ہیں جو وقتاً فوقتاً پروگرام منعقد کرتی رہتی ہیں۔ حلقۂ فن و ادب اور اردو انجمن (نیویارک) اردو مرکز (لاس اینجلرز)، بزم سخن (کیلی فورنیا)، ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ (شکاگو)، علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن، ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی وغیرہ اپنے ذاتی وسائل کا استعمال کر کے شعری اور نثری نشستوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ برصغیر سے ہجرت کر کے امریکہ میں جن قلم کاروں نے اردو ادب کو آب و تاب بخشی ہے ان میں مامون ایمن، فیروز عالم، رشیدہ عیاں، عبدالقادر فاروقی، اشرف شیخ، اخلاق احمد خاں، یونس کھوکھر، عبدالرحمن عبد، انور علی رومی، توفیق انصاری، جاوید ریاض، حسن چشتی، حامد امروہوی، سید شاہ نعیم الدین، رضیہ فصیح احمد، غوثیہ سلطانہ وغیرہ خاص ہیں۔ اسکے علاوہ رضا نقوی، صلاح الدین ناصر، مبین منور، شائستہ سید ایمن، غوث

متھراوی، نسیم جلالوی وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے۔

عبدالقادر غیاث الدین فاروقی ان قلم کاروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے مضامین اور افسانوں سے اردو کے چراغ کو نیویارک میں روشن کررکھا ہے۔ آپ کی پیدائش یکم جولائی ۱۹۴۷ء کو بیجاپور، کرناٹک میں ہوئی۔ آپ نے بی۔کام کرنے کے بعد ادب کی طرف توجہ دی اور بی۔اے، ایم۔اے نیز پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ ابتداء میں مشہور تعلیمی ادارے انجمن اسلام، بیجاپور سے وابستہ ہوئے۔ اسکے بعد انجمن آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور میں شعبۂ اردو، فارسی، عربی میں استاد اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ کافی دنوں تک انہوں نے کرناٹک یونیورسٹی، دھارواڑ میں شعبہ اردو، فارسی میں پی ایچ۔ڈی گائیڈ کا فریضہ انجام دیا۔

۹۰ء کی دہائی میں آپ امریکہ منتقل ہوئے اور وہاں شعبۂ فلاح و بہبود اور صحت عامہ، نیویارک میں ابھی تک خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ ۹ کتابوں کے مصنف ہیں۔ بیجاپور سے موصوف کی حیات وکارنامے پر پی ایچ۔ڈی کی جارہی ہے۔ کئی رسالوں مثلاً سہ ماہی اسباق، پونے، جدید رہنمائے تعلیم، نئی دہلی وغیرہ نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خصوصی گوشہ مرتب کیا ہے۔ شائع کیا ہے۔ شولاپور، مہاراشٹر میں ان کے نام پر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا ہے ساتھ ہی ان کے فن وشخصیت پر دو سیمینار وجشن منعقد ہو چکے ہیں۔ موصوف کی جن کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے وہ یہ ہیں۔ اردو شاعری میں تصوف، (جوان کا ڈاکٹریٹ کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے)، اعجاز (مذہبی مضامین کا مجموعہ)، مینار ادب (مضامین کا مجموعہ)، مضامین فاروقی (اصلاحی مضامین کا مجموعہ)، گوہر ادب (مضامین کا مجموعہ)، کنیڈا، متحدہ ریاست امریکہ میں خواتین کی اردو خدمات (تحقیقی مضمون)، امریکہ میں انوار اردو (ادبی مضامین کا مجموعہ)، امریکہ میں گلزار اردو ادب (ادبی مضامین) نیز ''خون جلتا رہا'' (افسانوں کا مجموعہ) ان کتابوں میں سے ہر ایک پر مفصل مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ عبدالقادر فاروقی کی اہم تصنیف ''اردو شاعری میں تصوف'' ہے جس کے لئے انہیں پی ایچ، ڈی کی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ یہ کتاب ۶۷۹ صفحات پر ہے اور کئی ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے چند یہ ہیں۔ اردو شاعری میں مذاق تصوف اور شاعری پر فارسی و عربی اثرات، تصوف کی آفاقیت، اردو شاعری کا صوفیانہ تجزیہ، تصوف اور اصناف سخن، صوفیانہ اردو شاعری کی ادبی حیثیت وغیرہ۔ یہ عنوانات ہی بتاتے ہیں کہ مصنف نے کتنی گہرائی اور باریک بینی سے تصوف کی تاریخ، اسکے عالمی اشکال، ہندوستان میں اس تصور کی آمد، درویشوں اور شاعروں میں اسکا نفوذ اور پھر عربی، فارسی اور اردو شاعروں کے کلام میں صوفیت کے اثرات اور اسکی ادبی اہمیت کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان کے ارتقائی مراحل سے آشنا کرنے کے ساتھ اردو شاعری کی تاریخ کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ امیر خسرو، ولی دکنی، میر درد، مرزا غالب، علامہ اقبال، اصغر گونڈوی، جوش ملیح آبادی سے لے کر حال تک کے شاعروں پر صوفیت کے اثرات پڑے ہیں جس نے ان کی شاعری کو کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر کیا ہے۔ یہ کتاب عبدالقادر فاروقی کا بہترین تعارف کراتی ہے جسکے نتیجہ میں خود ان کی شخصیت ایک صوفی کی طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔

''امریکہ میں انوار اردو'' ۲۶۷ صفحات پر مشتمل وہ کتاب ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ڈاکٹر فاروقی کے ۲۲ مضامین شامل ہیں جن میں سے چند کے عنوانات یوں ہیں۔ امریکہ میں اردو کا خوبصورت منظر نامہ، اشرف شیخ بحیثیت کالم نویس، حساس زبان کی شاعرہ ڈاکٹر حنا خاں، اردو ادب کے طنز ومزاح میں اخلاق احمد خاں، للت اہلو والیہ بحیثیت اردو شاعر، شاعر غزل پرداز، من موہن عالم، شاعر عشق نبوی، صلاح الدین ناصر، عظمت افسانہ ڈاکٹر آصف الرحمن طارق، رباعیات پروفیسر مامون ایمن، صوفی شاعر اور ادیب، غوث متھراوی وغیرہ۔ ان مضامین سے ہم دیار غیر میں اردو کا علم بلند کرنے والے قلم کاروں کی شخصیت اور ان کی خدمات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ خواتین بھی ہیں اور حضرات بھی۔ مامون ایمن اور رشیدہ عیاں جیسے مسلسل چھپنے والے فنکار ہیں تو حنا خان اور اشرف سہیل جیسے کم چھپنے والے لوگ بھی۔ ڈاکٹر فاروقی نے بڑی محبت اور نفاست سے ان کے فن پاروں کا جائزہ لیا ہے۔ کسی پر تنقید بھی کی ہے تو برائے نام۔ شاید وہ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے۔ اس کتاب کا پیش لفظ مشہور ادبی شخصیت ضیاء کرناٹکی نے لکھا ہے اور فاروقی صاحب کے مضامین سے اقتباسات نقل کرکے ان کے فن کی داد دی ہے۔ ''امریکہ میں گلزار اردو ادب'' ۱۹۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی

ہے۔اس کتاب میں تین انٹرویوز اور ۱۸ مضامین شامل ہیں۔امریکہ کے قانون داں آنند آہوجا،مشہور ادیب وشاعر پروفیسر مامومن ایمن اور مقبول نعت گو شاعر صلاح الدین ناصر سے لئے ہوئے انٹرویوز ہیں اور جن قلم کاروں کے فن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ان میں رضا نقوی، ارشد سلام، پروفیسر حماد خاں، پروفیسر سید یوسف حسینی، ممتاز حسین، نسیم جلالوی، صفوت علی صفوت، مشیر طالب، ڈاکٹر عبدالرحمن عبد، پروفیسر خالدہ ظہور، ڈاکٹر بلند اقبال، مبین منور وغیرہ شامل ہیں۔اردو کے شیدائی آنند آہوجا سے لیا ہوا انٹرویو مسلم دور حکومت میں حکمرانوں کی فراخ دلی اور رعایا کے ساتھ ان کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے جسکی وجہ سے کبھی فساد کی نوبت نہیں آئی۔انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے ذریعہ لوگوں میں نفرت کے بیج بوئے اور اسکے لئے اہل قلم کا سہارا لیا۔پروفیسر مامون ایمن جو انگریزی کے استاد ہیں، انہوں نے شمالی امریکہ میں اردو کی ترقی وترویج میں کتنی کاوشیں کیں جسکے نتیجے میں بہت سارے اہل قلم سامنے آئے اور اردو کی محفلیں سجائی جانے لگیں۔بزرگ شاعر ونثر نگار صلاح الدین ناصر ۸ شعری کتابوں کے خالق ہیں اور ''زندگی ایک سفر'' خودنوشت کے مصنف ہیں۔انہوں نے سالانہ نعتیہ مشاعروں کی روایت کو فروغ دیا اور ۲۰۰۸ء تک دس مشاعرے کئے جن کے ذریعہ اس صنف ادب کو امریکہ میں استحکام حاصل ہوا اور شاعروں میں نعت گوئی کا جذبہ توانا ہوا۔

اس کتاب میں شامل مضامین سے فنکاروں کے حالات بھی سامنے آتے ہیں۔رضا نقوی شاعر ہونے کے ساتھ باکمال مصور اور خطاط بھی ہیں، ممتاز حسین ایک اچھے افسانہ نگار ہونے کے علاوہ مصوری کے ذریعہ کائنات کی خوبصورتی کو سمیٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔صفوت علی سائنس داں بھی ہیں اور شعری مجموعہ ''سوادحور'' کے خالق بھی۔میاں عبدالمجید کامیاب شاعر، ادیب اور مترجم ہیں جن کی تصانیف کف قاتل، مستند اور فریادوفغاں' اردو ادب میں اضافہ ہیں۔خالدہ ظہور بلوچستان یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسر بننے کے بعد امریکہ پہونچیں اور اپنی تنقیدی بصیرت کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ڈاکٹر بلند اقبال کی افسانوں کا مجموعہ ''فرشتے کے آنسو'' ان کی تخلیقی صلاحیت کا غماز ہے۔تحقیق، تنقید اور تبصرے کی راہ سے ہو کر عبدالقادر فاروقی تخلیق کے نخلستان میں وارد ہوتے ہیں اور ۲۰۰۶ء میں اپنے افسانوں کا مجموعہ ''اور خون جلتا رہا'' پیش کرتے ہیں۔اس کتاب میں ۲۱ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔۱۵۱ صفحات پر مشتمل تصنیف کا پیش لفظ محمد اعظم شاہد (دکن۔کرناٹک اردو اکیڈمی) نے تحریر کیا ہے اور فاروقی صاحب کے مشاہدات اور تجربات کی داد دی ہے۔''پہلی بات'' کے عنوان سے مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔افسانے کے عنوانات یوں ہیں۔یتیم کی عید، سسکتی آرزو، زندگی کی بھیک، تقدیر کا قتل، بوائے فرینڈ، کروٹ، بلندی، جورو ریٹائرڈ ہوگئی، زخمی پھول، بجھتے چراغ، خونی عید، روٹی کے ٹکڑے، باسی پھول، دوگز زمین، نیز آخری انسانی، اور خون جلتا رہا، جو کتاب کا نام بھی ہے۔

ڈاکٹر فاروقی نے نیویارک میں بیٹھ کر عالمی حالات کا جائزہ لیا ہے۔عیش وعشرت سے بھرے ماحول کی زہریلی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔امن کے نام پر برپا خونی جدوجہد کو طشت ازبام کیا ہے۔ان کے کردار حقیقی ہیں۔''یتیم کی عید'' کی صباح نہیں جانتی کہ اس کے ہنستے کھیلتے گھر کو راکھ ایک رات میں کس نے بنادیا۔''سسکتی آرزو'' کی پمیلا عرف ریشما خود اپنے والدین کی آزاد خیالی کی بھینٹ چڑھ گئی۔''بوائے فرینڈ'' کی سلمیٰ نہ اپنے شوہر کی ہوئی نہ بوائے فرینڈ کی۔''کروٹ'' میں مغرب زدہ فریدا پنے آپ کو 'فرائٹ' کہلانے پر فخر محسوس کرتا ہے۔''میٹھا زہر'' کا اقبال عروج سے زوال کی طرف آتا ہے تو خود اسکی بیٹی فاحشہ بن کے اسکے سامنے آتی ہے۔''خون پکارا ٹھا'' کی سائرہ کے جسم کو وحشی فوجیوں کے ایک ٹرک نے کچل دیا۔''باسی پھول'' کے مولانا صاحب ۶۰ سال کی عمر میں جب پانچویں شادی کرنا چاہتے ہیں تو طلاق شدہ لڑکی کے بارے میں سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔اس حقیقت نگاری کے لئے عبدالقادر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ڈاکٹر فاروقی نے اپنی ایک تصنیف میں امریکہ اور کینیڈا کی خواتین کی اردو خدمات کو قلم بند کرکے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اسی طرح ان کے مذہبی اور اصلاحی مضامین کے مجموعے بھی قابل قدر ہیں۔امید کرتے ہیں کہ ان کا قلم اسی طرح الفاظ کے موتی بکھیرتا رہے گا اور آئندہ مزید کتابیں منصۂ شہود پر آئیں گی۔۔۔

آئین پاکستان اور فکرِ قائد میں تضاد کیوں؟

رانا محمد حسن ایڈیٹر سہ ماہی پیشوا لندن

کبھی ناکامیوں کا اپنی ہم ماتم نہیں کرتے
مقدر میں جو غم لکھے ہیں ان کا غم نہیں کرتے

وطن عزیز میں جاری بدترین صورت حال کی وجوہات پر بات کرتے ہوئے خاص و عام کی زبان جلتی ہے۔قائد اعظم کی تصاویر کو تو پاکستان کے درو دیوار اور دفاتر کی دیواروں پر آویزاں کر کے ان سے عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے اور ان کے افکار کا اپنے عمل سے مذاق اڑایا جاتا ہے۔قائد اعظم کا شاندار مزار دنیا کے عظیم لوگوں کے مزاروں کا منہ چڑاتا ہے۔ہم نے گاندھی کی یادگار، ابراہم لنکن، چرچل، گوئٹے، بسمارک، ہٹلر، گاندھی اور دوسرے بہت سے عظیم لوگوں کے مزاروں کو دیکھا تو حیران رہ گئے کہ یہ لوگ جن کے مزار معمولی نوعیت کے ہیں۔ان کی قوموں نے قبروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان کے افکار سے فائدہ اٹھا کر ترقی کے زینے چڑھ کر معزز کہلائیں۔زندہ قومیں اپنے قائدین کو مرنے کے بعد قبر میں اتارتی ہیں ان کے افکار کو نہیں۔ جب ہم آدھا پاکستان گنوا کر بچے کھچے پاکستان کی حالت زار کو دیکھتے ہیں تو دل بیقرار ہو کر صرف یہی کہتا ہے کہ ہماری خستہ حالی اور اخلاقی دیوالیہ پن کی سب سے بڑی وجہ بابائے قوم حضرت محمد علی جناحؒ کو ان کے افکار سمیت دفن کر کے منافقت کا مزار تعمیر کرنا ہے۔ان کے افکار کیا تھے اور انکی کیا اہمیت ہے؟ یہ سب بھلا کر نفرت، تعصب، کرپشن، جھوٹ، منافقت، عداوت، سفارش، بدکرداری، ناانصافی اور فرقہ واریت جیسی لعنت کو گلے کا ہار بنا لیا گیا ہے۔قائد اعظم جن خصوصیات سے مالا مال تھے ان خصوصیات کو صرف ان کی تصویر تک محدود کر دیا گیا ہے۔وہ احراری، مودودی پارٹی اور دوسرے پاکستان و قائد اعظم مخالف مولوی آج بھی پاکستان اور قائد اعظم کے دشمن ہیں۔قائد اعظم کے مزار پر آج تک نہ جانے والے مولوی اسلامی نظام کا دیپ جلانے کے چکر میں قوم کو چکر پر چکر دے کر ان کی موت کا سامان کر رہے ہیں۔کسی بھی ملک کا آئین قوم کی سوچ کا عکاس ہوتا ہے۔پاکستان نامکمل آئین کے گھوڑے پر سوار ہو کر ۱۹۷۳ء تک پہنچا۔متفقہ آئین کی تشکیل تب ہوئی جب آدھا پاکستان نفرت اور عصبیت کی نظر ہو چکا تھا اور دو قومی نظریہ زخمی ہو کر کراہ رہا تھا۔ہم نے قائد اعظم کے پاکستان کو اسلامی ریپبلک آف پاکستان کا چوغہ پہنایا اور پھر اسے اتار کر اسلامی جمہوریہ نام کی چادر اوڑھا کر دنیا کے سامنے بٹھا کر بھیک منگا بنا دیا۔وہ آئین جو شہریوں کو برابر کے حقوق نہیں دیتا وہ ہمیشہ برباد حال رہتا ہے۔۱۹۷۳ء میں آئین پاکستان تشکیل دیا گیا اور ۱۹۷۴ء میں بھٹو نے ایک چھوٹی سی جماعت کو غیر مسلم قرار دے کر ان کے ضمیر کی آواز کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ یہ سوال آج تک گردش میں ہے کہ کیا ریاست کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت کر سکتی ہے اور کیا ایک کلمہ گو کو جو صدق دل سے اللہ کی واحدانیت کا اقرار اور رسول اللہ ﷺ پر مکمل ایمان رکھنے کا دعوے دار ہو اور خود کو مسلمان کہتا ہو اسے ریاست کسی بھی اختلاف رائے پر غیر مسلم قرار دے سکتی ہے؟ جبکہ رسول خُدا ﷺ نے اپنے اوپر حملہ آور ہونے والے اور ظلم کرنے والے جانی دشمنوں کے متعلق فرمایا ہے:

''اب بھی اگر یہ کلمہ توحید پڑھ لیں تو ہم سے اُن کی کوئی لڑائی نہیں۔''

(بخاری کتاب الایمان)

جس کو ہر قوم کی تہذیب گوارا کر لے
ایسا دستور کوئی سامنے لاؤ یارو

قائد اعظم نے نہرو رپورٹ پر ان کی تجاویز رد کر دیئے جانے پر فرمایا تھا: 'جب تک اقلیتوں کو اس امر کا یقین نہ ہو کہ انہیں حکومت اور اس کے آئین کی رُو سے بہ طور ایک وحدت کے اپنے مفادات کا تحفظ حاصل ہو گا۔اس وقت تک وہ کبھی ایسے آئین کی حمایت نہیں کر سکتیں قطع نظر اس سے کہ وہ آئین کیسا ہی قابلِ نمونہ اور کہنے کو کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو۔اس سوال کا جواب کہ کون سا دستور کامیاب ہو گا، یہی ہے کہ وہ دستور جس میں اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ورنہ کوئی بھی دستور دیرپا اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ ملک انقلاب اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے۔''

(قائد اعظم۔دی اسٹوری آف اے نیشن۔صفحہ ۲۰۸۔بحوالہ تاریخ نظریہ پاکستان از پیام شاہجہان پوری۔صفحہ ۲۱۱۔۲۱۲)

قائد اعظم کے اس فرمان کو آئین پاکستان تشکیل دینے والوں نے درخود اعتناء نہیں سمجھا اور کوئی توجہ نہ دی۔جب تک آئین پاکستان ارتقائی سفر میں تھا اس وقت تک امید کا دیا روشن تھا کہ آئین تشکیل پا کر قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے گا۔مگر متفقہ آئین نے امیدوں کے سبھی چراغ گل کر دیے۔جنرل ضیاء الحق نے روشنی کی طرف جانے کے تمام راستے بند کر

کے قوم کو ظلمت کے انتہائی تاریک غار میں اس وقت چھینک دیا جب اس نے آئین پاکستان میں بھٹو کی جانب سے کھولی جانے والی منحوس بوسیدہ اور بدبودار کھڑکی کے راستے داخل ہو کر آئین پاکستان کی عصمت دری ۹۰ سے زائد بار کی۔ آج بھٹو اور ضیاء الحق کی آئین پاکستان سے رنگ رلیاں قوم کو ہر سطح پر رسوا کر رہی ہیں۔ ان دونوں کی آئین سے قربت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے سانپ کی طرح بلا تفریق مذہب و ملت سبھی کو ڈس رہے ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ ضیاء الحق کا سیاسی بیٹا بھی اپنے سیاسی باپ کی آئینی ترمیم پر نوحہ کناں ہے۔ فیض آباد دھرنا ہو یا پیر حمید الدین سیالوی کی دھمکیاں، ووٹروں اور ووٹ لینے والوں کا لینا دینا ہو، سلمان تاثیر کا قتل ہو یا پھر ممتاز قادری کی پھانسی، کرپشن کی بہتات ہو یا ملاوٹ کا عام رجحان، سفارش کی لعنت ہو اور یا فرقہ واریت کا منحوس شجر ہو یا کافر کافر اور مسلمان مسلمان کا کھیل ہو اور دوسری بہت سی نحوستیں اسی آئین کی پیداوار ہیں۔ اس آئین میں جتنے طریقے ملزم کرنے کے ہیں اس سے کہیں زیادہ آئینی تشریحات ملزم کو معصوم قرار دینے والی ہیں۔

چہروں پہ زر پوش اندھیرے پھیلے ہیں
اب جینے کے ڈھنگ بڑے ہی مہنگے ہیں

مولوی، فوج اور عدالتی نظام کی بدمعاشی بھی اسی آئین کی دین ہے۔ سیاسی مداری تو نہ کسی کی سنتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔ اپنے مفادات کے لیے جاہل مولویوں کو بھی بڑے بڑے القابات اور عہدوں سے نوازتے ہیں۔ کبھی فوج کی جھولی میں بیٹھ کر انگوٹھا چوستے ہیں، اور کبھی فوج کے وجود کو بھی گالی سمجھتے ہیں۔ عدالت ان کے حق میں فیصلہ دے تو جج معزز اور عدلیہ آزاد اور انصاف کے پھول نچھاور کرنے والی اور فیصلہ خلاف آئے تو جج بھی منحوس اور عدلیہ بھی ناسور۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ آئین کی شقوں کو بنیاد بنا کر مذہبی، سیاسی، فوجی اور عدالتی شخصیات باہم دست و گریباں ہو کر جگ ہنسائی کا باعث بنتی ہیں۔ ابھی تک آئین کی رو سے کسی ادارے کے بھی حدود و قیود کو متعین نہیں کیا جا سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک آئین میں موجود سقم ایمانداری سے دور نہیں کیے جاتے اس وقت تک اداروں کی آپسی لڑائی، قوم کو برباد حال کرتی چلی جائے گی۔

آئین پاکستان میں قرارداد مقاصد کا شامل کیا جانا قائداعظم کے واضح ارشادات کی نفی ہے۔ قائداعظم نے پاکستان کے تمام شہریوں کو برابر حقوق دینے کی بات کی تھی اور کسی کے عقیدہ یا مذہب کی بنیاد پر امتیازی سلوک کو رد کیا تھا۔ آئین پاکستان قائداعظم کے ان افکار و خیالات کی نفی کرتے ہوئے اپنے شہریوں کو برابر کے حقوق نہیں دیتا۔ نا صرف شہری حقوق نہیں دیتا بلکہ ان کے خلاف یعنی ان کے ضمیر کی آواز کی بھی توہین کرتا ہے۔ ایسا بے رحم آئین ہمیں دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیا اگر دنیا کے کسی ملک کا آئین اسی طرح کی بے رحمی اپنے اندر رکھتا ہے تو وہ بھی انسانیت کی توہین کرنے والا ہے۔ ریاست کے آئین کی یہ قطعاً عظمت نہیں کہ وہ کسی شہری کو یہ بتائے کہ تمہیں مسلمان ہونے کے باوجود تمہارے عقیدہ، نظریہ یا خیال سے اختلاف کی بنا پر تمہیں غیر مسلم قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس بات میں بھی کسی قسم کا تقدس دکھائی نہیں دیتا کہ کسی ملک کا آئین کسی بھی مذہب کے لیے حدود متعین کرے، اور ریاستی آئین بتائے کہ تم پر یہ یہ مذہبی پابندیاں ہیں۔ ہمارا آئین کہتا ہے کہ اے فلاں جماعت تم تلاوت قرآن کریم نہیں کر سکتے، تم اذان نہیں دے سکتے یہاں تک کہ تم اسلام علیکم بھی نہیں کہہ سکتے۔ ایسا آئین قطعاً قائداعظم کے افکار و خیالات کا آئینہ دار نہیں ہے۔ قائداعظم نے دہلی میں تیسویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پاکستانی شہریوں کو بلاتفریق مذہب و ملت کہا تھا کہ: ”مسلمان گروہوں اور فرقوں کی نہیں اپنے اندر اسلام اور قوم کی محبت پیدا کریں کیونکہ ان برائیوں نے مسلمانوں کو دو سو برس سے کمزور کر رکھا ہے مزید برآں یہ فرمایا کہ جس ملک کی آج ہم بنیاد رکھنے جا رہے ہیں اس میں ذات پات نسل و مذہب کی بناء پر کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا اور ہم سب ایک ریاست میں برابر کے شہری ہیں۔“

۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کا مسودہ دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا جسے دستور ساز اسمبلی نے منظور کر لیا۔ قرارداد مقاصد کا مسودہ مولوی شبیر احمد عثمانی نے تیار کیا تھا۔ یہ وہی مولوی صاحب ہیں جنہوں نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ پھر اسی مولوی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد کا مسودہ دستور ساز اسمبلی میں پیش کر کے قائداعظم کے افکار و خیالات کا جنازہ نکال دیا اور ان افکار کی تدفین کے بعد قائداعظم کے افکار کے متضاد نیا فکر متعارف کروایا جس کی سزا، قوم آج تک بھگت رہی ہے اور نجانے کب تک بھگتتی رہے گی۔ قائداعظم کی مدبرانہ اور دانشمندانہ سوچ کو اگر پیش نظر رکھ کر پاکستان کی تعمیر اور ترقی کے لیے کام کیا جاتا تو بلاشبہ پاکستان کی عوام دنیا کی پرامن اور خوشحال ترین عوام ہوتی۔ اس وادی کا تو دستور نرالا ہے۔ پھول سروں پر کنکر پتھر ڈھوتے ہیں

سخن کا سفر

عبدالشکور، کلیولینڈ اوہائیو

اردو ادب میں جب بات خاص طور پر اردو شاعری کی ہو تو بات، لامحالہ میر تقی میرؔ سے ہی شروع ہوگی۔ یہ اٹھارویں صدی کا زمانہ ہے۔اس وقت اردو شاعری اپنے ابتدائی۔تدریجی تخلیق کے نہایت اہم دور میں داخل ہو چکی ہوگی۔ اس کے ساتھ اردو زبان بھی ابھی بننے سنورنے کے مراحل طے کر رہی تھی۔ تاہم سترھویں صدی کے آخر تک اردو زبان فی ذاتہٖ واضح طور پر ایک منفرد شکل اور ہیت میں متشکل ہو چکی تھی۔ اردو کا یہ قبول صورت چہرہ، ہمیں ولی دکّنی کی شاعری میں صاف نظر آ رہا ہے۔

ہماری آج کی اردو غزل کی بنیاد، زبان اور بیان کے عام فہم عصری لوازم کے ساتھ، سترھویں صدی میں، ولی محمد ولی دکّنی 1667-1707 کے دور میں رکھی جا چکی تھی۔ اسطور، ولی دکّنی کو موجودہ غزل کا موجد بھی کہا گیا ہے یہ کہ میر تقی میرؔ نے بھی ولی دکّنی کے کام کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا، باشندہ دکن کا تھا

ہم نے آج کے اس سخن کے سفر کو میر تقی میرؔ سے شروع کرنے کی جو بات کی ہے، ہماری آج کی اردو شاعری کے حوالے سے اس کا وجوب اور اہمیت مسلم ہے اور ساتھ ہی جو ہم ولی دکّنی کا ذکر لائے ہیں، وہ بھی اسی پیمانے سے اہم اور مسلم ہے۔اس کے اثبات میں، ولی دکنی کی ریختہ گوئی اور میر تقی میر کی ریختہ گوئی کا اتصال بالاعتراف، ہمارے سامنے ہے۔اس میں جو بُعد زمانی موجود ہے وہ بھی اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔

اس اتصال کا نقطۂ آغاز، ولی محمد ولی دکّنی کی دلّی کی طرف منزل آرائی سے ہم آہنگ ہے، جس کے نتیجے میں، جنوب اور شمال میں، رسم و راہ کا در امکان وا ہونے لگا۔ روایت ہے کہ ولی کا نام اور شاعری، ولی سے پہلے ہی دلّی پہنچ چکے تھے اور دلّی کے گلیوں بازاروں میں، ولی دکّنی کے اشعار گنگنائے جانے لگے تھے۔ کیوں نہ ہوتا، یہ اشعار ہی ایسے تھے کہ گویا گلوں پر شبنم افشانی ہو رہی ہو:

مسند گل منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ، دیدہ بیدار کا

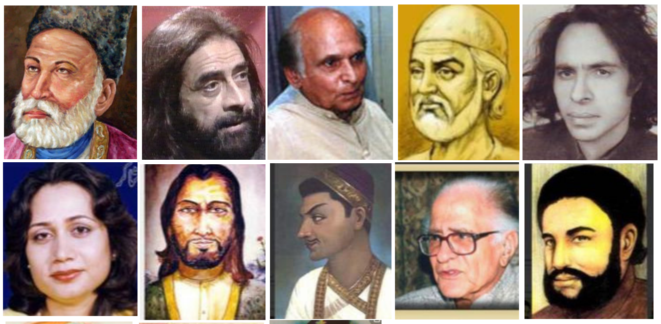

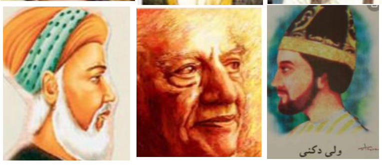

دلّی گویا مسند گل ہے اور ولی اس پر مثل نزول شبنم، منزل آرا ہو رہے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سخن کے اس سفر میں، ولی دکّنی کی دلّی کی طرف یہ منزل آرائی میر تقی میرؔ 1723-1810 سے کچھ عشرے پہلے کی ہے اس وقت میرؔ تو موجود نہ تھے لیکن ولی دکنی کا یہ شعر کسی خاص سمت اشارہ کر رہا تھا۔

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سناؤ
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

ولی کے اس شعر کو پڑھ کر، اس کے روئے سخن کی طرف بھی خیال جاتا ہے۔ اگر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے سنگم پر اطراف نظر۔ دوڑائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے اس شعر کا روئے سخن گویا، خاص میر تقی میر کی طرف ہی ہے کہ جب بعد کے زمانے میں میرؔ کا ظہور ہو تو ولی کا یہ ریختہ اسے تحفتہً دیا جائے، کہ وہی اسکا اہل اور سزاوار ہوگا، روشن فکر رکھنے والا، انوری کی مانند اس طور اگر ولی دکّنی کو میر تقی میرؔ کے لئے 'ارہاص' کے مشابہ کہیں تو کوئی عجب بات نہ ہوگی، حق تو یہ ہے کہ سخن وری کی دنیا بھی ایک طرف روحانی خواص اپنے اندر رکھتی ہے کہ قلب اور روح کی لطیف ہم آہنگی سے ہی سچے سخن کی تخلیق ظہور میں آتی ہے۔

ولی دکّنی سے پہلے، اردو شاعری اور اُردُو غزل بہرحال موجود تھی اور مختلف ادوار میں، وقت کے چلن کے ساتھ ساتھ ترقی اور ارتقا کا عمل مسلسل جاری رہا ہے، جسے ہم اردو شاعری اور اردو غزل کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں، ولی دکّنی سے ہی شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد سلسلہ آگے چلتا ہے۔

ولی دکنی سے قبل کے ادوار کے لحاظ سے، سولھویں صدی میں اہم اور قابل ذکر ناموں میں گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ معانی 1565-1610 کا نام آتا ہے جس کے کلام اور دیوان کی دریافت اور تشہیر ہمارے زمانے کے حوالے سے، بیسویں صدی کے اوائل میں، مولوی عبدالحق 1872-1961 اور ڈاکٹر محی الدین زورؔ قادری 1905-1963 کے ذریعے ہوئی۔ ڈاکٹر زورؔ نے دیوان

مرتب کرتے ہوئے، بیشتر مقامات پر، غیر مانوس الفاظ کے نیچے، مستعمل اردو کے الفاظ لکھنے کی سعی کی ہے۔

پندرھویں صدی میں احمد گجرات میں ، شیخ بہا الدّین باجنؔ (متوفی 1506)اور خاص دکّن میں، فخر دین نظامی کی مثنوی، پدم راؤ کدم راؤ کا حوالہ ہے جس کی تخلیق کا زمانہ 1431 اور 1434 کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے، چودھویں صدی عیسوی میں گو اردو شاعری کے حوالے سے تاریخ میں کوئی قابل ذکر نام نظر نہیں آتا، تاہم اردو زبان کی تاریخ کے تناظر میں، سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز 1422-1321 کے نام سے صرف نظر ممکن نہیں کیونکہ اردو ادب کے آغاز کے ضمن میں یہ نام نہایت محترم حیثیت کا حامل ہے۔

اب ابتدائی دور میں، تیرھویں صدی میں، ابوالحسن معین الدین خسروؔ 1252-1325 کشور ہند کی اس نوخیز کو، شاعری کے خوبصورت رنگ اور آہنگ میں ڈھالتے اور سُر اور تال سے روشناس کراتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں، اپنے مولد لاہور میں، عربی اور فارسی کے مقتدر شاعر، خواجہ مسعود سعد سلمان 1121-1046 نے اُردو زبان میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ سعد سلمان کے دیوان کی تصدیق، امیر خسروؔ نے بھی کی ہے۔ اسطرح تاریخی لحاظ سے یہی زبان اُردو اور اردو شاعری کا نقطۂ آغاز ہے ۔ اور یوں، گیارھویں صدی میں مسعود سعد سلمان سے چل کر، اٹھارویں صدی میں میر تقی میر تک، اردو زبان اور اردو شاعری کا، زمانے کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے، سات صدیوں کا سفر ہے۔

ولی دکّنی کے بعد، وہ اردو شاعری اور وہ اردو غزل، جسے ہم میر کے دور کی کلاسیکی شاعری اور میرؔ کے دور کی غزل کہتے ہیں اسے موجودہ معلوم شکل میں آنے کیلئے گویا، ایک صدی درکار تھی اور اس دوران یہ صورت بھی نظر آتی ہے کہ میر تقی میر 1810-1723 کے ہمعصروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ 1781-1713 اور خواجہ میر درد 1785-1725 یوں کہیں کہ، آدھے رستے یا اس سے کچھ ہی زیادہ ساتھ ساتھ رہے۔ ادھر ولی دکّنی کے ہم وطن، سراج اورنگ آبادی 1763-1712 اہل دل کو 'خبر تحیرّ عشق' کے وجدان سے سرشار کرتے کچھ اور ہی جلدی اپنا سفر پورا کر گئے ۔ دوسری طرف ولی محمد نظیر اکبر آبادی 1830-1735 نے نظم کا میدان سنبھال رکھا تھا اور ناسخ 1835-1772 نے تو ابھی مکتب عشق میں نیا نیا ہی قدم رکھا تھا۔ اس طور ہم دیکھتے ہیں کہ عروس سخن کے بنانے سنوارنے کا باقی سارا کام میر تقی میر کو گویا تن تنہا ہی کرنا تھا۔ لیکن لگتا ہے یہ گونا یکسوئی، رنگ لائی اور میؔ رہی کے ہاتھوں 'عروس سخن' اک مرکز صد نگاہ مہ جبین کے مانند، یوں طلوع ہوتی ہے:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

میرؔ اپنی شاعری اور اس میں پڑھنے والوں کے لئے خاص کشش کے بارے میں خود ہی کہتے ہیں:

کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

سخن کے اس سفر میں اگلا سنگ میل اسد اللہ غالبؔ (1797۔1869) ہے۔ اگر غالبؔ کے ہاں مضامین، اسلوب اور آہنگ کو دیکھتے ہیں تو ایک لمحے محسوس ہوتا ہے جیسے غالبؔ اس سے قبل کے، جاری تدریجی تخلیق کے دور کے عوامل سے ماورا ہوا اور یہ کہ غالبؔ کے مضامین، اسلوب اور آہنگ، فقط غالبؔ ہی سے مختص ہیں۔ اس عمومی تاثر کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ، میرؔ کا مدّاح بھی ہے اور میرؔ کے مقام کا ، برملا معترف بھی ہے،

ریختے کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور یہ کہ

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے، بقول ناؔسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، غالبؔ کی شعر گوئی کا آغاز قریباً دس سال کی سن میں، میر تقی میرؔ کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ اس پہلو سے دیکھیں تو میر تقی میرؔ اور غالبؔ کے زمانہ میں ایک طبعی تسلسل کی صورت نظر آتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے عشرہ اول میں پہنچ کر میر تقی میر نے گویا، شمع اسد اللہ خان غالبؔ کے سامنے رکھ دی ہو اور بلاشبہ، میرؔ کے بعد غالبؔ نے جن عظمتوں کو چھوا ہے، اس نے غالبؔ کو زندہ جاوید بنا دیا ہے اور پھر غالبؔ نے جو یہ کہا ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یہاں جو لالہ و گل میں نمایاں ہو جانے والی صورتوں کا ذکر مستور ہے ان میں، اردو سخنوری اور اردو شاعری کے حوالے سے اور کئی صورتوں کے ساتھ، غالبؔ اور میرؔ کی صورتیں، فنا سے گریز پائی کے نمائندہ مظہر کے طور پر نظر آتی

ہیں۔ ایسے مظاہر کا ایک اور آفاقی پہلو بھی ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے، لیکن یہاں اس کے ذکر کا محل نہیں۔ تاہم کوئی کمال یا کمالِ فن خواہ کسی بھی مثبت حوالے سے ہو، بہرحال ایک انعام ہی قرار پائے گا۔ یہ عمل جاری وساری ہے، دونوں مادی اور روحانی دنیاؤں میں۔ فنا سے گریز پائی کی بات جو غالبؔ نے کی ہے، قریب کے زمانے میں آ کر، احمد ندیمؔ قاسمی (1914-2006) بھی کہتے نظر آ رہے ہیں، ایک مختلف رنگ میں،

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا

یہاں ایک ضروری وضاحت کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ جو ہم غالبؔ کے بعد، بظاہر ایک لمبی جست لگا کر، احمد ندیمؔ قاسمی تک آ گئے ہیں تو یہ ہم نے، عمداً اور بقائمی ہوش وحواس سے کیا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں، اول یہ کہ، تاہم اٹھارویں صدی اور ماقبل سے شروع ہونے والے اس سفر کو اکیسویں صدی کے ربع اول تک مناسب طور پر پورا کر سکیں، کہ چند مرحلے ابھی بیچ میں اور بھی ہیں جو طے کرنے ہیں اور دوسری وجہ کلیۃً نظریاتی ہے۔ ہم نے جو اردو شاعری کے ابتدائی تدریجی تخلیق کے دور کی بات میرؔ سے شروع کی وہ غالبؔ تک تکمیل کو پہنچ چکی اور یہاں غالبؔ اس جادو سخن میں ایک سنگ میل کی صورت ظاہر ہوا ہے جہاں سے جادو سخن کی اگلی منزل کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سنگ میل کے بعد کے زمانہ کو ''غالب کا دور'' قرار دینے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ سے شروع ہونے والے اس دور میں، غالب کو نکال کر شعر وسخن کی بات کرنا کچھ جچتا نہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ:

''اگر معتقدِ میرؔ ہونا اردو شاعری کا جز و ایمان ٹھہرے تو غالبؔ سے بیعت ہونا، اردو شاعری پر تجدید ایمان کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے''

اسے آپ ہمارا، کلیۃً ذاتی اور ذوقی خیال کہہ سکتے ہیں۔ اب ہم احمد ندیم قاسمی کی بات کی طرف آتے ہیں اور ان کا شعر دہراتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا

یہ جو دریا کا سمندر میں اتر جانے کا سفر ہے، دراصل بارش کے اس قطرے سے شروع ہوتا ہے، جس کے لئے غالبؔ نے کہا ہے،

''عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا''

یہاں فنا کا استعارہ، محدود سے لامحدود کی سمت ایک جست کے معنی میں وارد ہوا ہے اور یہی احمد ندیمؔ قاسمی کے اس شعر اور غالب کے اس مصرع کی روح ہے۔ تاہم یہ حقیقت خاطر نظر رہے کہ قطرے کا سفر بس یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کی مسافت کی منزلیں، قطرے کے گہر ہونے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس کے بیچ میں دریا، سمندر، بادل، باراں اور پھر صدف تک رسائی کے مراحل آتے ہیں اور یہ آخری مرحلہ، جو گوہر کی تخلیق کا مرحلہ ہے، ہر قطرے کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یُؤْتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ کے تناظر میں، انسان کو دعوت فکر بھی دیتا ہے۔

جہاں، غالبؔ کے ذکر کے ساتھ، احمد ندیمؔ قاسمی کا ذکر آیا ہے تو پروینؔ شاکر کے ذکر کو، اس کے عمّو کے ذکر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پروینؔ شاکر (1952-1994) ہمارے دور میں، جس طور، لالہ وگل کی خوشبو کے رنگ میں ظاہر ہوئی، اسی طرح اس کی پذیرائی، خوشبو کی طرح ہوئی اور یوں، پروینؔ شاکر کی پہلی کتاب کا نام بھی ''خوشبو'' ہوا اور یہ خوشبو کیسی نا کو بکو پھیلتی گئی۔ اور پھر اچانک ایک دن، پروینؔ شاکر نے یہ انکشاف کیا کہ:

بابِ اک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے

اور پھر، کچھ ہی دن بعد، محبت کا یہ باب کھلا اور پروین شاکر، اس باب میں، اس دروازے میں، بڑی سرعت سے داخل ہوگئی، ایک نئی اور ''ابدی خوشبو'' سے ہمکنار ہونے، اک حرف تازہ کی طرح۔ پروین شاکر نے اپنی ہمعصر اور اسے پہلے کی خواتین شاعرات کی نسبت، اپنے محسوسات اور تجربات کو جس بے ساختگی اور سچائی کے ساتھ، بے دھڑک کہہ دیا ہے، یہ اس کا ہی حوصلہ اور اسی کا ہی ظرف ہے جس نے اسے منفرد اور ممتاز کر دیا، اس پر ہمارا ادنیٰ سا خراج عقیدت اس طرح ہے:

تمہارا حوصلہ ہر بات ان کہی کہہ دی
ہمارا ظرف کہ چپ کو شعار کرتے ہیں

جب ہم پروینؔ شاکر سے پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ سب کچھ کیسے کہہ دیا کیسے بیان کر دیا، تو ہمیں پہلے تو اس میں ایک گہرے کرب کی کیفیت نظر آتی ہے اور اس کے بعد ایک عجیب سی، گونہ آسودگی کا تاثر ملتا ہے جسے وہ ''عطائے رب'' کا نام دے کر، کرب کی اس کیفیت سے ایسے باہر آ جاتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوا اور اس کے لبوں پر یہ نغمہ تیر جاتا ہے۔

جتنا ہو فزوں، عطائے رب ہے
تخلیق کا کرب بھی، عجب ہے

اور یہ تخلیق کا موضوع بھی عجب ہے۔ اس کی کئی جہتیں ہیں، فیض احمد فیضؔ (1911-1984) جب ماسکو گئے ہیں، لینن امن انعام کے سلسلے

میں، توانہوں نے جو تقریر وہاں کی، وہ اردو میں تھی۔ اس تقریر کا پہلا جملہ اس طرح ہے۔

’’الفاظ کی تخلیق و ترتیب، شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے‘‘

انسان کوئی پیشہ اس وقت اختیار کرتا ہے یا کرسکتا ہے جب اسے اس پیشے میں، ایک کم سے کم حد تک مہارت حاصل ہوجائے، پھر پیشے میں یہ مہارت، تدریجاً بڑھتی چلی جاتی ہے، برعایت استعداد اور ریاضت۔ فیضؔ نے جس وقت یہ بات کہی، اس وقت وہ جس مقام پر فائز تھے وہاں تک پہنچنے میں نہ جانے کتنی بار خون دل میں انگلیاں ڈبوئی ہونگی اور کیسے کیسے کرب اور کرب انگیز حالات سے گزرے ہونگے، اور پھر ان تجربات کو، کیسے رقم کر سکے ہونگے۔ یہ ایک طویل داستان ہے، ایک الف لیلوی سی داستان۔

اس داستان کے کرداروں میں، میجر محمد اسحاق، محمد حسین عطاؔ، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی بھی شامل ہیں۔ یہاں یہ کہنا عجب نہ ہوگا کہ، اگر زندان میں فیضؔ کے ساتھ میجر محمد اسحاق، محمد حسین عطاؔ اور ظفر اللہ پوشنی بھی زندانی نہ ہوتے تو پھر شاید، ’’دست صبا‘‘ اور ’’زنداں نامہ‘‘ اس موجودہ شکل میں ہمارے سامنے نہ ہوتے۔ نجات دیدہ و دل کی تمنّا لئے یہ مسافر، یوں لگتا ہے ’’تشنہ وصال منزل‘‘ ہی رہا، کہ وہ خود اپنے سفر کو اس بات پر ختم کرتے نظر آتا ہے،

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تاہم فیضؔ نے جادہ سخن میں قدم قدم پر چراغ روشن چھوڑے ہیں کہ بعد میں آنے والے اس منزل نارسیدہ کا سفر جاری رکھ سکیں۔

اب کچھ تبدیلی کی خاطر، لاہور کے اس کافی ہاؤس میں چلتے ہیں جو کسی زمانے میں، ’’زندہ دل لاہور‘‘ کے ادیبوں اور شاعروں کا، میٹنگ پوائنٹ ہوا کرتا تھا۔ کسی سے ملنا ہو یا دیکھنا ہو تو بس کافی ہاؤس پہنچ جائیں۔ انڈیا ٹی ہاؤس، بعدہ، پاک ٹی ہاؤس۔ حکما نے اسے شاعروں اور ادیبوں کا ٹھکانا کہا ہے۔ یہ بظاہر معمولی سی جگہ، اردو ادب اور شعر و سخن کا گویا، کھیت کھلیان تھا۔

پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں
اب کے برس بھی، اس کے سوا کچھ نہیں کیا
غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا

راوی بیان کرتے ہیں کہ جب، اقبال ساجد یہ دلدوز اشعار پڑھ رہے تھے تو اس وقت موجودہ ادیبوں اور شعرا کا جو حال تھا سو تھا، آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگوں کی حالت بھی دیدنی تھی، ہر چشم پرنم ہر آنکھ آبدیدہ اب یہ مقام تو ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن چکا۔ یہ ایک دور تھا جو کم و بیش ساٹھ سالوں کے زندگی سے بھرپور، شب و روز اپنے اندر سمیٹے ہوئے، بالآخر نوے کی دہائی کے آخر میں ختم ہوگیا۔ کچن کے برنر بجھ گئے اور کافی ہاؤس کا صدر دروازہ بند ہوگیا۔ چند سال پہلے اس کافی ہاؤس کے دوبارہ کھولنے کی جو بات چلی، تو شاید اسلئے بھی کہ شہر میں ابھی انتظار حسین موجود تھے۔ یا میر تقی میرؔ کی اصطلاح میں، ابھی رہے ہوئے تھے۔ لیکن تیرہ چودہ سال بعد 2013ء میں، انتظار حسین یہاں بیٹھ کر صرف انتظار ہی کر سکتے تھے، لیکن کس کا اس صورت میں، یار گئے یادیں باقی والی بات ہی باقی رہ جاتی ہے اور پھر انتظار حسین (1923-2016) یہاں بیٹھ کر یادوں میں کچھ ایسے کھوئے کہ خود بھی ان یادوں کا حصہ بن گئے۔ اور ان ہی یادوں میں شامل ایک یاد، ناگاہ ہمیں، ساٹھ پینسٹھ سال پیچھے لے جاتی ہے۔

کافی ہاؤس کے انتہائی جنوب مغربی گوشے میں ایک شخص بیٹھا ہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ روشنی کے لئے اسنے اپنی ہی وضع کا ایک چراغ جلا رکھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں کوئی قلم بھی نہیں اور اس کے دونوں ہاتھ کافی ہاؤس کی میز پر اس طرح رکھے ہیں جیسے کوئی نماز کے لئے ہاتھ باندھے ہو۔ اس کے سامنے ایک کتاب کھلی رکھی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کے صفحات جیسے خالی خالی سے ہوں، ایک نوٹ بک کے خالی اوراق کی طرح، اور پھر یوں ہوتا ہے کہ لحہ بہ لحہ اس کتاب میں کچھ حروف اور الفاظ ظاہر ہوتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر غور اور کمال توجہ سے مشاہدہ کریں تو ان ابھرتے ہوئے حروف و الفاظ میں ایک ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔ جب دو سطریں پوری ہو چکتی ہیں تو ان دو سطروں کے حروف اور الفاظ، یکبارگی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ یہ اس کتاب کا پہلا ہی ورق ہے جس پر یہ الفاظ اپنے ہونے کا، گویا، بالجہر اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

لفظوں میں بولتا ہے رگِ عصر کا لہو
لکھتا ہے دست غیب کوئی اس کتاب میں

اور جس چراغ کا ذکر اوپر آیا ہے، رگ عصر کی کشید سے ہی روشنی پاتا ہوگا۔ ایسی ماروائی سی کیفیت اس ایک شخص سے مخصوص ہے جس کا نام

ناصرؔ کاظمی ہے، سید ناصر رضا کاظمی (1925۔1972)،

آج پھر وسعتِ صحرائے جنوں پرسشِ آبلہ پا چاہتی ہے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے، یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

غالبؔ سے چل کر ناصر کاظمی تک، ایک طویل مسافت ہے۔ آبلہ پا کے حوالے سے اگر دیکھیں تو ادھر کانٹوں کی چبھن کا احساس نمایاں ہے اور ادھر پرسشِ آبلہ پا کی ادا، سبحان اللہ!! حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔ یہ آبلہ پا، یہ ناصر کاظمی۔

نئے دنوں کا سراغ لے کر، کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

ناصرؔ کاظمی سے معذرت کے ساتھ کہ ان دو مصرعوں کی یہ ترتیب ہی، حسبِ حال معنی اجاگر کر رہی ہے۔ اگر ناصر کاظمی موجود ہوتے تو ہم انہیں اس طرف ضرور توجہ دلاتے۔

پھر لاہور شہر کے انتہائی جنوب اور مغرب میں ایک شہر، کہ اہلِ دل ونظر نے، ایک زمانے میں، اس کا نام ''روشنیوں کا شہر'' رکھا تھا، ہمارا شہر کراچی۔ اس مقام پر فیض کی بات یا فیض کی یاد پھر در آئی ہے۔ صاحبِ دل ونظر، فیض احمد فیضؔ نے، لاہور شہر کو اپنی ایک یادگار نظم میں ''اے روشنیوں کے شہر'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ یہ نظم، بوجوہ حُزنیہ ہے، طربیہ نہیں، اسیری کے زمانے کی ہے۔ دو شہر اور روشنیوں کے استعارے کے دو رنگ۔ تو یہاں شہر کراچی میں ہماری ملاقات ایک، بظاہر مجہول سے شخص سے ہوتی ہے۔ انوکھی وضع کی عینک لگائے ہوئے، سفید کرتے پاجامے اور سیاہ صدری میں ملبوس، سر کے بال منتشر، ایک عجیب سی حالت میں، جس کے بارے میں وہ خود ہی کہہ اُٹھتا ہے،

کوئی حالت نہیں یہ حالت ہے کتنی آشوب ناک صورت ہے
انجمن میں یہ میری خاموشی بردباری نہیں ہے، وحشت ہے

یہ جون ایلیا ہیں۔ ان کی ذات کی طرح، ان کا یہ مرکب نام بھی خاصا معنی نگر ہے۔ اور سچ پوچھیئے تو ہمیں ان کے اس نام، جون ایلیا میں، عیسیٰ بن مریم کی صداقت کا ثبوت مضمر نظر آتا ہے۔ اور اس ایک صداقت میں، کئی اور صداقتیں بھی!! جون ایلیا کا نصیر ترابی اور عبید اللہ علیم کے ساتھ ایک جنونانہ تعلق خاطر تھا۔ 1998ء میں جب علیمؔ کی اچانک موت ہوئی تو جون ایلیا کی حالت دیدنی تھی۔ علیمؔ جب آنکھیں موندھے، دم سادھے، اپنے ابدی سفر اور دائمی مستقر کی طرف قدم بڑھانے کو تھا تو دفعتاً، جون ایلیا اس کے پاس آن کھڑا ہوتا ہے اور علیمؔ کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

''او شیطان مکر نہ کر، اُٹھ اور میرے گلے لگ جا''

جنوری 1974 میں جب عبید اللہ علیمؔ (1939۔1998) کی، پہلی کتاب ''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، آئی تو جون ایلیا نے لکھا، علیمؔ شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر کے اندر کا وہ شیطان بھی ہے جسے شعور کی سب سے بدنام اور سرگرم سچائی کا استعارہ کہا جائے، یہ وہ عبید اللہ علیمؔ ہے جس کا نغمہ آج بھی اسی طرح سنائی دے رہا ہے جیسا ہمارے بیچ ہوتے ہوئے سنائی دیتا تھا اور اس کی دعا کو، کیسی قبولیت نصیب ہوئی۔

مرے خدا مجھے وہ تاب نے نوائی دے
میں چپ رہوں بھی تو نغمہ مرا سنائی دے

اور یہ وہی شاعر ہے، جو اپنے لوگوں، اپنے ہمعصروں اور لمحہ لمحہ، تاریکی میں ڈوبتے ہوئے شہروں کو جاتے ہوئے یہ دعا دے گیا،

اتار ان میں کوئی اپنی روشنی، یارب
کہ لوگ تھک گے ظلمت سے اب بہلتے ہوئے

اللہ کرے یہ دعا بھی کبھی قبول ہو جائے، آمین۔ یہ چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والا وہ شاعر ہے جس نے اپنا رشتہ جب براہِ راست، میرؔ سے ہونے کا انکشاف یہ کہتے ہوئے کیا کہ،

پہلا شاعر میرؔ ہوا اور اس کے بعد ہوں میں
پہلے وہ تصویر ہوا اور اس کے بعد ہوں میں

تو سننے والے، ششدر رہ گئے اور کچھ انگشت بدنداں

ہم نے بات میرؔ سے شروع کی اور چلتے چلتے میرؔ کی بات، میرؔ ہی کے ایک محب اور مدّاح تک آ گئی۔ اگر میرؔ اس دنیا میں کچھ دن کے لئے، مستعار آتے اور علیمؔ کی اس وارفتگی کو اور محبت کو دیکھتے تو، پکار اُٹھتے۔

اے چاہنے والے مجھے اس عہد میں
میرا بہت آداب ہو، تم کون ہو
اور یوں سخن کا سفر جاری ہے
منزل بہ منزل، عہد بہ عہد!!

***

بزم اردو لندن کے زیر اہتمام پرشکوہ عالمی مشاعرے کا انعقاد

دنیا بھر سے شعراء نے شرکت کرکے محفل کو چار چاند لگائے غالب ماجدی جنرل سیکریٹری نے پروگرام کا انتظام وانصرام کیا

(میڈیا ڈائریکٹر شریف اکیڈمی) مورخہ 8 نومبر 2022 کو لندن کے ایک خوبصورت ہال میں ایک عالیشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کی نظامت جناب عابد علی بیگ نے کی۔ مشاعرے کا باقاعدہ آغاز حمد ونعت سے ہوا۔ اور محفل عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پُرنور ہوئی۔ جس کی سعادت محمود علی محمود نے حاصل کی۔ بزم اردو لندن کے مقاصد اور طویل خدمات کا مختصر خاکہ محترمہ تانیہ حسن نے پیش کیا جن کے والد سید حسن نے اس تنظیم کی بنیاد تقریباً 40 سال پہلے رکھی۔ غالب ماجدی نے بطور میزبان مشاعرہ اپنا کلام پیش کر کے داد وصول کی۔ بعد ازاں شعراء نے اپنا پر معنی کلام پیش کر کے داد وتحسین وصول کی۔

مشاعرے کی صدارت جناب جاوید شیخ نے کی جبکہ مہمان خصوصی ڈیلیس امریکہ سے تشریف لانے والے شاعر نورامروہی تھے۔ جبکہ پاکستان سے آفتاب عالم قریشی، قیصر وجدی، حیدر حسین جلیسی، شازیہ خان پاکستان سے اور جرمنی سے شفیق مراد نے بطور مہمان اعزاز پروگرام میں شرکت کر کے محفل کو رونق بخشی۔ اور اپنا پُرمغز کلام سنا کر محفل کی رونق دوبالا کی۔ لندن اور انگلستان کے مختلف شہروں سے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کے لئے جو شاعر تشریف لائے ان میں انجم شہزاد، احسان شاہد، عابد علی بیگ، سیمی برلاس، سہیل ضرار، ثمینہ رحمت، کامران کامی، عروج، سعید کانپوری اور محمود علی محمود شامل تھے۔ بیرون ممالک سے تشریف لانے والے اور انگلستان کے معروف شعراء کو ان کی تخلیقی کاوشوں اور علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں بزم اردو لندن کی جانب رضا علی عابدی شیلڈ پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ پروگرام کے آغاز سے پہلے اور اختتام کے بعد مختلف انواع کی خورد ونوش سے تواضع کی گئی۔ پروگرام کی کامیابی کا سہرا بزم اردو لندن کے تمام ممبران اور خاص طور پر غالب ماجدی کے سر ہے۔ جن کی انتھک کوششوں سے ہر سال اس سالانہ مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

راجہ محمد یوسف جرمنی

مضطرب، بے کل، سراپا جستجو، بکھرا ہوا
ڈھونڈتا پھرتا ہوں تجھ کو کوبکو، بکھرا ہوا
روز اک اُمید کی تازہ کرن کے شوق میں
روز ہوتا ہوں کسی کے رُوبرو بکھرا ہوا
امتحاں در امتحاں در امتحاں
ہر قدم پر منتظر اک فتنہ خو بکھرا ہوا
دیکھتا رہتا ہوں شب بھر جاگتی آنکھوں سے خواب
پابجولاں میں اسیر آرزو، بکھرا ہوا
اس قدر اُلجھا ہوا ہوں گردش حالات میں
دیکھتا ہوں دور سے جام و سبو، بکھرا ہوا

حافظ عباس علی عاصم صحرائی

رات بھر لرزا تھا پلکوں پہ ستارا کس لئے
میری آنکھوں میں اُمڈ آیا تھا دریا کس لئے
شام ہوتے ہی مقفّل ہو گئے تھے سارے لوگ
رات بھر رقصاں رہا گلیوں میں سایہ کس لئے
جس کو میری بات کا ہر لفظ کھٹکا تھا کبھی
میری باتوں پر یقیں اب اس کو آیا کس لئے
میں تو اک مدت سے اپنی ذات میں روپوش تھا
ڈھونڈنے والو، بتاؤ، تم نے ڈھونڈا کس لئے
جھرجھری سی ایک بدن میں آ گئی یہ سوچ کر
اپنا کتبہ اپنے ہاتھوں میں نے لکھا کس لئے
ہو جو اوروں کا تماشا دیکھنے نکلے تھے آج
بن گئے اپنی نظر میں خود تماشا کس لئے
جس نے عاصمؔ اپنے گھر سے کل نکالا تھا مجھے
آج آخر میرے گھر میں خود وہ آیا کس لئے

محمد ظفر اللہ خان یو ایس اےؔ

کھلا ہے شہر بھی گلیاں بھی اور وہ در بھی
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ کاسۂ سر بھی
تھیں جس درخت سے پیوستہ گھر کی بنیادیں
گرا تو ہو گیا پیوند خاک وہ گھر بھی
سمندروں کی تہوں میں ہوئی نمو جس کی
اُٹھتی ہے لہر کوئی اس گہر کے اندر بھی
بکھر گئی ہے سر بزم چشم نم کی گلیم
اُلٹ گیا ہے لہو سے بھرا وہ ساغر بھی
یہ مردوزن ہیں ترے قافلے سے بچھڑے ہوئے
لٹے نہ ان کے سروں سے فلک کی چادر بھی
عجب نہیں کہ میری داستاں سے ہٹ جائے
رُکا ہے جو غار کے منہ پر جو ایک پتھر بھی

مقصود چوہدری کینیڈاؔ

سوچ کی یاد میں ہنگامہ سدا رہتا ہے
دل کی کیا بات کہوں! ہم سے خفا رہتا ہے
دوستو تم میرے چہرے کو تو پڑھ کر دیکھو
میرا ہر درد تو چہرے پہ لکھا رہتا ہے
جب بھی چاہے گا میرا رب تو چھٹ جائے گا
غم کا بادل جو میرے دل پہ رکا رہتا ہے
دل کی بستی کبھی ویران نہیں ہو سکتی
میرے دل میں میرا رحمان خدا رہتا ہے
گزرے لمحوں کی ستاتی ہیں جو یادیں اکثر
اک خنجر سا میرے دل میں چبھا رہتا ہے
کون چاہے گا میرے غم کا مداوا مقصودؔ
آستینوں میں یہاں سانپ چھپا رہتا ہے

بابر عطا کینیڈا

رفتہ رفتہ اس سے ایسی آشنائی ہوگئی
جیسے اپنے آپ سے میری جدائی ہوگئی
تجگوں سے دوستی کا فن مجھے بھی آگیا
جب سے اس کی ذات تک دل کی رسائی ہوگئی
اس کی قربت میں عجب عالم ہے اپنا ان دنوں
ایسا لگتا ہے کہ ہر غم سے رہائی ہوگئی
دل میں رکھتا ہوں میں اپنے پیار کو اس خوف سے
بات جو بھی منہ سے نکلی وہ پرائی ہوئی
شرم آتی ہے مجھے بابر وفا کے نام پر
کس قدر سستی جہاں میں بے وفائی ہوگئی

اکرم ثاقب

جب تک میرا آب و دانہ باقی ہے
سورج کو بھی آگ لگانا باقی ہے
اس دھرتی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا
وقت کو آگے پیچھے لانا باقی ہے
سب طوفان گھٹائیں میرے بس میں ہیں
دریاؤں پہ شہر بسانا باقی ہے
اب تک خواب کا رشتہ اس سے قائم ہے
بس اک اس کا آنا جانا باقی ہے
میر اپنے دار تلک ہیں لے آئے
دشمن سے بھی ہاتھ ملانا باقی ہے
نیند کی تصویروں سے لڑتا آیا ہوں
خوابوں سے اب آنکھ بچانا باقی ہے
خوشبو خواب خیال اور تیری یادیں
اپنا کچھ سامان اُٹھانا باقی ہے
تنہائی چل شور مچائیں ہم مل کے
خاموشی کا جشن منانا باقی ہے
کاش مجھے اک اور جنم بھی مل جاتا
ثاقبؔ ماں کے پاؤں دبانا باقی ہے

جستہ جستہ

عطاءالقادر طاہر

’’سوچئے اور پھر سوچئے‘‘ روزنِ دیوار سے!

☆۔ہر روز اپنا قول بدلنے والے کے حالات میں تبدیلی اس وقت آئے گی جب وہ اپنا فعل بدلے گا۔

☆۔رکاوٹیں زندہ انسان کیلئے ہیں میت کیلئے ہر کوئی راستہ چھوڑ دیتا ہے۔

☆۔وہ ساری زندگی دوسروں کیلئے بولتا رہا، جب مرا تو اس کیلئے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

☆۔خدارا اتوار کی چھٹی ختم کرو کہ کام کا بھی کوئی دن ہونا چاہیئے۔

☆۔نیک کاموں میں تاخیر نہیں ہونی چاہیئے اور بعض کاموں میں تاخیر ہی نیکی ہے۔

☆۔شور میں مجھے نیند نہیں آتی اور دل ہے کہ بے آواز دھڑکتا ہی نہیں۔

☆۔ترازو کا متوازن ہونا زیادہ اہم اور قیمتی ہے ہر اس شے سے جو اس میں تولی جاتی ہے۔

☆۔دوستو! تمام کشتیاں جلا دو کہ سب دریا سوکھ گئے۔☆انتظار جان لیوا ثابت ہوا، وہ موت کا منتظر تھا۔

☆۔دل کا بائی پاس حالیہ برسوں میں سامنے آیا ہے، ذہن کو بائی پاس تو صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔

☆۔آنسو تو مرنے والے پر بہائے جاتے ہیں، زندہ لوگوں پر تو ہنسی آتی ہے۔

☆۔وہ خیال جو مجھے سونے نہیں دیتا، میں نے کسی کو سنایا تو اسے نیند آنے لگی۔

☆۔سر کھجانے والا ہر شخص سوچنے والا ہوتا ہے لیکن بیشتر کی سوچ سر کی خشکی سے متعلق ہوتی ہے۔

☆۔انسان کی قبر ایک جگہ بنتی ہے جبکہ اس کی یادیں کئی سینوں میں دفن ہوتی ہیں۔

☆جس شخص کو مسائل کے انبار میں بھی کھانا یاد رہے تو وہ جان لے کہ بھوک اس کا اصل مسئلہ ہے۔

☆جس شخص کے لباس پر کوئی شکن نہیں اسکے ماتھے کو دیکھو تو نظر آجائے گی۔

☆آج کا کام کل پر نہ ڈالو، کبھی ملک الموت کو بھی ایسا کرتے دیکھا ہے؟

☆جب اس نے کہا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی چاہتا ہے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی مرضی کی موت مرنا چاہتا ہے۔

☆۔میت پر جو چادر چڑھائی گئی وہ ان پھولوں سے تیار کی گئی تھی جو مرحوم کو ساری زندگی پیش نہیں کی گئی۔

☆عجیب تماشہ ہے کہ دوائی خالی پیٹ نہیں کھائی جاسکتی اور پیٹ جیب سے بھرا نہیں جاسکتا۔

☆چونکہ ہر عمارت کا مستقبل اور مقدر کھنڈر ہونا ہوتا ہے چنانچہ انسانی شخصیت کی تعمیر عمارتی اصولوں پر نہیں ہونی چاہیئے۔

☆خالی پیٹ سوچنا اس کیلئے ممکن نہیں اور بھرے ہوئے پیٹ سے وہ محض کھانے سے متعلق سوچتا ہے۔

☆نظریاتی مخالف کو جان سے ماردینے کے آرزومند کو چاہئے کہ یہی حق مخالف کو بھی دے۔

☆میں دوسروں سے پیچھے رہ گیا اس لئے کہ مجھے آگے کی فکر تھی۔

☆ایک نیم پاگل اپنے ساتھی کو مکمل پاگل بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆اس کا کردار ایسا ہے کہ آپ انگلی نہیں اٹھا سکتے، پورا ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔

☆جس کی پہلی پانچ کام نہیں کرتیں اس کی چھٹی حس بڑی کام کرتی ہے۔

آفتاب شاہ

خیالات کا بہاؤ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ایک ایسی نعمت جو فضول اور گھٹیا سوچ کے گند کو اپنی طاقتور لہروں سے بہا کر لے جاتی ہے۔انسان کی جذباتی یا نفسیاتی کیفیات ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتیں اس لیے قدرت کا یہ تحفہ انمول ہے جو سوچ کے تسلسل کو نئے واقعات سے جوڑ دیتا ہے۔لیکن دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ماضی کے قبرستان میں اپنی یادوں کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر آنسو بہاتے رہتے ہیں جو بیکار سوچ کے آسمان میں پسند کا چاند تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں لیکن انہیں یہ نہیں پتہ کہ حال میں رہنے والا ہی حال کو درست آنکھ سے دیکھ سکتا ہے ورنہ ماضی کا بھوت زندگی کی خوشیاں نگل جانے کے لیے ہمیشہ بیتاب رہتا ہے۔

ادیبوں کے لطائف

مرسلہ: زکریاورک ٹورنٹو

☆۔جاوید اختر اور شبانہ اعظمی سے ٹیلی ویژن پر انٹرویو چل رہا تھا۔اینکر نے شبانہ سے سوال کیا کہ کیا جاوید اختر جیسی شاعری کرتے ہیں یہ تو بڑے رومانٹک ہوں گے؟ شبانہ نے جواب دیا رومانس تو انہیں چھو کر بھی نہیں گذرا ہے۔ اینکر نے جاوید کے طرف دیکھا تو بولے جولوگ سرکس میں کام کرتے ہیں وہ اپنے گھر میں تھوڑا لٹکے ہوئے ملتے ہیں۔

☆۔ضمیر جعفری نے بشریٰ رحمن کے بارے میں لکھا: اس کا نثر جادہ، جرات،مسرت اور حیرت کے اجزاء سے ترتیب پاتا ہے۔جرات جیسے چاندنی بی تلوار تانے کھڑی ہو۔مسرت جیسے کپاس کا کھیت ہنس رہا ہو اور حیرت جیسے گھوڑی نے زیبرا کو جنم دیا ہو۔مشتاق یوسفی نے بشریٰ کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں کہا: ہم مرشد ضمیر جعفری سے نہ صرف کلی طور پر متفق ہیں بلکہ اتنا اضافہ کریں گے کہ گھوڑی کے ہاں زیبرا پیدا ہونے پر گھوڑی کو تعجب ضرور ہوُا ہوگا لیکن سب سے زیادہ تعجب زیبرے کو ہوُا ہوگا۔تقریب کے بعد بشریٰ رحمن نے مشتاق یوسفی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے میاں گھوڑا نہیں زیبرہ ہی ہیں وہ تو میں نے ہاتھ پھیر پھیر کر اس کی دھاریاں مٹادی ہیں۔

☆۔وزیر آغا اور انور سدید غالب سیمینار میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لائے۔سیمینار سے فارغ ہوکر کچھ کتابیں خریدنے اردو بازار گئے۔ وہاں انہوں نے وزیر آغا کی کتاب اردو شاعری میں طنزومزاح کا ہندوستانی ایڈیشن دیکھا تو خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔دوکاندار کو بتایا اس کتاب کے مصنف وزیر آغا میرے ساتھ کھڑے ہیں۔دوکاندار نے جواب دیا اگر اس کتاب کے مصنف ہیں تو کتاب کی قیمت کی ادائیگی میں 33 فی صد کمیشن کم کرکے دے دیں۔

☆۔مشہور ہندوستانی صحافی ایم جے اکبر(مبشر جاوید)صدر پاکستان ضیاءالحق کا انٹرویو لینے کیلئے اسلام آباد پہنچے۔مختلف سوالات پوچھنے کے بعد اکبر نے کہا ہم مسلمان تو ہیں مگر بھارت میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے نابلد ہیں۔آپ تو ماشاءاللہ سچے اور کھرے مسلمان ہیں۔میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں جھوٹے کی سزا کیا ہے؟انہوں نے جواب دیا جھوٹا بخشا نہیں جائیگا۔اکبر نے دوسرا سوال پوچھا: اپنے اس بیان کی روشنی میں آپ کی اپنے بارے میں کیا رائے ہے؟ آپ نوے روز میں انتخاب کروا کر اقتدار منتخب نمائندوں کو دینے کا وعدہ کر کے سات سال سے اقتدار پر بیٹھے ہیں۔اس پر ضیاء صاحب کو جواب تھا: ہاہا ہاہا ... اگلا سوال

☆۔روس کی ایک کانفرنس میں امرتا پریتم اور ساحر لدھیانوی بھی مدعو تھے۔دونوں کو ان کے ناموں کے بیج دے گئے۔غلطی سے ساحر کا بیج امرتا کو اور امرتا کا بیج ساحر کو مل گیا۔جب اس غلطی کو درست کرنے کیلئے کہا گیا تو امرتا نے ساحر کے نام کا بیج اتارنے سے منع کردیا کیونکہ وہ اس کے دل کو چھو رہا تھا۔ساحر کی وفات کے بعد امرتا نے بے حد دکھ سے کہا: ساحر کے نام کا بیج پہن کر اس نے بڑی غلطی کی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ موت اس کیلئے آئی تھی۔لیکن بیج کی وجہ سے اس نے ساحر کو نشانہ بنالیا۔

☆۔شوکت تھانوی زندگی کے آخری دنوں میں ہسپتال میں داخل تھے۔ڈاکٹروں نے لگ بھگ جواب دے دیا تھا۔اخلاق احمد دہلوی ان کی عیادت کیلئے ہسپتال پہنچے۔حال احوال پوچھنے پر شوکت تھانوی نے جواب دیا: میں تو جارہا ہوں، اخلاق احمد نے پوچھا کہاں؟ شوکت تھانوی نے برجستہ جواب دیا: انڈر گراؤنڈ

☆۔شیخ سعدی ایک بار کسی قصبے میں پہنچے۔ایک کتے نے ان پر بھونکنا شروع کردیا۔حضرت نے کتے کو بھگانے کیلئے زمین پر سے پتھر اٹھانا چاہا تو محسوس کیا کہ یہ تو زمین میں دھنسا ہوُا ہے۔اس پر شیخ نے شہر کے باسیوں پر طنز کرتے ہوئے کہا: یہاں کے لوگ بھی عجیب ہیں۔کتے تو کھلے چھوڑ دیتے ہیں البتہ پتھر کو باندھ کر رکھتے ہیں۔

☆۔مولانا ظفر علی خاں 1935 میں راولپنڈی کی جامع مسجد میں تقریر کررہے تھے۔حاضرین جلسہ میں سے ایک کو حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے نامی گرامی انسان اور اتنے چھوٹے قد کے وہ بار بار یہ بات بڑبڑا رہا تھا: ظفر علی اینا وڈا، تے قد اینا چھوٹا۔اس پر ایک دراز قد پٹھان کو غصہ آگیا اور وہ بولا: تم خاموشی سے اس کی تقریر سنو، اور قد ہمارا دیکھ لو۔

اردو اور قندیل ادب

محمد کولمبس خاں مہدی آباد۔جرمنی

کسی پُرامید شاعر نے کہا ہے:۔

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں کے باقی زبانوں پر علمی غلبہ کی بدولت کمپیوٹر کی آمد سے قبل ایک بڑا تفاوت پایا جاتا تھا جو آج آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہے۔اردو اب بڑی زبانوں بھی اپنی جگہ بنا چکی ہے اور اس کے جاننے اور سیکھنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بھائی جان محترم مکرم رانا عبدالرزاق خانصاحب نے عرصہ دس سال سے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے اور باقاعدگی سے برصغیر اور خاص طور پر پاکستان کے علمی، ادبی اور معاشرتی افق پر رونما ہونے والی کیفیات کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے نہایت مقبول ماہنامے کے ذریعہ احباب کو آگاہ رکھنے کی سعی فرماتے رہتے ہیں جس کے لئے آپ اردو دان کمیونٹی کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ان کا اپنا علمی ذوق بھی ارتقاء پذیر ہے اور دنیا بھر سے لکھاریوں کے ساتھ محبت کا ایک قابل رشک تعلق ہے جو ان کی ادبی کاشت کاری میں پوری طرح اور دل ڈال کر معاونت کرتے ہیں۔ایسی محبت بھی اچھے نصیب والوں کو ہی عطا ہوتی ہے۔

قندیل شروع سے ہی خاکسار کے زیرِ مطالعہ رہا ہے اور اس میں نئے اور پرانے شعراء کا کلام ایک ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جو ہر صاحب ذوق کے لئے فرحت کا باعث بنتا ہے۔کئی بار ایسا نایاب کلام بھی مل جاتا ہے جو کسی زمانہ میں نظر سے گزرا ہوتا اور اسکی جستجو اندر ہی اندر ہوتی تھی۔سینکڑوں نئے شعراء کا تعارف بھی اسی میگزین سے ہوا ہے جن کی مشق سخن سے آگاہی پندرہ بیس سال پہلے خواب وخیال تھی۔

بعض احباب کثرتِ شعروشاعری کو تخفیف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ یہ دور "کثرت" کا دور ہے۔اس دور میں آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ہر شئے میں "کثرت" پائی جاتی ہے۔بقول علیم:

میں یہ اٹھاؤں جام کہ میں یہ اٹھاؤں جام
اس میکدے میں، مَیں تو خراب ہوکے رہ گیا

جتنے بھی لوگ نئے شامل ہونگے اتنا ہی رنگ نکھریں گے لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتیں دوسروں کے سرور کا باعث بنیں تو گویا یہ محترم رانا صاحب کی چھت کے نیچے سب کے لئے سراسر ایک نفع کا سودا ہے۔

دس سال کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔آج کی دنیا میں وقت جس تیز رفتاری سے اسراع پذیر ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے، دس سال میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر، معیار کو نہ صرف قائم رکھتے ہوئے بلکہ بلند تر کرتے ہوئے اور مغربی معاشرہ کی مصروفیات کے باوصف، رسالہ کی اشاعت میں باقاعدگی برقرار رکھنے کے لئے برادرم رانا صاحب اپنی کردہ مساعی پر ہم سب کی طرف سے دِلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں اس ادبی سفر پر استقامت عطا کرتے ہوئے معیار کو بلند تر کرتے چلے جانے کی توفیق بخشے۔آمین

ایاز اکیڈمی یو کے کے زیر اہتمام
ایک شام رانا عبدالرزاق خان کے نام

ایاز اکیڈمی لندن کے زیر اہتمام معروف ادیب، کالم نگار، چھ کتابوں کے مصنف، تین عدد ادبی رسالوں کے ایڈیٹر، شاعر اور برطانیہ میں سینکڑوں مشاعروں کا انعقاد کرنے والے مکرم محترم رانا عبدالرزاق خان کے اعزاز میں ایک ادبی شام منعقد کی جا رہی ہے جسمیں محترم رانا عبدالرزاق خان صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ایاز اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔تقریب میں برطانیہ کے معروف شاعر اور ادیب شامل ہوں گے۔مکرم ومحترم امام عطاء المجیب راشد صاحب، مکرم ڈاکٹر سر افتخار ایاز صاحب کی شرکت متوقع ہے۔

خزاں کی رُت میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے
ہوا کی زَد پہ دیا جلانا جلا کے رکھنا کمال یہ ہے،

جیسے لازوال شعر کے خالق مکرم مبارک صدیقی صاحب سے بھی شرکت کی درخواست کی گئی ہے۔آپ کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔جسکی اطلاع عنقریب دی جائے گی۔

چشم براہ ،امجد مرز امجد،عطاء القادر طاہر۔ پروفیسر عبد القدیر کوکب، رانا محمد حسن ایڈیٹر پیشوا، شائق نصیر پوری،

مرزا غالب شعری ادبِ اطفال کے تناظر میں!

(مقالہ نگار ساہتیہ اکادمی قومی ایوارڈ و دلی اردو اکادمی ایوارڈ سے سرفراز پندرہ کتابوں کے مصنف، مولف، مترجم، افسانہ نگار، شاعر و ادیبِ اطفال اور ڈی ڈی اردو و آل انڈیا ریڈیو کے سابق آئی پی ایس افسر ہیں)

رئیس صِدّیقی

مغلیہ دور کے تاریخی شہر آگرہ میں ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں اپنی آمد درج کرنے والے مرزا اسداللہ بیگ غالبؔ نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کی راجدھانی دِلّی میں آخری سانس لی۔ اب تک انکی شاعری کو دو سو برس سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ تب سے اب تک انکی حیات، شخصیت، فارسی و اردو شاعری اور خطوط نگاری پر کئی زبانوں کے مستند ادبی دانشوروں کے مختلف زاویوں اور نظریوں پر مبنی بے شمار مضامین اور تحقیق کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب واحد اردو کے ایسے ممتاز شاعر ہیں جو آج تک اردو شاعری پر غالب ہیں۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور!

غالب اپنی جدت پسندی اور انوکھے اندازِ بیان، زندگی کے تجربات، مشاہدات، فلسفہ اور فکرِ نو کو اپنی شاعری میں موتیوں کی طرح پرونے کے نادر اور منفرد فنی سحر انگیزی کی وجہ سے اتنی بلند مسندِ شاعری پر براجمان ہیں کہ انکے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے کبھی کچھ کہا ہوگا یا کچھ لکھا ہوگا یا ان کے بہت سے اشعار بچوں کے لیے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اپنی شاعری میں اطفال یعنی بچے اور بازیچہ یعنی کھیل کو اپنے ایک شعر میں استعمال کرتے ہوئے زندگی برتنے کا فلسفہ بہت ہی آسان لفظوں اور انداز میں بیان کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ بچوں کی چاہت، بچوں سے لگاؤ اور بچوں کی موج مستی و کھیل کود سے بھرا بچپن دراصل انکی خواہش اور مسرت آمیز زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ بازیچۂ اطفال اور تماشۂ نظرِ نو کے متقاضی ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اب ذرا ان اشعار پر نظر ڈالیے:

نہ سنو، گر، برا کہے کوئی
نہ کہو، گر ، برا کرے کوئی
روک لو، گر، غلط چلے کوئی
بخش دو ، گر، خطا کرے کوئی

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ شعر بھی محبوب کے بجائے آج کل کے بچوں کو سلیقہ سے بات کرنے کی نصیحت کے بہ طور بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

درحقیقت، غالب کو بھی عام آدم زاد کی طرح بچوں سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے سات بچے تھے لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ جی نہیں سکا۔ اپنی اس تنہائی اور اور بعض دوسری وجوہات کی بنا پر غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے، زین العابدین خاں عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا لیکن افسوس کہ عارف اپنی پینتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ غالب عارف کی موت سے بہت غمگین تھے۔ انہوں نے عارف کی موت سے نڈھال ہوکر بہت درد بھرا مرثیہ بھی لکھا:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!

غالب کے بہت سے اشعار اور مثنوی قادر نامہ زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بچوں کی سمجھ اور تربیت کے لیے نہ صرف کارآمد ہیں بلکہ شعری ادبِ اطفال کے خزانہ میں متن و اندازِ بیان کے اعتبار سے انمول، بیش بہا، قابلِ قدر، نا قابلِ فراموش اور زندۂ جاوید اضافہ ہیں۔

در اصل، غالب نے عارف مرحوم کے چھوٹے بچوں کو انکی پرورش کے لیے اپنے پاس رکھ لیا اور ان معصوم بچوں کی بنیادی ابتدائی تعلیم کی غرض سے مثنوی قادر نامہ لکھی۔ یہ مثنوی ایک طرح کی بچوں کے لیے لغت نامہ ہے جس میں غالب نے عام استعمال کے فارسی اور عربی الفاظ کے ہندی یا اردو مترادف یعنی ہم معنی الفاظ بیان کیے ہیں تا کہ پڑھنے والوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو سکے۔ یہ قادر نامہ مختصر لغت نامہ، ہم معنی الفاظ سیکھنے کی مختصر ڈکشنری کہی جا سکتی ہے۔

سچ تو یہ کہ ہم سب اردو طالب علموں کے

لیے بھی یہ کارآمد ہے۔ اسکی اہمیت کے مدِنظر، آپ سب کے لیے قادر نامہ پیش ہے۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبی مرسل پیغمبر رہنما
پیشوائے دین کو کہیے امام
وہ رسول اللہ کا قائم مقام
ہے صحابی دوست ، خالص ناب ہے
جمع اس کی یاد رکھ ، اصحاب ہے
بندگی کا ہاں عبادت نام ہے
نیک بختی کا سعادت نام ہے
کھولنا افطار ہے اور روزہ صوم
لیل یعنی رات ، دن اور روز یوم
ہے صلوٰۃ اے مہرباں اسم نماز
جس کے پڑھنے سے ہو راضی ، بے نیاز
جا نماز اور پھر مصلیٰ ہے وہی
اور سجّادہ بھی گویا ہے وہی
اسم وہ ہے ،جس کو تم کہتے ہو نام
کعبہ مکہ وہ، جو ہے بیت الحرام
گرد پھرنے کو کہیں گے ہم طواف
بیٹھ رہنا گوشے میں ہے اعتکاف
پھر فلک ، چرخ اور گردوں اور سِپہر
آسماں کے نام ہیں اے رشکِ مہر
مہر سورج، چاند کو کہتے ہیں ماہ
ہے محبت مہر لازم ہے نباہ
غرب پچھّم اور پورب شرق ہے
ابر بدلی اور بجلی برق ہے
آگ کا آتش اور آذر نام ہے
اور انگارے کا اخگر نام ہے
تیغ کی ہندی اگر تلوار ہے
فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے
نیولا راسو ہے اور طاؤس مور
کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور
خُم ہے مٹکا اور گھڑا ہے سُبو
آب پانی، بحر دریا، نہر جو
چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
دود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
دودھ جو پینے کا ہے وہ شیر ہے
طفل لڑکا اور بوڑھا پیر ہے
سینہ چھاتی، دست ہاتھ اور پائے پاؤں
شاخ ٹہنی، برگ پتا، سایہ چھاؤں
ماہ چاند، اختر ہیں تارے، رات شب
دانت دنداں، ہونٹ کو کہتے ہیں لب
اُستخواں ہڈّی ہے اور ہے پوست کھال
سگ ہے کتّا اور گیدڑ ہے شغال
تِل کو کُنجد اور رُخ کو گال کہہ
گال پر جو تِل ہے اس کو خال کہہ
کینکڑا سرطان، کچھوا سنگ پشت
ساق پنڈلی، فارسی مٹھی کی مشت
ہے شکم پیٹ اور بغل آگوش ہے
کہنی آرنج اور کندھا دوش ہے
ہندی میں عقرب کا بچھّو نام ہے
فارسی میں بھوں کا ابرو نام ہے
ہے وہی کژدم جسے عقرب کہیں
نیش ہے وہ، ڈنک جس کو سب کہیں
ناک بینی، پرّہ نتھنا، گوش کان
کان کی لو نرمہ ہے اے مہرباں
چشم ہے آنکھ اور مژگاں ہے پلک
آنکھ کی پُتلی کو کہیے مر دُمک
منھ پہ گر جھرّی پڑے آژنگ ہے
فارسی چھینکنے کی تو آدنگ ہے
مسّہ آژخ اور چھالا آبلہ
اور ہے دائی جنائی قابلہ
اونٹ اُشتر اور اُشغر سیہ ہے
گوشت ہے لحم اور چربی پیہہ ہے
ہے زنخ ٹھوڑی، گلا ہے حنجرہ
سانپ ہے مار اور جھینگر زنجرہ
ہے زنخ ٹھوڑی، ذقن بھی ہے وہی
خاد ہے چیل زغن بھی ہے وہی
پھر غلیواز اس کو کہیے جو ہے چیل
چیونٹی ہے مور اور ہاتھی ہے پیل
لومڑی روباہ اور آہو ہرن
شمس سورج اور شعاع اس کی کرن
اسپ جب ہندی میں گھوڑا نام پائے
تازیانہ کیوں نہ کوڑا نام پائے
گُربہ بلّی، موش چوہا، دام جال
رشتہ تاگا، جامہ کپڑا، قحط کال
خر گدھا، اور اس کو کہتے ہیں اُلغ
دیگداں چولہا جسے کہیے اُجاغ
ہندی چڑیا، فارسی کنجشِک ہے
مینگنی جس کو کہیں، وہ پِشک ہے
تابہ ہے بھائی توے کی فارسی
اور تبہو ہے لوے کی فارسی
نام مکڑی کا کلاش اور عنکبوت
کہتے ہیں مچھلی کو ماہی اور حوت
پشّہ مچھر اور مکھّی ہے مگس
آشیانہ گھونسلا، پنجرہ قفس
بھیڑیا گرگ اور بکری گوسفند
میش کا ہے نام بھیڑ اے خود پسند
نام گُل کا پھول، شبنم اوس ہے
جس کو نقّارہ کہیں وہ کوس ہے
سقف چھت ہے، سنگ پتھر، اینٹ خشت
جو برا ہے اس کو ہم کہتے ہیں زشت
خار کانٹا، داغ دھبہ، نغمہ راگ

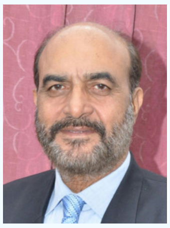

تبصرہ۔ بر کتاب ''سپوتِ ایشیا'' مصنف: رانا عبدالرزاق خان

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالدؔ صاحب لاہور

محترم رانا عبدالرزاق خاں صاحب ایک ایسی علم دوست اور ادب نواز شخصیت کا نام ہے جس کے ساتھ میرے لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ جڑا ہوا ہے۔ میں نے سکول اور کالج کی تعلیم کے دوران انہیں بہت قریب سے دیکھا اور انہیں ایک باصلاحیت، مستعد اور حسنِ خلق کا پیکر مشاہدہ کیا۔ ایک جوانِ رعنا کی صورت ان کی شکل خوبصورت اور طرز ادا دلفریب تھی۔ جن لوگوں نے انہیں اس زمانے میں دیکھ رکھا ہے وہ میری اس بات پر صاد کریں گے۔ تب یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اصلاً اور نسلاً راجپوت ہیں۔ لیکن دھیرے جب انہوں نے عملی میدان میں قدم رکھنا شروع کیا تو راجپوت قوم کے اثرات بھی اپنا رنگ دکھانے لگے۔ زندگی کے شداید کا مقابلہ بڑی ہمت اور جواں مردی سے کیا۔ پاکستان اور بحرین میں رہ کر بہت سے کام کئے۔ نوے کی دہائی میں ان کی قلمی کاوشوں کا آغاز ہوا اور مختلف اخبارات ورسائل میں شخصی تعارفوں پر مشتمل مضامین لکھنے لگے۔ 2005 میں وہ لندن میں وارد ہوئے اور پھر تو گویا دبستان کھل گیا۔ لندن میں آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ ادبی سطح پر متحرک ہوئے اور شعری ذوق کی تسکین کے لئے ''بزمِ شعروسخن'' کی تشکیل عمل میں لائے۔ اس بزم کے تحت انہوں نے مشاعروں کی بنیاد رکھی اور اس عظیم الشان روایت کو زندہ کیا جو برِصغیر پاک وہند کی علمی اور ادبی فضا کا اہم حصہ تھی۔ اس سلسلے کا پہلا مشاعرہ 2009 میں منعقد ہوا جس میں ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ اس ابتدائی مشاعرے کو 13 برس بیت گئے ہیں۔ ان تیرہ برسوں میں انہوں نے سوشل میڈیا کا حربہ استعمال کر کے زوم کے ذریعے عالمی مشاعروں کا آغاز کیا جس میں گلوبل وِلج سے بڑھ کر گلوبل سیٹ کی اصطلاح کو سچ ثابت کیا۔ ان مشاعروں میں دنیا بھر سے نام ور سخنور شرکت کرتے اور شاعری کے نت نئے ذائقوں سے آشنائی بخشتے ہیں۔ خاکسار کو بھی کئی مرتبہ ان مشاعروں میں شرکت کا موقع مل چکا ہے۔ اور رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی شاعری سننے کے ساتھ ساتھ ان کی نظامت اورحسنِ انتظام کی داد دینے کا سامان بہم ہوا ہے۔ اردو زبان وادب کی ایسی شاندار خدمت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو دیارِ غیر میں رہ کر بھی محدود وسائل کے باوجود یہ کام کئے جاتے ہیں۔ قدرت نے ان کی طبیعت

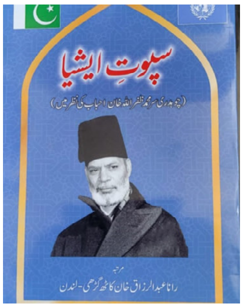

میں یہ وصف ودیعت کر رکھا ہے کہ وہ جس کام کا ارادہ کریں وہ کر کے رہتے ہیں۔ اسی پر بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مسلسل محنت اور عزم وعمل سے اس کام میں مداومت اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے 2013 میں ایک اہم علمی اور ادبی کام کا بیڑا اٹھایا اور ''قندیلِ ادب انٹرنیشنل'' کے نام سے آن لائن میگزین نکالنا شروع کیا۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی لوگوں نے بیرونِ ملک سے اسی نوع کے کام شروع کئے لیکن آج ان کی کوئی خبر نہیں جبکہ رانا صاحب اس میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں اور ہر ماہ باقاعدگی سے ''قندیلِ ادب'' کا خوبصورت شمارہ لئے موجود ہوتے ہیں۔ جو دیدہ زیب لے آؤٹ کیساتھ نو بہ نو موضوعات پر شاندار مضامین نظم ونثر اپنے دامن میں لئے ہوئے قارئین کے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ یہ میگزین دنیا بھر کے لاکھوں قارئین تک ای میل اور ویب سایٹ کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔ اور اردو زبان کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مضمون نویسی کا وہ سلسلہ بھی ہنوز قائم ہے جو پاکستانی اخبارات سے شروع ہوا تھا۔ آج وسعت اختیار کر کے امریکہ، آسٹریلیا اور بھارت کے اخبارات تک محیط ہو چکا ہے۔ مزید یہ کہ قندیل ادب کے عالمی مشاعروں نے دنیا بھر میں دُھوم مچا رکھی ہے۔ ان سب پر اضافہ ان کا وہ واٹس ایپ چینل ہے جس پر رونق افروز ہو کر وہ عالمی خصوصاً پاکستانی سیاست اور یہاں کے حالات کو زیر بحث لاتے اور اپنے سننے والوں کو مفید معلومات سے نوازتے ہیں۔

حیرت کی بات رانا عبدالرزاق خاں صاحب یہ سارے کام تن تنہا انجام دیتے ہیں اور لندن کی طلسماتی تفریحات میں دل لگانے کی بجائے قلم سے راز ونیاز کرتے ہیں۔ رانا صاحب کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ الگ ہے جس میں وہ اپنی کئی قیمتی کتب شائع کر چکے ہیں۔ ان کتابوں پر اہل علم اور ادب پرور شخصیات نے نہایت شاندار تبصرے کئے ہیں اور رانا صاحب کی مرتبہ بصیرت افروز تصنیفات پر کھلے دل سے داد دی ہے۔ ان کتابوں کا تحسین

آمیز پہلو یہ ہے کہ علم و ادب کے بنیادی مراکز سے دُور بیٹھ کر لکھی گئی ہیں جہاں ضروری مواد کی فراہمی اور ماخذات تک رسائی ایک اہم مسئلہ ہے لیکن رانا صاحب کی جُستجو اور تلاش نے نہ صرف اس مسئلے کو حل کر دیا اور مجھ ایسے کئی لکھنے والوں کو آئینہ بھی دکھا دیا جو بڑے بڑے منصوبے باندھ کر اس گٹھڑی کو بغل میں دابے پھرتے ہیں۔ اور قیل و قال تک محدود رہتے ہیں۔

اس وقت میں رانا عبدالرزاق خان کی نادر و نایاب کتاب ''سپوتِ ایشیا'' پر نظریں جمائے بیٹھا ہوں جو دیکھنے میں اپنی چھ سو صفحات کی ضخامت سے متوجہ کرتی ہے اور اس کے بعد دنیائے اسلام اور عالمی سیاست کے ایک روشن اور تابندہ کردار چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کی انتہائی فعال اور متحرک زندگی کے در و بست نگاہوں میں لاتی ہے۔ چوہدری صاحب کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں لیکن جب وہ اس دنیا میں آتی ہیں تو ساری دنیا کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور اپنی جدوجہد، محنت اور سعی پیہم سے وہ مقام حاصل کر لیتی ہیں کہ دلوں پر ان کا نام نقش ہو جاتا ہے۔ ان کی راہوں پر پھول ہی نہیں برستے، لوگ دیدہ دل فرشِ راہ کرتے ہیں اور ایک خلقت آنکھیں بچھاتی ہے۔ ان کا حسنِ عمل ان کی شخصیت پر نگران ٹھہرتا ہے اور ان کا ہر اٹھتا ہوا قدم زمین نہیں، آسمان پر پڑتا ہے۔ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان اس نادر و نایاب ہستی کا نام ہے، جس جیسا پوری صدی میں دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ بقولِ غالب ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان ''سپوت ایشیا'' ہی نہیں بلکہ سپوتِ عالم کہلانے کے حق دار ہیں کہ انہوں نے محض ایشیائی اقوام کے حق میں ہی نہیں اواز بلند کی، بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں ظلم، ناانصافی اور انسانوں پر جبر و تعدّی کے آثار پیدا ہوئے وہاں سر محمد ظفر اللہ خان مجبور و مقہور لوگوں کی آواز بن کر سلامتی کونسل کے ایوانوں میں آوازِ حق بلند کرتے نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی صاحبِ بصیرت سیاست دان، مدبر، دانش ور اور انصاف پسند شخص ایسا نہیں ہے جس نے چوہدری صاحب مرحوم کے حق میں کلمۂ تحسین ادا نہ کیا ہو اور آپ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نہ ہوا ہو۔ اہلِ عالم کے یہ کلماتِ تحسین اور اہلِ دانش و بینش کی آراء دنیا بھر کے اخبارات و رسائل میں بکھری پڑی تھی۔ جنہیں رانا عبدالرزاق خان صاحب نے سلیقے سے ترتیب دے کر ایک خوبصورت کتاب کی صورت پیدا کی۔ اس پر رانا صاحب کی قلمی کاوش کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کی محنت اور کدوکاوش کتاب کے ہر صفحے سے جھلکتی ہے۔ چوہدری صاحب کی ذات والا صفات اور شخصیت کے محاسن پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں ہر طبقے اور شعبہ ہائے زندگی کے لوگ شامل ہیں۔ ان لوگوں نے محض تکلفاً اپنی رائے نہیں دی بلکہ ان تمام آراء کا ایک ایک لفظ دِل کی گہرائیوں سے نکلا ہے اور حق و صداقت پر مبنی ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ جتنی بڑی شخصیت سامنے ہے اس کے مقابلے میں الفاظ کا دامن تنگ نظر آتا ہے۔ آپ کے فضائل اور خصائل دیکھ کر خامۂ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ اور بلند ترین منصب پر فائز ہو کر آپ عاجزی اور انکساری کا مرقع نظر آتے ہیں اور دنیاوی حیلوں اور ہتھکنڈوں سے بیخوف ہو کر اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایک ابدی سلک میں منسلک دکھائی دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آوازِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو تو اس حوالے سے یہ کتاب دنیا بھر سے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان کے حق میں اُٹھنے والی آوازوں کا مجموعہ ہے۔ یہ وہ گواہی ہے جو بلاتمیز مذہب و نسل اہلِ عالم نے آپ کے حق میں ثبت کی۔ یہ وہ نقارہء خدا ہے جو ڈنکے کی چوٹ پر آج بھی بج رہا ہے اور رہتی دنیا تک بجتا رہے گا۔

رانا عبدالرزاق خان کا یہ ذوق، تصنیف و تالیف ''سپوتِ ایشیا'' کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اللہ ان کے ذوق کو جلا بخشے اور مستقبل میں انہیں ایسے قیمتی گوہر اُچھالنے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ میں ان کی صحت و سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ اس کارِ ہنرمنداں کو سلامت رکھے آمین

امجد مرزا امجدؔ، لندن

میں تے پیار نبھاون دی سونہہ ربّ دی کھادی یار
توں کیوں کھوبی سینے دے وِچ اکھراں دی تلوار
پی پی کے زہر لوکاں دا میں تے نہیں سی مرنا
تیری اِک نِکّی جئی گل نے مینوں دِتا مار
شوہ دریا چہ ترے لئی میں ٹھیہہ دِتی سی بیڑی
میرے تھاں توں کچے گھڑے تے کیتا جے اعتبار
ساری راتیں ہجر دے ڈونگھے پانی وچ گزاراں
دِن چڑھے تک تُو نہ آئیوں نہ کونجاں دی ڈار
سارے شہر دے پیر فقیر وی اندروں جھوٹے نکلے
سڑ کے ہویا سواہ مِٹی جد پھوک دتی تُوں مار
مینہ دکھاں دا کدی نہ وسدا ویہڑے وچ اساڈے
آجاندی جے سمجھ ایہہ امجدؔ کیتا سچا پیا

امجد مرزا امجد

عظیم قلمکار شاعر و ادیب، بے باک صحافی، ایڈیٹر و مصنف و افسانہ نگار

پوارا نام امجد علی مرزا جبکہ ادبی نام امجد مرزا امجدؔ ہے۔ پیدائش: ملہال مغلاں ضلع و تحصل چکوال، 28 اگست 1942ء والد (مرحوم) پر فالج کے حملے کی وجہ سے ہائی اسکول سے کالج تک پہنچنا خواب ہی رہا اور گھریلو ذمہ داریوں کا فرض نبھانا اہم سمجھا ،دو سال کے بعد 1961ء جولائی کو بذریعہ سڑک دو ماہ کے طویل اور مشقت بھرے سفر کے بعد جیب میں فقط پچاس روپے لئے انگلینڈ پہنچا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پاکستان میں پانچ بہن بھائیوں اور بوڑھے والدین کی ذمہ داریوں کو اللہ کی مدد سے نبھایا، آج وہ تمام اعلی تعلیم یافتہ اور اپنے گھر بال بچوں والے ہیں ماں باپ کی شفقت سے محروم ہی رہا نہ ہی بہن بھائیوں کو جوان ہوتا دیکھ سکا اور انہی فرائض کی ادائیگی جس کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کے بھی فرائض شامل ہو گئے آج بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا ہوں مگر کبھی کسی بات پر افسوس نہیں ہوا۔ زندگی بھرپور گزری اللہ کا ہمیشہ فضل و کرم رہا اور ماں باپ کی دعاؤں کی چھتر چھاؤں میں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا کامیابی حاصل ہوئی۔ 1988 میں مٹی کی محبت کھینچ کے وطن لے گئی مگر وہاں جا کر احساس ہوا کہ طویل مدت گھر سے باہر رہنے والے ہمیشہ کے لئے پردیسی ہو جاتے ہیں اور یہ طویل دوری ہر رشتے کے درمیان ایک ہلکی سی لکیر کھینچ دیتی ہے۔ آٹھ سال وہاں رہ کر احساس ہوا کہ وہ زمین اس قابل نہیں جس میں وہ پودے لگائے جائیں جو باہر کی آب و فضا میں پیدا ہوئے تھے اور نہ ہی میرے جیسے جن کی جڑیں پرانی اور کسی اور زمین کی عادی ہو گئی ہوں۔ جو کچھ بچا کر لایا تھا تجربے کی بھینٹ چڑھا کر پھر سے آنکھوں میں آنسو بھرے واپس آ گیا ہمیشہ کے لئے...!! ریٹائرمنٹ کے بعد 1997 سے قلم سنبھالی۔ نثر سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا بعد میں شاعری بھی شروع کی مگر اصل میدان نثر ہی رہا اور آج تک مسلسل ادب کا کام جاری و ساری ہے اور انشاءاللہ جاری رہے گا۔ میرے دو بچے ہیں ایک بڑی بیٹی جس کے ماشاءاللہ دو جوان بچے ہیں ایک بیٹا ایک بیٹی۔ میرا دوسرا بیٹا ہے جو ویب ڈیزائنر ہے میں اپنی تمام کتابیں خود کمپوز کرتا ہوں اور اپنی ''سویرا اکیڈیمی'' کے پلیٹ فورم سے شائع کرتا ہوں مزید معلومات مندرجہ ذیل ہے۔

تصنیفات: ا کانچ کے رشتے افسانے اردو 2000ء
(لندن اور ہیرو کی تین لائبریوں نے مل کر 2002 میں سب سے زیادہ پڑھی جانی والی کتاب کا ایوارڈ دیا۔)

* ۔سونے کی صلیب افسانے اردو 2001ء
* ۔دوریاں افسانے اردو 2003ء
* ۔پھلواری انشائیہ اردو 2004ء
* ۔اوکھے پینڈے افسانے پنجابی 2004ء
* ۔یادیں شاعری پنجابی 2004ء
* ۔تنہائیاں افسانے ارود 2005ء
* ۔جھوٹے لوگ افسانے اردو 2006ء
* ۔ دھنک کے رنگ انشائیہ اردو 2006ء
* ۔ ہوائے موسم دل شاعری اردو 2010ء
* ۔توبہ افسانے اردو 2012ء (سعادت حسن منٹو ایوارڈ یافتہ)
* ۔وچھوڑے شاعری پنجابی 2013ء
* ۔''برطانیہ کے ادبی مشاہیر'' مضامین اور ان کا منتخب کلام 2014ء
* ۔چند قہقہے (لطیفے) 2015ء
* ۔یادِ ماضی افسانچے 2017ء
* ۔ سوزِ حیات اردو شاعری 2017ء
* ۔کچھ کہا سخنوروں نے مضامین 2018ء
* ۔ بولتے حروف مضامین 2019ء
* ۔بوڑھ دی چھاں پنجابی شاعری 2020ء
* ۔ شعلۂ سخن اردو شاعری 2020ء
* ۔مسکان سنی سنائی مزاحیہ کہانیاں 2021ء
* ۔سخنِ گل اردو شاعری 2021ء

مزید کتب جو زیر ترتیب ہیں۔ ''یورپ کے ادبی مشاہیر'' (ادبی مشاہیر کا تعارف اور ان کا کلام) مسکان 2 (سنی سنائی ہوئی مزاحیہ کہانیاں)، بہت ہو چکا (افسانہ) پنجابی شعری مجموعہ اور اردو شعری مجموعہ، پنجابی افسانے (برطانیہ کے معروف افسانہ نگاروں کے افسانے پنجابی میں ترجمہ) طویل افسانے، قہقشاں (لطیفوں کا دوسرا مجموعہ) اور اپنی آپ بیتی

بنام’’میں اور وہ‘‘ زیرترتیب ہیں۔ ایوارڈز: (سوشل کارکردگی)

۱) 2004ء کوسٹی فاریسٹ کالج لندن نے ادبی خدمات کے اعتراف میں بی اے کی اعزازی ڈگری دی جو ایک ادبی محفل میں لارڈ نذیر احمد کے ہاتھوں 3 جولائی 2004 کو دی گئی۔

۲) اکتوبر 2003ء کو پاکستان ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکریٹری کے ہاتھوں ’’پاک پنجابی ادب اینڈ کلچرل سوسائٹی لندن‘‘ نے یورپ میں پہلا پنجابی رسالہ ’’سویرا‘‘ نکالنے اور پنجابی ادب کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔ ۳) 12 مئی 2005ء کو والتھم فاریسٹ بارو (ضلع) نے کمیونٹی خدمات کے اعتراف میں ’’سیوک ایوارڈ‘‘ دیا جو یہاں کی کونسل کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے اور مجھ سے پہلے صرف دو ایشیائی لوگوں کو ملا، ساٹھ ہزار پاکستانیوں (ایشین) کی آبادی میں یہ تیسرا ایوارڈ تھا جو کسی پاکستانی کو ملا۔

۴) 10 نومبر 2005ء کو سیمی گورنمنٹ کمیونٹی والنٹی بنام ’’ایج کنسرن‘‘ کی جانب سے بزرگ ایشیائی لوگوں کی تنظیم ’’سینئرسٹی زن ایشن گروپ‘‘، جس کا میں اڑھائی سال سے جنرل سیکریٹری تھا کی کمیونٹی خدمات کے صلہ میں بہترین کارکردگی کا سر ٹیفکیٹ اور پچاس پونڈ کے ٹوکن انعام میں ملے۔

ایوارڈز: (ادبی)۔ ۱) 2004ء کوسٹی فاریسٹ کالج لندن نے ادبی خدمات کے اعتراف میں بی اے کی اعزازی ڈگری دی جو ایک ادبی محفل میں لارڈ نذیر احمد کے ہاتھوں 3 جولائی 2004 کو دی گئی۔ ۲) اکتوبر 2003ء کو پاکستان ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکریٹری کے ہاتھوں ’’پاک پنجابی ادب اینڈ کلچرل سوسائٹی لندن‘‘ نے یورپ میں پہلا پنجابی رسالہ ’’سویرا‘‘ نکالنے اور پنجابی ادب کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔ ۳) 12 مئی 2005ء کو والتھم فاریسٹ بارو (ضلع) نے کمیونٹی خدمات کے اعتراف میں ’’سیوک ایوارڈ‘‘ دیا جو یہاں کی کونسل کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے اور مجھ سے پہلے صرف دو ایشیائی لوگوں کو ملا، ساٹھ ہزار پاکستانیوں (ایشین) کی آبادی میں یہ تیسرا ایوارڈ تھا جو کسی پاکستانی کو ملا۔ ۴) 10 نومبر 2005ء کو سیمی گورنمنٹ کمیونٹی والنٹیر بنام ’’ایج کنسرن‘‘ کی جانب سے بزرگ ایشیائی لوگوں کی تنظیم ’’سینئرسٹی زن ایشن گروپ‘‘، جس کا میں اڑھائی سال سےجنرل سیکریٹری تھا کی کمیونٹی خدمات کے صلہ میں بہترین کارکردگی کا سرٹیفکیٹ اور پچاس پونڈ کے ٹوکن انعام میں ملے۔ ۴) 10 نومبر 2005ء کو سیمی گورنمنٹ کمیونٹی والنٹیر بنام ’’ایج کنسرن‘‘ کی جانب سے بزرگ ایشیائی لوگوں کی تنظیم ’’سینئرسٹی زن ایشن گروپ‘‘، جس کا میں اڑھائی سال سے جنرل سیکریٹری تھا کی کمیونٹی خدمات کے صلہ میں بہترین کارکردگی کا سر ٹیفکیٹ اور پچاس پونڈ کے ٹوکن انعام میں ملے۔ ۵) والتھم فاریسٹ کی ادبی تنظیم ’’امیر خسرو سوسائٹی‘‘ کی جانب سے میئر آف والتھم فاریسٹ لیاقت علی کے ہاتھوں ادبی خدمات کے صلہ میں ایوارڈ۔ ۶) 30 نوری 2006ء کو Leszek the second Prince of Gneixni USA)) کی جانب سے کمیونٹی سروس کے صلہ میں ایوارڈ۔ ۷) 11 مارچ 2006ء کو لندن کی ’’پنجابی ادبی سنگت‘‘ کی جانب سے پنجابی ادب کے فروغ کے اعتراف میں والتھم فاریسٹ بارو کے میئر مارٹن ملٹن کے ہاتھوں ایوارڈ۔ ۸) 2006ء کو ’’پنجابی لکھاری فورم لندن‘‘ کی جانب سے والتھم فاریسٹ بارو کے میئر کے ہاتھوں پنجابی ادب کی طویل خدمات کے صلہ میں ایوارڈ۔

۹) فروری 2007ء پاکستانی سماجی اور ادبی کارکنان ایسٹ لندن کی جانب سے یورپ میں پہلا پنجابی رسالہ ’’سویرا‘‘ اور اردو کا پہلا مزاحیہ رسالہ ’’مسکان‘‘ جاری رکھنے پر ایوارڈ۔ ۱۰) 20 مارچ 2007ء کو ہاؤس آف کامن لندن میں ’’پنجابی ان برٹن آل پارٹی پارلیمنٹری گروپ‘‘ کی جانب سے ایم پی جان پینڈل کے ہاتھوں یورپ کا پہلا پنجابی رسالہ ’’سویرا‘‘ اور پنجابی ادب کے فروغ کے اعتراف میں ایوارڈ دیا گیا۔ لندن کے پنجابی سکھ گروپوں میں پہلا پاکستانی تھا۔ ۱۱) 21 مئی 2007ء والتھم فاریسٹ بارو کے میئر فاروق قریشی نے اردو پنجابی ادب کے فروغ کے اعتراف میں شیلڈ پیش کی۔ ۱۲) 2009ء کو والتھم فاریسٹ بارو کی جانب سے میئر مسعود احمد نے کمیونٹی کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔ ۱۳) 2009 کو ’’پاکستان اچیومنٹ ایوارڈ‘‘ کی جانب سے بہت بڑے اجلاس لندن کے فائیو سٹار ہوٹل میں پاکستان ہائی کمشنر کے ہاتھوں بہترین کالم نگار کا ایوارڈ۔ ۱۴) 2011 کو والتھم فاریسٹ پاکستانی کمیونٹی کی جانب سے پنجابی اور اردو زبان کی ترقی وترویج کے اعتراف میں شیلڈ دی گئی۔ ۱۵) 6 اپریل 2013ء جرمنی کی تنظیم ’’حاجی شریف ایجوکیشنل اکیڈمی‘‘ کی جانب سے لاہور کے الحمرا ہال میں تین ججوں کے متفقہ فیصلہ پر افسانوں کی کتاب ’’توبہ‘‘ کو ’’سعادت حسن منٹو‘‘ ایوارڈ دیا گیا۔ جو لندن آکر شریف اکیڈیمی کے بانی و صدر جناب شفیق مراد نے ’’والتھم فاریسٹ پاکستانی کمیونٹی فورم‘‘ کے ادبی

جلسے میں خوبصورت شیلڈ دی۔(۱۶) 'والنٹری ایکشن والتھم فاریسٹ کی جانب سے کمیونٹی میں رضا کارانہ خدمت کے اعتراف میں سرٹفکیٹ دیا گیا ۔(۱۷)28 مئی 2014 ہڈرز فیلڈ کے ریڈیو سنگم نے مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں سنگم ریڈیو کی جانب سے اردو، پنجابی ادب کی طویل خدمات کے اعتراف میں شیلڈ دی گئی۔(۱۸) جون 2014 کو والتھم فاریسٹ بارو کے میئر ندیم علی نے کمیونٹی کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔

(۱۹) نومبر 2015 کو والتھم فاریسٹ پاکستانی کمیونٹی فورم اور ایشین لنک، یورپین یونین، لندن ایسٹ اتھینک بزنس ایسوسی ایشن نے مشترکہ کمیونٹی کی اعلی سروس کے اعتراف میں ڈاکٹر شوکت نواز نے ایوارڈ دیا (۲۰) 26 مئی 2016 ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) سے ایک مشاعرے میں پاکستان تحریک انصاف کے تعاون سے ادیب آف دی ییز 2016 کا ایوارڈ شیشے کی خوبصورت شیلڈ میں دیا۔ جو میری جانب سے معروف شاعر امیر عامر نے وصول کیا اور لندن کے مشاعرے میں پیش کیا۔ ۲۱) جون 2016 کو والتھم فاریسٹ کی سابقہ پہلی پاکستانی مسلم خاتون میئر مہر خان نے اپنے اظہر اقرا اسکول کے ساتھ طویل تعاون پر بارکنگ پارک ہوٹل بارکنگ میں بارکنگ کے میئر گوردھیال بمرا کے ہاتھوں شیلڈ دی۔ ۲۲) والتھم سٹو کی مسلم ایسی ایشین نے اپنے ''یوم پاکستان'' پر لائف اچیومنٹ ایوارڈ دیا۔ ۲۳) ۱۹رنومبر 2017 کو فرینکفورٹ جرمنی کے عالمی مشاعرے میں ''اردو جرمنی کلچرل سوسائٹی'' کی جانب سے ادبی اور صحافتی طویل خدمات کے اعتراف میں ''فیض احمد فیض'' ایوارڈ دیا گیا۔ ۲۴) 21 دسمبر 2017 کو ''قندیل ادب'' لندن کی جانب سے اس کے بانی و صدر جناب عبدالرزاق رانا صاحب نے ٹوٹنگ براڈوے میں عالمی مشاعرے میں معروف شاعر جناب مبارک صدیقی کے ہاتھوں ''قندیل ادب'' کا ایوارڈ ایک خوبصورت شیلڈ میں عطا کیا۔ ۲۵) 29 فروری 2020 کو ہفت روزہ ''نوائے جنگ'' کی 17 ویں سالگرہ پر'' پاکستان کمیونٹی 17 اچیومنٹ ایوارڈ'' کے پروگرام میں نواب ہوٹل میں وینڈز ورتھ کے میئر کے ہاتھوں طویل ادبی خدمات کے صلہ میں ایوارڈ دیا گیا۔

متفرقات: (ادبی سرگرمیاں)

۱) مئی 2002ء کو یورپ کا پہلا پنجابی رسالہ ''سویرا'' نکالا جس کی کمپوزنگ، پرنٹنگ اور پوسٹنگ اکیلے کی پہلے دو سال ماہانہ رکھا جبکہ اس کے بعد دوسرا اردو رسالہ جاری کرنے پر دونوں رسائل سہ ماہی کر دیئے۔ ''سویرا'' پورے پانچ سال 2007 تک جاری رہا۔ ۲) یورپ کا پہلا رسالہ اردو میں ''مسکان'' فروری 2004ء میں جاری کیا اس کا بھی تمام کام اکیلے کیا۔ یہ سہ ماہی رسالہ ڈیڑھ سال تک پوری کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ ۳) ''سویرا اکیڈیمی'' کے نام سے پبلی کیشن کا کام جاری کیا جو 2002ء سے تاحال جاری ہے جس کے پلیٹ فارم سے ابھی تک اپنی اور دوستوں کی 23 کتابیں شائع کیں۔ ۴) اپنی اور دوستوں کی اب تک 22 کتابیں خود کمپوز کی ہیں۔ ۵) پانچ سال تک لندن کے ہفت روزہ ''نوائے وقت'' میں ''فکرِ جہاں'' کے نام سے کالم لکھا جسے خود ہی کمپوز کرتا رہا۔ ۶) 2009ء سے 2015 تک ہفت روزہ'' اخبار''یوکے ٹائمز'' کا ادبی صفحہ مرتب کرتا رہا۔ ۷) 2013ء سے لندن کے ہفت روزہ اخبار ''نیشن'' میں حالات حاضرہ پر اخبار کے ایڈوٹوریل صفحہ پر ایک قطعہ لکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کتابوں پر تبصرے بھی بھیج رہا ہوں۔ ۸) آٹھ ماہ لندن کے ٹی وی چینل ''ڈی ایم ڈیجٹل'' پر ''میں نے ایک شعر کیا'' کے نام سے ادبی پروگرام کیا جس میں لندن کے شعرا کی شرکت ہوتی۔

۹) دس ماہ تک لندن کے ٹی وی چینل ''تکبیر'' پر ہفتہ وار دو پروگرام دیئے۔ ایک ''سخن ور'' جس میں شعرا کو شریک کیا جاتا۔ دوسرا ہفتہ وار ''دستک'' جو سماجی مسائل پر مبنی تھا یہ دنوں پروگرام منگل اور بدھ کو پیش ہوتے اور دنیا کے ساٹھ ممالک میں دیکھے جاتے۔ اس کے علاوہ ہر روز دوستوں کا کوئی کلام خوبصورت گرافک میں بنا کر پانچ ممالک میں تین سو لوگوں کو ای میل کرتا ہوں۔ ۱۰) 2006ء سے ایک ادبی تنظیم ''والتھم فاریسٹ پاکستانی کمیونٹی فورم'' کا بانی و جنرل سیکریٹری ہوں جو ہر ماہ کی پہلی اتوار کو 3 بجے سے 7 بجے تک نہایت بھرپور ادبی و سماجی پروگرام کرتی ہے جس میں ہر چار مشاعروں کے بعد ایک موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے۔ اس پلیٹ فورم سے اب تک 35 کتابوں کی تقریب رونمائی بھی کی جا چکی ہے جس پر مصنفین سے کوئی لاگت نہیں لی جاتی۔ اب تک اس تنظیم کے 140 ممبر ہو چکے ہیں اور ہر مشاعرے میں 40 سے اوپر شعرا و شاعرات اور 80 کے قریب تمام لوگ ہوتے ہیں۔ ۱۱) ماہنامہ ساحل میں دو صفحات پنجابی شاعری اور نثر کمپوزنگ کر کے دیتا ہوں۔

برطانیہ کا یہ واحد ماہنامہ ہے جو اردو، پنجابی اور انگریزی میں شائع ہوتا

ہے اس کی ادارت میں بھی شامل ہوں۔مگر افسوس کہ مدیر اعلی کی وفات کے بعد کچھ مدت جاری رہا مگر بند ہوگیا۔ ۱۲) اب تک جو بھی کتاب ملی اس پر مضمون لکھ کر مقامی اخبارات و رسائل میں شائع کرایا۔اب تک 1200 کتابوں اور شخصیات پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۳) اپنے ماہانہ مشاعرے میں شامل شعرا کی وڈیو بنا کر یوٹیوب پر بھیجتا ہوں جو 2016 تک 1350 کی تعداد تک پہنچ گئی ہیں۔ ۱۴) ہفتہ وار ”فرائی ڈے ٹائمز“ کا ادبی صفحہ مرتب کرتا رہا یہ نیا اخبار اگست 2016 کو شائع ہوا۔جو چھ ماہ کے بعد بند ہوگیا۔ ۱۵) ماہنامہ ”قندیل ادب“ جو چودہ سال سے ویب سائیڈ پر جاری رہا ایک سال میری وساطت سے پرنٹ ہوتا رہا۔جس میں ایک صفحہ بنام ”پنجابی دے رنگ“ مرتب کرتا رہا۔

اس کی ادارت میں بھی شامل ہوں اور باقاعدگی کے ساتھ میرا افسانہ ،انشائیہ اور اردو یا پنجابی کی غزل شائع ہوتی ہے۔ ۱۶) 2017 سے ”سویرا اکیڈیمی لندن“ سے لندن سے ہی کتابوں کی پرنٹنگ کا کام شروع کیا،اب تک ۶۴ سے زیادہ کتابیں دوست احباب کی بھی شائع ہوئیں۔اپنی اور احباب کی کتابیں خود کمپوز کرتا ہوں۔آج تک احباب کی 65 کتابیں کمپوز ہوچکی ہیں اور کام جاری ہے۔انگلینڈ میں کوئی اور کمرشل اور اس پیمانے پر یہ کام نہیں کر رہا۔ ۱۷) جنوری 2020ء سے آن لائین اور واٹس اپ پر ماہوار رسالہ ”قرطاسِ ادب“ کے نام سے شروع کیا۔جو ۱۸ صفحات تک ہے۔مگر عدم تعاون کی وجہ سے پانچ شماروں کے بعد بند کر دیا گیا۔۔

ندیم ناجد

جو سن سکو تو سنو فُغاں چراغوں کی
لویں چرا لی گئی ہیں یہاں چراغوں کی
میں خال وخد کے بکھرنے سے بچنا چاہتا ہوں
سو مجھ کو چاہیے کچھ دن اماں چراغوں کی
جسے بھی چاہیے وہ آئے روشنی لیجائے
سجائے بیٹھے ہیں ہم تو دوکاں چراغوں کی
یہیں کہیں پہ محبت کا ہے پڑاؤ میاں
سنائی دینے لگی ہے اذاں چراغوں کی
سحر سے کہیے کہ ٹھہرے اور انتظار کرے
میں سن رہا ہوں ابھی داستاں چراغوں کی

رشید قیصرانی

تیرا شہر صنوبر والا پوٹھوہار کا چہرا ہے
میرا کیکر والا گاؤں بھی تھل داماں کا سہرا ہے
تیرے شہر میں رقص کریں گل بوٹے سرد ہواؤں کے
دھوپ دھمال کا منظر کتنا دلکش میرے گاؤں میں
تیرے شہر کے بنگلوں میں ہیں قصے اُجلی کاروں کے
میرے گاؤں کی بیٹھک میں بھی چرچے گھوڑ سواروں کے
تیرے شہر میں گلشن گلشن میلے ماہ جمالوں کے
میرے گاؤں کے ٹیلوں میں بھی نقش کئی دل والوں کے
تیرے شہر کیا کیا باتیں ہیں اُجلا شہر جیالے لوگ
میرے گاؤں کی زینت ہیں کچھ اُچے شملوں والے لوگ
تیرے شہر کے لڑکے بالے نام کمائیں کھیلوں میں
میرے گاؤں کے گبھرو ڈالیں جھمر میلوں ٹھیلوں میں
تیرے شہر کے لالہ و گل بھی مانا من متوالے ہیں
میرے گاؤں کے پھوگ سنوار بھی یار بڑے دل والے ہیں
اپنے شہر سے لال گلابی پھول سجا کے لانا تم
میرے گاؤں میں نیلے پیلے پیلو چننے آنا تم

وہ عشق جو ہم سے رُوٹھ گیا

وہ عشق جو ہم سے رُوٹھ گیا،اب اُس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں،کوئی قہر نہیں، پھر سچا شعر سنائیں کیا
اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے،تا دیر اسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دل میں اُتار لیا،پھر اس کے ناز اُٹھائیں کیا
پھر آنکھیں لہو سے خالی ہیں یہ شمعیں بجھنے والی ہیں
ہم خود بھی کسی کے سوالی ہیں،اس بات پہ ہم شرمائیں کیا
اِک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو، پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا
ہم نغمہ سرا کچھ غزلوں کے ہم صورت گر کچھ خوابوں کے
بے جذبہ شوق سنائیں کیا، کوئی خواب نہ ہو بتلائیں کیا

بھلا یہ بھی کوئی پینا ہے؟

انشائیہ

امجد مرزا امجدؔ

ایک صحیح الاعتقاد مسلمان شراب کا لفظ بھی اپنی زبان پر لانا گناہ سمجھتا ہے کہ کہیں نشہ نہ ہوجائے۔ مگر یورپ میں رہ کر ہم اتنے بہادر ضرور ہو گئے ہیں کہ دس بار شراب شراب کہنے سے بھی ذرا سر نہیں چکراتا۔ اسی لئے آج اس خباثت میاں کی اماں پر انشائیہ لکھنے بیٹھ گئے۔ رہی گناہ ثواب کی بات تو یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم یہ انشائیہ کس نیت سے لکھ رہے ہیں۔۔ کسی اور سے جواب طلبی کی امید نہیں رکھتے۔! شراب صرف یورپین یا غیر مسلم ہی نہیں پیتے بلکہ بہت سے ایسے مسلمان بھی ہیں جو تھوڑی بہت پی لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب تک اس سے نشہ نہیں ہوتا یہ گناہ کے زمرے میں نہیں آتی۔ بلکہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو نشے کے لئے پیتے ہیں اور جی بھر کر پیتے ہیں۔۔

پچھلے دنوں ہم نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ پاکستان کی مری بروری نے دنیا کی بہترین وہسکی اور ووڈکا تیار کر کے یورپ کو برآمد کیا ہے تو اس تجارتی خبر پر ہمارا سر فخر سے اپنے قد سے چار انچ اونچا ہوگیا بلکہ کئی دن تک گردن میں بل پڑا رہا جس کی وجہ سے گردن ابھی تک سیدھی نہیں ہوئی۔ کہ اسلامی جمہوریہ ملک نے ایسا کام کر دکھایا جو یورپ کا کوئی اور ملک نہیں کر سکا۔۔زندہ باد۔۔۔ پاکستان میں بھی لوگ اس مے سے کافی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مجھے بچپن کی یاد ہے سنا کرتے تھے کہ شراب پینے کا باقاعدہ پرمٹ لینا پڑتا ہے۔ اور کئی مسلمان اپنے نام کے ساتھ ''مسیح'' کا اضافہ کر کے پرمٹ آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسے آج کل مسیح، احمدی اور سید لگا کر بینکوں سے زکاۃ معاف کروا لیتے ہیں۔۔۔ امیر لوگ تو برانڈی، وہسکی اور کئی قسم کی اعلیٰ ولائتی شراب سے اپنے امیرانہ پن کا اظہار کرتے ہونگے مگر غریب بھی اس کا مزہ لینے کے لئے کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ وہ ٹھرا، کپی اور ٹینچر کارڈ سے دل کیا پورا جسم بہلا لیتے ہیں۔۔ امیر ولائتی شراب پی کر جھومتا ہوا اپنے بیڈروم میں چلا جاتا ہے اور سو جاتا ہے۔ اس طرح اسے اپنی دولت کی فکر سے چند گھنٹے نجات مل جاتی ہے۔ مگر غریب ٹینچر کارڈ یا دیسی ٹھرے کی بوتل چڑھا کر پہلے بازار جاتا ہے اور سارے شہر کے امیروں کی ماں بہنوں کو موٹے موٹے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ رشتہ داروں دوستوں یاروں اور دشمنوں کو للکارتا ہے اور خوب صلواتیں سنا کر کسی سے چانٹ مکا کھا کر کہیں نالی میں گرتا ہے اور کیچڑ میں لت پت ہوکر یا گھر آجاتا ہے یا کسی ہوٹل کے تھڑے پر گر کر بے ہوش ہوجاتا ہے کبھی کچھ ایسی بھی پی جاتا ہے کہ جھوم کر ایسے گرتا ہے کہ پھر کبھی نہیں اُٹھتا۔ اور کبھی اخبار نہ پڑھنے والے کی خبر دوسرے دن کی اخباروں میں چھپ جاتی ہے۔ اس سے بڑا کیا اعزاز ہوگا کسی کے لئے۔!! بچپن میں ہمارے محلے ایک پہلوان جی ہوا کرتے تھے جو ہفتہ میں ایک دو بار پی کر سچے جھوٹے نشے میں اپنے رسوئی خانے سے زنگ آلود چھری لئے بازار میں نکل آتے اور رات گئے تک اپنے دشمنوں کے ساتھ پولیس والوں کو بھی للکارتے اور گالیاں دیتے۔ سینما جانے والے اس روز فلم کا شو دیکھنے کی بجائے چار گھنٹے کا زندہ ڈرامہ مفت دیکھ کر ہنستے مسکراتے گھر لوٹ جاتے۔ آج وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر انہوں نے جہلم کے لوگوں کو بہت محظوظ کیا اور ان کے سینما کے پیسے بھی بچائے دوسروں کے لئے خوشی پیدا کرنا بھی تو ایک نیکی ہے۔ کہتے ہیں اللہ بڑا بے نیاز ہے کسے خبر اسے ان کی یہی نیکی پسند آجائے۔ پھر جنت میں تو سنا ہے بوتلوں کی بجائے نہریں ہونگی۔۔!! ایک بار سنا کہ پہلوان جی کو عجیب بیماری لگ گئی کہ انہیں اپنے کمرے میں ہر طرف سانپ اور بچھو نظر آنے لگے۔ ہم بھی اپنے چھوٹے پن سے فائدہ اٹھا کر ان کے گھر گھس گئے اور ان کی بیٹھک میں گئے تو واقعی پہلوان جی چیخ چیخ کر گھر والوں اور دوسرے محلے والوں کو خبردار کر رہے ہیں۔

''ارے دیکھو دیکھو وہ چار بڑے بڑے سانپ دیوار پر چڑھ رہے ہیں۔ ارے ایک طرف ہٹو کتنے سارے بڑے بڑے بچھو ڈنک اٹھائے ادھر فرش پر پھر رہے ہیں۔ یہ دیکھو کتنا بڑا اژدھا منہ کھولے آرہا ہے۔۔'' وہ اسی طرح اچھل اچھل کر اپنے آپ کو لہراتے ہوئے سانپوں سے بچا رہے تھے اور دوسروں کو متنبہ کر رہے تھے۔ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے کہنے لگے۔ ''بے چارے پہلوان جی نے کوئی ایسی زہریلی شے پی لی ہے کہ انہیں اب ہر طرف سانپ سانپ ہی نظر آرہے ہیں۔'' سچی بات کہوں! اس دن ہمارے کچے اور بچگانہ ذہن میں ایک ننھی سی خواہش آئی کہ کبھی وہ بوتل مل جائے جس

سے پہلوان جی پی کر رنگ برنگے سانپ دیکھ رہے ہیں تو ہم بھی ایک گھونٹ پی کر مفت میں یہ چڑیا گھر دیکھ لیں۔۔۔مگر ایسا کبھی نہ ہو سکا۔۔۔اور پھر کئی سال گذر گئے ہم نے ایک بار سنا پہلوان جی کو ان کے بیٹے نے اپنے پاس یورپ بلوالیا ہے۔مگر کچھ ہی دنوں بعد پہلوان جی گھبرا کر واپس اپنے ملک چلے آئے۔کسی دوست نے پوچھا۔"وہاں تو رنگ برنگی ولائتی شے ملتی تھی تم اسے چھوڑ کر پھر یہاں آ گئے۔" تو پہلوان جی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہاں یار! شراب تو وہاں طرح طرح کی ملتی تھی مگر پینے میں وہ مزہ نہیں جو اپنے ملک میں ہے۔وہاں تو سالا ہر کوئی ایسے ہی پیے جا رہا ہے۔ بس صوفوں پر بیٹھ کر چپ کر کے پیو اور منہ بند کر کے عورتوں کی طرح بستر میں گھس جاؤ۔۔۔لو بھلا یہ بھی کوئی پینے کا مزہ ہے۔۔ادھر اپنے ملک کی کیا بات ہے۔چاہے دیسی ٹھرا یا کچی ہو پیئو مگر پی کر جب بازار کے چوک میں کھڑے ہو کر شہر کے ڈپٹی کمشنر اور تھانے کے ایس اچ او کو دس بارہ گالیاں دو ۔۔اور علاقے کے بڑے ساہوکار اور کسی بدمعاش کی ماں بہن کو چند کراری کراری نہ سناؤ اس وقت تک پینے کا مزہ نہیں آتا۔۔۔ایسے پینے کا کیا فائدہ کہ شہر کو خبر ہی نہ ہو کہ آج پہلوان جی نے پی رکھی ہے۔۔۔"

ہمیں آج ساٹھ برس یورپ میں ہونے کو آئے مگر کسی مائی کے لال گورے نے پی کر ہمارے پہلوان جی کی طرح پینے کا لطف نہیں اٹھایا۔بھلا ان بے لطفوں کا پینا بھی کیا پینا ہے اس سے اچھا ہے کہ یہ پینا چھوڑ دیں۔۔اگر برائی کرنی ہی ہے تو پھر برائی کی طرح برائی کریں۔۔شریف بن کر برائی کرنا بھی کوئی شرافت ہے۔جسے برا آدمی بھی دیکھ کر منہ بسورے اور شریف بھی منہ پھیر دے۔سنا ہے آخری عمر میں پہلوان جی نے کیپسول کھانے شروع کر دیئے تھے کیونکہ لوگوں نے دیسی شراب میں بھی ملاوٹ کرنی شروع کر دی تھی۔پہلوان جی بڑے دکھ سے کہتے۔"ایک تو بڑھاپے نے دوسرا شراب میں ملاوٹ نے زندگی کا مزہ ہی چھین لیا ہے۔لوگ بھی اب بزدل ہو گئے ہیں۔کبھی کہیں کوئی پی کر کسی کو للکارتا نہیں سالے ہیجڑے گوروں کی طرح گھر میں گھس کر پیتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔بھلا یہ بھی کوئی پینا ہے۔۔؟"

***

شکوہ

افسانہ

امجد مرزا امجد

آج پھر اس کی طبیعت میں وہی بھاری پن محسوس ہونے لگا۔سانس کی گاڑی نے یکدم رفتار تیز کر دی' ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سر دریا بن کر اس کی شخصیت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا' یہ طوفان اچانک رونما ہوتا ہے ایسے وقت میں جب وہ تمام کھڑکیاں بند کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔دو سال بعد جو شخص ساٹھ سال کا کہلائے گا۔ ایک بھرپور زندگی گذار کر جوان بچوں کے سامنے ستانے والے شخص کے دل کے گودام کے کسی کونے میں وقت کی گرد سے اٹی خواہش یکدم انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے اور وہ اس کی تکمیل کی خواہش میں مچل اُٹھے گا۔بس یہی کیفیت کا عالم طاری ہو گیا اس پر وہ صوفہ پر نیم دراز تھا یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گذری ہوئی زندگی کا سوچ کر ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔جوانی میں جذبات کی ایک بھیڑ تھی ایک میلہ تھا' پٹاخے چھوڑے' پھلجھڑیاں چلائیں' رنگ بکھیرے' خوشیاں بانٹیں' وہ نہایت جذباتی تھا' مگر جذبات اور شدت خلوص کا مظہر تھا' پیار بھرا رخ مثبت تھا' سوچ منفی نہ تھی۔ہمدردی سے بھرپور نفرت اور حقارت سے پاک تھی' دوستوں کا میلہ تھا جو سب پیار کرنے والے تھے' اسکی تمام محبتیں بھی انہی میں بٹ جاتیں' مزاج میں بے پناہ رنگینی تھی۔ خوش خوراک تھا' خوش گفتار کے ساتھ ساتھ خوش لباس مشہور تھا۔۔۔رنگوں سے پیار تھا' خوبصورت خوش شکل لوگوں سے محبت کرنے والا تھا' خوش لباس اور نت نئے ڈیزائینوں میں لباس پہننے والوں کا عاشق تھا۔میک اپ بڑی کمزوری تھی' اچھے میک اپ میں کوئی عورت کو دیکھ لیتا تو آنکھ جھپکنا بھول جاتا ۔اور کئی کئی دن اس تصور سے جی بہلاتا۔گھریلو ذمہ داریوں کی اونچی دیواریں پھلانگنے کی ہمت نہ تھی ورنہ اپنی کئی چھپی حسرتوں کو پورا کر سکتا تھا' مگر ماں باپ اور چھ بہن بھائیوں کا بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو عبادت کا درجہ دے بیٹھا اور اسی عبادت نے کنوارے پن میں گذرے ہوئے بارہ سال پاکیزگی کے چشمے میں دھو ڈالے۔۔۔مگر خیالات وجذبات کا سرکش ہاتھی کئی بار اسے روند ڈالتا' اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اسے کئی بار ایسے دروازوں کے آگے لا پھینکتا' جہاں ذرا سی کمزوری کی دستک سے

تسکین کے پٹ وا ہو جاتے‘ اور اس کے جلتے بھڑکتے ہوئے جذبات کی آگ ٹھنڈی ہو پاتی‘ مگر۔۔۔ارادے کی مضبوطی‘ کردار کی پختگی‘ احساس اور عبادت کی پابندی اسے قلعہ بند کر لیتی۔اس کی طبیعت کی رنگینی‘ گفتار تک محدود رہی‘ حسین چہروں اور خوبصورت لباس اور بناؤ سنگھار ماڈرن میک اپ کو چھونے اور پانے کا خواب سوچ کی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور بارہ سال بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران لوٹا، جہاں اس کی ماں نے خاندان کی سب سے خوبصورت دوشیزہ اس کیلئے چن رکھی تھی‘ حسن و مسرت کا یہ نمونہ جو دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ تھا چند ماہ بعد بیوی کے روپ میں اس کے پہلو میں تھا۔بارہ سال یورپ میں گذار کر گیا ہوا شخص جو خوبصورت چہرے قیمتی لباس‘ بناؤ سنگھار اور میک اپ کا حسین تصور لئے رات دن تڑپتا رہا اسکی مراد ہر خواہش پوری ہوگئی۔آنے والی میں کچھ گن موجود تھے‘ مگر پہلی رات کی بنی سنوری دلہن شادی کا نمونہ ہوتی ہے کہ دلہن ایسی ہوتی ہے مگر پھر نہ وہ رات دوبارہ آتی ہے‘ نہ ہی اس جیسی دلہن‘ دوسرے روز اس خوبصورت شیل سے ایک بیوی نمودار ہوتی ہے‘ روز نت نئی فرمائشوں والی‘ بات بات پر روٹھنے والی اور پھر جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں وہ تتلی سے سُنڈی بننے لگتی ہے۔فطرت الٹے پاؤں چلنے لگتی ہے۔روز نئی شکایت‘ نیا گن گنا‘ نیا فساد‘ نیا ہنگامہ۔نہ خوبصورت بھڑکیلے لباس رہتے ہیں‘ زیورات ڈبوں میں بند‘ کپڑے فینائل کی گولیوں کے ساتھ صندوق میں دفن۔نہ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی چمک‘ نہ گالوں پر غازے کا گلابی پن‘ نہ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں! تیل میں چپڑے ہوئے بال‘ کسی ہوئی چوٹی‘ ساتھ کالا پراندہ‘ یہی دلہن پھر تھکی ہوئی‘ نڈھال بیمار بیوی‘ شکن آلود کپڑے‘ پاؤں میں سلیپر‘ پسینے کی بو ساتھ ہلدی مصالحے کی سرانڈ اور سال گذرنے کے ساتھ ساتھ روتے منہ بسورتے بچوں کی قطار۔

”سارا دن اسی طرح صوفے پر پڑے رہیں گے یا پھر بازار جا کر کچھ سامان بھی خرید کر لائیں گے۔پانچ بجے تک وہ لوگ بھی آجائیں گے اور میں نے تین چار کھانے بھی تیار کرنے ہونگے۔اور پھر واپس آکر نہا دھو کر کپڑے وغیرہ بدل لیں“۔

بیوی نے اسے دیکھ کر ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتی وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔شاپنگ کے دوران بھی جذباتی کیفیت کم نہ ہوئی بازار میں آتی جاتی عورتیں خوشنما لباس زیب تن کیے‘ خوبصورت میک اپ میں اپنے آپ کو بنا سنوار کر اس کے دماغ میں لگی آگ پر مزید تیل کی پھوار ڈال رہی تھیں۔اونہہ اس نے سوچ کر برا سا منہ بنایا۔

”یہ سمجھتی ہے گھر کی صفائی‘ کپڑے دھونے‘ چولہے کے آگے دن بھر ناچنا اور بچوں کے پیچھے پڑے رہنا‘ یہی زندگی کا مقصد رہ گیا ہے۔ذرا دیکھو مسز شیخ اور مسز قادری کو ان کے بھی تین تین بچے ہیں‘ گھر کا کام بھی کرتی ہیں مگر جب دیکھو پتہ چلتا ہے کسی شادی پر جا رہی ہیں۔خوبصورت لباس میں دلکش میک اپ میں تر و تازہ‘ وہ نمبر دو والی ہندو عورت کا کیا نام ہے۔ہاں۔رکمنی کیا گریس فل عورت ہے‘ لگتی ہے کہ وہ پانچ بچوں کی ماں ہے؟ لباس کے میچنگ‘ ایسی لپ اسٹک استعمال کرتی ہے کہ قدم رک جاتے ہیں‘ جی بھر کر دیکھنے کو جی کرتا ہے‘ آنکھوں کا شیڈ‘ بالوں کی بناوٹ‘ لباس کی تراش خراش‘ کیا لکّی خاوند ہے اسکا۔۔۔تھکا لوٹا گھر آتا ہوگا تو بنی سنوری خوبصورت بیوی کو دیکھ کر ساری تھکاوٹ اس کی خوبصورت مسکراہٹ سے جھڑ جاتی ہوگی اور ادھر یہ محترمہ۔۔۔“

اس کے ذہن میں اپنی بیوی کا چہرہ ابھرا۔اپنا نیچے کا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سوچا۔

”کپڑوں سے بُھنے مصالحے کی خوشبو‘ تھکا ہوا چہرہ‘ جو صرف وضو کرتے وقت ہی دھلتا ہے۔کوئی مہمان آنا ہو یا کسی کے گھر جانا ہوتا ڈھنگ کے کپڑے اور ہلکا سا میک اپ کر لیا‘ وہ بھی سُرما کی ایک ایک سلائی آنکھوں میں پھیر لی‘ ورنہ گھر میں سارا دن۔۔۔“ وہ بیگ ہاتھوں میں اٹھائے کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے نتھنوں میں لہسن کی تیز بُو نے جلن پیدا کر دی۔چولہے پر دو دیگچے رکھے ہوئے‘ بیوی مصالحہ بھون رہی تھی‘ اس نے ہانپتے ہوئے بھاری بیگ ایک کونے میں رکھے اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے تھکے ہوئے بازو کو ہاتھ سے دبانے لگا۔جسم پر بڑھاپے کی کائی جمنے لگی تھی۔تھوڑی سی مشقت پٹھوں کو شل کر دیتی ہے اور تھکاوٹ پھیلنے لگتی ہے۔

”اب میری بات غور سے سنیں“ بیوی کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔”میرا ابھی ڈھیر سا کام ہے جسے میں نے نپٹانا ہے‘ آپ نے جا کر ٹی وی روم میں صوفے پر لیٹ نہیں جانا‘ بلکہ باتھ میں دو دن کی بڑھی ہوئی شیو کریں،

میں نیلے رنگ کا سوٹ استری کر کے بیڈروم میں رکھ آئی ہوں اسے پہن لیں‘ سچی جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی ہے‘ آپ اپنے لیے لاپرواہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کئی کئی دن نہ شیو کرتے ہیں‘ نہ لباس بدلتے ہیں‘ اچھے بھلے اسمارٹ اور خوش لباس شخص تھے‘ نہ جانے کیوں اتنے بدل گئے ہیں۔ اپنے لیے نہ سہی کسی دوسرے کے لیے سہی! بچے بھی دبی زبان میں یہی شکایت کرتے ہیں ہم عورتوں پر تو گھر کے ڈھیروں کام سوار ہوتے ہیں مگر آپ پر تو اتنی ذمہ داری نہیں ہے۔ پھر یہ مردہ دلی کیا معنی آپ جائیں تب تک میں کچن کے کام سے فارغ ہو جاؤں گی۔‘‘

وہ بیوی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا‘ اس کے معصوم شکوے کی بارش نے برسوں کی جمی ہوئی کائی کو لمحوں میں دھو ڈالا۔ وہ ہلکے سے مسکرایا۔’’اور تم بھی‘‘۔

’’ہاں ہاں میں بھی کام سے فارغ ہو کر تیار ہو جاتی ہوں‘‘ آپ تو جائیں نا! دروازے سے پلٹ کر اس نے بیوی کو پھر دیکھا۔ آج وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

ممتاز گورمانی

میلے میں گر نظر نہ آتا رُوپ کسی متوالی کا
پھیکا پھیکا رہ جاتا تہوار بھی اس دیوالی کا
مایوں بیٹھے روپ سروپ کے روگ سے واقف لگتی ہے
آنچل بھیگا جاتا ہے اس دلہن کی شاہبالی کا
برتن برتن چیخ رہی تھی کون سمجھتا اس کی بات
دل کا برتن خالی تھا اس برتن بیچنے والی کا
گال کی جانب جھکتی ہے، شرماتی ہے، ہٹ جاتی ہے
آج ارادہ ٹھیک نہیں ہے جان تمہاری بالی کا
شہزادے! تلوار تھمادے اب دربان کے ہاتھوں میں
کہہ دے، خالی ہاتھ نہ جائے اب کے بار سوالی کا
پھر ممتاز کسی کی یادیں کونجیں بن کر لوٹیں گی
موسم آنے والا ہے پھر زخموں کی ہر یالی کا

ایسے کو تیسا

(ایک سچی کہانی افسانے کے روپ میں)

امجد مرزا امجدؔ

آسیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ برداشت نہ کر سکی اور کمرے سے نکل کر کاریڈور کی دیوار پر لٹکا ہوا کوٹ اُتار کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اللہ کرے مجھے موت آجائے تا کہ یہ روز روز کا فساد ختم ہو۔۔۔ وہ بڑ بڑاتی آنکھیں پونچھتی ہوئی تیز قدم اُٹھاتی چلتی جا رہی تھی۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے‘ بس وہ چلے جا رہی تھی۔ کچھ دیر کیلئے گھر کے پریشان ماحول اور ماں باپ کی لڑائی سے دور کچھ لمحات سکون کے اسے میسر آجائیں‘ بس اسے اور کچھ نہیں چاہئیے‘ چند پُرسکون لمحات۔ ایک مہینہ سے اس کے گھر پر ہر وقت جھگڑا فساد تھا جس کی وجہ وہ اپنے آپ کو گردانتی تھی۔ آسیہ کی پھوپھی نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے اس کا رشتہ مانگا تھا۔ ماں کی خواہش تھی کہ وہ آسیہ کا رشتہ اپنے بھانجے سے کر یگی‘ جو چند ماہ ہوئے بطور وزیٹر انگلینڈ آیا ہوا تھا تا کہ وہ قانونی طور پر یہاں رہ سکے۔ مگر باپ کا خیال تھا کہ وہ لڑکا تو آچکا ہے اسے کسی نہ کسی طریقہ سے سیٹل کر دیں گے مگر ندیم وہاں بے روزگار ہے‘ بی۔ اے کیا ہوا ہے‘ اچھی شکل والا ہے اور میری اکلوتی بہن کا اکلوتا یتیم بیٹا ہے‘ لہٰذا آسیہ کا رشتہ اس کے ساتھ ہونا چاہئیے۔ آسیہ سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس کی کیا رائے ہے‘ اسے کون پسند ہے۔ یہ ہمارا مشرقی کا ماحول تھا جو باپ پر مسلط تھا۔ انہوں نے پہلے چند ماہ لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے کو قائل کرنا ہے۔۔۔ چاہے اس دوران گھر کا برسوں کا سکون تباہ و برباد ہو جائے۔ آسیہ کے باپ نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ زبانی بیوی کو نہیں قائل کر سکتا تو ہاتھوں سے سمجھانے پر اُتر آیا‘ مشرقی عورت انگلینڈ جیسے ملک میں بھی رہ کر جسم پر نیل ڈلوا کر کونے میں بیٹھ کر روتی رہی مگر مخالفت سے باز نہ آئی۔ اور پھر خاوند نے آخری حربہ استعمال کیا۔ اس نے آسیہ کو آخری وارننگ دی ’’تمہاری ماں اگر اپنی ضد سے باز نہ آئی اور تم لوگوں نے اس رشتے کی مخالفت کی تو میں اسے۔۔۔ طلاق دے دوں گا‘‘۔ آسیہ نے ماں کے پاؤں پکڑ لیے اور روتی ہوئی بولی ’’امّی خدا کیلئے آپ مان جائیں‘ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے لیے تم چاہے پاکستان سے منگواؤ یا یہاں ہوا خاوند لاؤ‘ اس سے کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ میری مرضی تو

کسی نے پوچھنی نہیں' میں نے اگر کوئی اعتراض کیا تو مجھ پر طرح طرح الزامات کی بارش ہونے لگے گی ۔کس قدر خودغرض اورضدی والدین ہو تم لوگ جو اپنی انا کیلئے اولاد کو قربان کرنے سے بھی نہیں چوکتے ۔ میں ہر گز نہیں چاہتی کہ میرا گھر آباد کرنے کیلئے تم برسوں کا آباد گھر برباد کردو'لہذا یہ بات یہیں ختم کردو'ورنہ میں کسی دن یہ گھر چھوڑ دوں گی !'' بیٹی کی بات سن کر ماں کو کچھ ہوش آیا ۔ وہ جانتی تھی کہ جوان بالغ بیٹی نے تنگ آ کر کچھ غلط قدم اٹھالیا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے' یہاں بھی اپنی عزت کا خطرہ ہے ۔۔۔ ماں مان گئی ۔ باپ کا سینہ پھول گیا' مونچھ اونچی ہوگئی' گھر میں خاموشی چھا گئی' پاکستان لکھ دیا گیا ۔ دونوں اطراف سے زوروشور سے تیاریاں ہونے لگیں ۔ طے یہ پایا کہ شادی پاکستان جا کر کی جائے'لہذا آسیہ اپنے والدین اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ پاکستان روانہ ہوگئی ۔ بہت دھوم دھڑ کے کے ساتھ شادی ہوئی ۔ بیوہ بہن اور بیروزگار داماد ہونے کی وجہ سے آسیہ کے باپ نے دونوں اطراف کے اخراجات خود ادا کیے ۔ چار ہفتوں بعد آسیہ کا خاندان واپس آ گیا ۔ ندیم کیلئے تمام کاغذات بھیجے گئے اور دو سال بعد وہ لندن آن پہنچا اور کام پر بھی لگ گیا ۔ سب ایک ہی مکان میں رہتے تھے ۔ ایک سال بہت خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں گزر گیا' ندیم کے پاسپورٹ پر مستقل قیام کی مہر لگی ۔ انبالہ کی میٹھائی کے ڈبے لائے گئے ۔

آسیہ نے سب گھر والوں کو ہوٹل میں کھانا کھلایا ۔ تیسرے دن ندیم رات گئے تک گھر نہ لوٹا' سب پریشان ہوگئے ۔ آسیہ نے اسکے کام پر فون کیا ' دوستوں سے رابطہ کیا کوئی پتہ نہ چلا ۔ رات گئے پریشان اوپر اپنے کمرے میں گئی تو پتہ چلا ندیم کے جوتے کپڑے بھی دراز میں نہیں ہیں اور اسکا ہینڈ بیگ بھی موجود نہیں ۔ دراز میں جہاں دوسرے اہم کاغذات کے ساتھ اسکا پاسپورٹ تھا وہ بھی غائب ہے اور پھر ہفتہ بعد اسکی ماں کا خط آ گیا کہ تم لوگوں نے میرے بیٹے کو بہت تنگ رکھا ۔ لڑکی کام پر چلی جاتی ہے' اسے صحیح وقت پر نہ کھانا ملتا اور نہ اسکی دوسری اہم ضروریات پوری ہوتیں ۔ تم لوگوں نے اپنی بیٹی کو کسی کی خدمت کرنا سکھایا ہی نہیں'لہذ اوہ کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے ۔ دو ماہ کے انتظار کے بعد آسیہ کو جب یقین ہو گیا کہ ندیم واپس نہیں آئیگا اور اس نے لندن آنے اور پیسہ کمانے کے لالچ میں شادی کی ۔ جوں ہی مستقل قیام کی مہر لگی' نہ رشتوں کا لحاظ کیا اور نہ کسی کی پریشانی کی پرواہ کی اور خاموشی سے غائب ہو گیا تو اس نے کام چھوڑا' ٹکٹ لیا اور سیدھی پاکستان جا پہنچی ۔ پھوپھی آسیہ کو دیکھ کر ششدر رہ گئی ۔ آسیہ نے بڑے پیار اور ادب سے کہا'' پھوپھو جی ! ندیم تو بے وفا نکلا مگر میں اس گھر کی بہو ہوں اور قانونی شرعی طور پر یہ میرا گھر ہے' لہٰذا اب میں یہیں رہوں گی ۔۔۔ اور مستقبل میں میری ذمہ داری آپ کی ہے''۔ اور پھر آٹھ ماہ ہی گذرے تھے کہ ندیم آ کر اپنے ماموں ممانی کے قدموں پر آن گرا اور معافی مانگنے لگا کہ خدا کے واسطے آسیہ کو واپس بلوالیں ۔ اس نے میری ماں کو سخت پریشان کر رکھا ہے ۔ جتنی رقم میں بھیجتا ہوں وہ امی سے چھین لیتی ہے' سارا گھر کا کام امی سے لیتی ہے' نہ انہیں کہیں جانے دیتی ہے اور نہ کسی سے ملنے دیتی ہے ۔ میری ماں کے خط پہ خط آ رہے ہیں کہ واپس آ کر اسے خود سنبھالو' ورنہ میں زندہ نہیں رہونگی ۔ چوہے جیسی چھوٹی سی کمزور لڑکی نے اپنے فراست سے ندیم اور اسکی ماں کو ناکوں چنے چبوا دیئے' آسیہ واپس آ چکی ہے اور ایک بچے کی ماں ہے اور ندیم سے اسے اب کوئی شکایت نہیں ۔

بسم اللہ کلیم

اردو کی تعریف

اردو دی تعریف کراں پنجابی وچ تے فیر کی اے
جے کُجھ پتیاں پُھل گلابی وچ تے فیر کی اے
اکو ماں دیاں دھیاں اک وڈی اک نکی اے
اک غریب تے دوجھی پلی نوابی وچ تے فیر کی اے
روٹی لے کے ڈیرے تے ٹیار نوں آنا چاہیدا
آوے بھاویں گُھسے یا گُرگا بی وچ تے فیر کی اے
چن تے سورج اُنجھ تے وَکھو وَکھ نے وچ اَسماناں دے
سورج دی لو اے نور مہتابی وِچ تے فیر کی اے
کھولے بند کرے پھس جاوے تے چابی بھن دیندے او
پھَس جاوے بھئی تالا کدی جے چابی وچ جے فیر کی اے
زاہد عابد مُلاں قاضی سخت کرخت دِلاں دے نے
ہووے رحم دلی جے کسے شرابی وچ تے فیر کی اے
غصہ نہیں کرنا میرے اگلے مصرے تے جے ہووے
نبیاں والی کوئی صفت صحابی وچ تے فیر کی اے

آسٹریلیا میں اردو کا علمبردار شاعر و معالج، ڈاکٹر طارق احمد مرزا

ڈاکٹر محمد زاہد۔کلکتہ، انڈیا

شاعری انسانی جذبات کے اظہار کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔آدمی کے اندرخوشی اورغم،حسرت وآرزو،رنج ویاس،امید اور ناامیدی،خوف اور بغاوت وغیرہ کی لہریں الفاظ کا جامہ پہن کر باہر نکلتی ہیں تو بہت سارے لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔کیونکہ شاعر اکیلا نہیں ہوتا،وہ معاشرے کا ایک اہم جز ہے۔وہ اپنے اندر برپا ہونے والے جذبات کو بیان تو کرتا ہی ہے،ساتھ ہی ساتھ باہر کی دنیا کی ناہمواریوں اوردشواریوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔کبھی وہ شاعرِ شباب بن کر حسن وعشق کے گانے گاتا ہے تو کبھی شاعرِ انقلاب بن کر ظالم وجابر طاقتوں اور حکومتوں کو بدلنے کی بات کرتا ہے۔وہ کبھی انسانیت کے زخم پر مرہم لگاتا ہے تو کبھی معالج بن کر نشتر زنی بھی کرتا ہے۔

اردو زبان کی خوشبو برصغیر سے نکل کر دنیا کے بہت سارے ملکوں میں پھیلی ہے۔شاید ہی کوئی براعظم ایسا ہو جہاں اردو کے متوالے شاعرو ادیب اپنی تخلیقات سے سونے چمن کو گلزار نہ کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر طارق احمد مرزا اردو کے ایسے ہی جیالے شاعر ہیں جو آسٹریلیا کی فضا کو اپنی شاعری سے معطر کر رہے ہیں۔اور ساتھ ہی بطور معالج درد کے مارے لوگوں کا علاج بھی کر رہے ہیں۔ان کی تخلیقات سے ان کے اندر کے جوشیلے فنکار کی صدا کی بازگشت دور تک پھیلتی دکھائی پڑتی ہے۔

وہ اس مشینی دور کے ایسے قلم کار ہیں جو انسان کو فطرت سے قریب ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ مادی آسائشوں میں گھر کر خود کو بھول جانے کی بجائے اپنی تلاش کرنے اور اپنے منصب کو پہچاننے کا درس دیتے ہیں۔وہ مذہب بیزار نہیں بلکہ ایک خدائے واحد کی بندگی اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی باتوں پر عمل کرنے والے شخص ہیں۔ڈاکٹر طارق احمد مرزا کی نعتوں کے چند اشعار اس کا ثبوت ہیں:۔

میرے ادراک کی ہر ڈوربندھی آپ سے ہے
جسم و جاں آپ کے ہیں،دل کی لگی آپ سے ہے

☆☆☆

تجھ سے وابستہ ہوئے، خیرِ امم کہلائے
اپنی جو اوج بنی خیرِ رسل،آپ سے ہے

وہ تشریف لائے عجب ہی سماں تھا
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
حریمِ تقدس میں جوہرِ عالم
حضورِ خدا آج رطب اللساں تھا
وہ احسنِ تقویم معراجِ آدم
وہ باعثِ تخلیقِ کون و مکاں تھا

اورحمد کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

آئینہ خانۂ ہست وعدم میں طارقؔ
عکس در عکس فقط یار نظر آتا ہے

اردو شعرا کی محبوب صنف غزل ہے۔یہاں دو مصرعوں میں کیفیات کی دنیا سمودی جاتی ہے۔مگر یہ راہ آسان نہیں۔اچھے اچھے یہاں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں جسے اردو شعراء نے غزلوں میں نہ برتا ہو۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، فراقؔ، مجروحؔ، احمدفرازؔ، منیرؔنیازی، ساحرؔلدھیانوی،شہر یارؔ،مظفرؔحنفی وغیرہ نے غزلوں کے اشعار میں ہر رنگ کو سمیٹ دیا ہے۔طارقؔ صاحب اس صنف میں اپنی انفرادیت اور خلاقیت کی مثال یوں پیش کرتے ہیں:۔

ان گنت فسانوں کا اک یہی فسانہ تھا
ہر کمال پہ آخر اک زوال آنا تھا
دور ہی کچھ ایسا تھا،میں کسی سے کیا کہتا
ذہن کی چتا میں ہی سوچ کو جلانا تھا
زہر نے بڑی جلدی جسم میں سرایت کی
ورنہ میں نے تھوڑا سچ اور بول جانا تھا
شاعری سے گو طارقؔ نسبتیں نہ تھیں لیکن
مستعار لمحوں کا قرض بھی چکانا تھا

☆☆☆

ماورائے حیاتِ کون ومکاں،روح کا یہ سفر تو جاری ہے
جسمِ خاکی نہیں ہے گھر ایسا،زندگی جس بنا بسر ہی نہ ہو

اتنا بے دست و پا نہیں طارقؔ، کوچۂ یار تک بھی پہنچوں گا
یہ تو ممکن نہیں کہ جیتے جی، اس طرف کو مرا گزر ہی نہ ہو

☆☆☆

کیا خبر کب ہو نیا کوچ، نیا ہجر و فراق
زندگی باندھ رکھو بے سروسامانی کو
آدمی لوح جہاں پہ تو نہیں حرفِ غلط
کیوں مٹاتا ہے فلک نقشِ انسانی کو

☆☆☆

عشق نے داستان جو بھی لکھی
اس میں مذکور ہو گئے ہم بھی
من وتو میں رہا نہ فرق کوئی
مثلِ منصورؔ ہوگئے ہم بھی

☆☆☆

قاتل و وحشی وخونخوار زمانے کو قلم
قاتل ووحشی وخونخوار نظر آتا ہے !

☆☆☆

گو دوست منتظر تھے مری موت کے مگر
میں اپنے دشمنوں کی محبت کی زد میں تھا

☆☆☆

پایۂ تکمیل کو پہنچا نہ میں پہنچا نہ تو
چھوڑ کر دونوں چلے ہیں خود کو آدھا، مختصر

غزلوں کی طرح شاعرِ موصوف کی نظموں میں بھی مشاہدہ کی وسعت اورموضوعات میں معنویت نظرآتی ہے۔ان کی ایک نظم کی یہ سطریں دیکھیں:

ایٹمی دور میں، دورِ پُرشور میں
سانس لینے کی فرصت کہاں، وقت کے جال میں
اس برے حال میں سانس لینے کی فرصت کہاں
جسم کی جیل میں، روح کے کھیل میں
سانس لینے کی فرصت کہاں۔۔۔۔

ان کی دوسری نظمیں مارگزیدہ، شہدائے گجرانوالہ، فرق، مجھ کواے ماں تُو یاد آئی، وغیرہ میں جذبات کی لہریں موجزن دکھائی پڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کواوران کے قلم کوسلامت رکھے۔آمین۔ ***

سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی ایک نظم

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نظم

نشانِ حقیقت کی آرزو کے جواب میں

مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
جو خلوص دل کی رمق بھی ہے ترے ادعائے نیاز میں
ترے دل میں مرا ظہور ہے ترا سر ہی خود سر طور ہے
تری آنکھ میں مرا نور ہے مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو نہیں ہے تو یہ تری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں
مجھے دیکھ رفعتِ کوہ میں مجھے دیکھ پستیِ کاہ میں
مجھے دیکھ عجزِ فقیر میں مجھے دیکھ شوکتِ شاہ میں
نہ دکھائی دوں تو یہ فکر کر کہیں فرق ہو نہ نگاہ میں
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں
مجھے ڈھونڈ دل کی تڑپ میں تو مجھے دیکھ روئے نگار میں
کبھی بلبلوں کی صدا میں سن کبھی دیکھ گل کے نکھار میں
مری ایک شان خزاں میں ہے مری ایک شان بہار میں
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں
میرا نور شکلِ ہلال میں مرا حسن بدرِ کمال میں
کبھی دیکھ طرزِ جمال میں کبھی دیکھ شانِ جلال میں
رگِ جاں سے ہوں میں قریب تر ترا دل ہے کس کے خیال میں
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں

***

ہمہ جہت کئی صفتوں کے قلمکار
رانا عبدالرزاق خاں صاحب

امجد
مرزا
امجد

آپ کا پورا نام رانا عبدالرزاق خاں ہے جبکہ تخلص عاصی صحرائی لکھتے ہیں۔مگر انہوں نے بے شمار مضامین و کالموں میں اپنے مختلف قلمی نام لکھے جو اے آر راجپوت، رجل خوشاب،ابن لطیف۔ اے آر خاں وغیرہ ہیں۔قوم راجپوت گھوڑے واہ (والدین کا اصل وطن کاٹھگڑھ ہوشیارپور پنجاب انڈیا) ہے۔تاریخ پیدائش:13/اپریل 1951ء لکی نو، شورکوٹ جھنگ ۔ پرائمری تک تعلیم چک نمبر2 ٹی ڈی اے قائدآباد خوشاب ٹی آئی ہائی سکول ربوہ سے میٹرک،ٹی آئی کالج ربوہ سے 1970ء میں ایف اے کیا۔ بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور (1975ء) سے کیا، اُردو فارسی سپیشل مضامین تھے۔پھر جب ملازمت کا دور شروع ہوا تو سپر وائزر پیپر بورڈ ملز پیکیجز لمیٹڈ لاہور میں رہے پھر بحرین میں بطور ایگریکلچر اسسٹنٹ کام کیا۔ پاکستان جا کر اپنے گاؤں مارچ 1984ء تا جولائی 2008ء تک بطور نمبر دار چک نمبر2 ٹی ڈی اے خوشاب میں خدمات دیں۔ پھر جب باہر آنے کا شوق اُبھرا تو 29/اکتوبر 2005ء کو لندن تشریف لے آئے اور ٹوٹنگ وانڈز ورتھ مقیم ہوئے جہاں تا حال موجود ہیں۔

پاکستان میں 1991ء سے روزناموں میں مختلف شخصیات کے تعارف لکھتے رہے۔لندن میں آ کر 2009ء میں فراغت ملنے پر ”بزم شعروسخن“ تشکیل دی جس کا پہلا مشاعرہ 2009ء میں منعقد کیا۔جس میں،امجد مرزا امجد،شکیل مرزا،سلطان صابری، ابراہیم رضوی،عذرا ناز، ڈاکٹر صوفیہ سطوت، حمیدہ معین رضوی، کوثر علی،فرحانہ غزالی،اقبال مجیدی ، ساجد رانا ، نورالجبیل نجمی، طیب جاذل،محمود علی محمود،طفیل عامر،قدیر کوکب،ریاست رضوی،مبارک صدیقی،سید نصیر احمد شاہ،عامر امیر، عبدالمجید ظفر، نور الجبیل نجمی،جواد عالم،سہیل لون، آدم چغتائی، شگفتہ شفیق،سلیم فگار،ارشد لطیف،اقبال مرزا، ہارون الرشیداور دیگر بہت سے شعراءشامل ہوئے۔اب تک ان گنت کامیاب مشاعرے کروا چکے ہیں اور یہ سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری وساری ہے ۔جس میں لندن کے نامور شعراء نے حصہ لیا۔

2011ء میں یو کے ٹائمز میں بھی کالم لکھنے شروع کئے اور گوشہ اُدب کی ادارت سنبھالی۔مگر غالباً کچھ مدت کے بعد ہی یہ فرض مجھے سونپ دیا گیا جس کو میں نے چار سال تک جاری رکھا مگر کچھ وجوہات سے میرے ختم کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ میں یہ کام اجرت کے ساتھ کرتا تھا اور آپ مفت کررہے ہیں جو ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔جنوری 2013ء سے ”قندیل اُدب انٹرنیشنل لندن“ آن لائن میگزین نکالنا شروع کی جو کہ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک بذریعہ ای میل اور ویب سائٹ پہنچتا ہے۔اس کے علاوہ پاکستان

،لندن ،امریکہ، آسٹریلیا، انڈیا کے مختلف جرائد میں چارصد سے زائد مختلف عنوانات پر سیاسی، علمی ، مذہبی، اور اُردو پر مضامین شائع ہوئے۔ پانچ کتب بھی زیرطبع ہیں جو کہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔جن کے عنوان ہیں:

* ۔ قندیلِ علم * ۔ قندیلِ حق

* ۔ سپوتِ ایشیا * ۔سوانح بہادر شیر کاٹھگڑی

* ۔دانشکدہ عظیم * ۔تاریخ احمدیت کاٹھگڑھ

* ۔ نافلہ مہدی

آپ نے زیادہ غزل ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔

پاکستان ،امریکہ، آسٹریلیا اور انڈیا کے مختلف اخبارات میں بھی ان کے آرٹیکل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے میرا تعارف ان کے بین الاقوامی مسائل پر نہایت پردلائل اور ملکی حالات حاضرہ پر بڑی گہرائی میں لکھے ہوئے کالم پڑھ کر ہوا پھر چند مشاعروں میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا میرے ماہانہ منعقد کردہ مشاعروں میں بھی وہ کئی بار مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے آپ نہایت پرخلوص اور سنجیدہ طبعیت کے انسان ہیں۔ میں آپ کے تحریر کردہ کالموں سے متاثر تو تھا ہی مگر جب انہوں نے کچھ مدت پہلے اپنی ایک ضخیم کتاب کا مسودہ مجھے بھیجا تا کہ میں اسے کتابی شکل میں دے کر شائع کرواؤں تو پڑھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے کس قدر محنت، عمیق مشاہدے، مطالعے سے اور کتنی تفصیل دیکر اسے حوالہ تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے مذہبی ،سیاسی ،معاشرتی اور ادبی تاریخ کا نہایت گہرائی کے ساتھ احاطہ کیا ہے جو قارئین کے لئے بیش بہا معلومات مہیا کرتا ہے۔ میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بھی اپنے اس تاریخی پروجیکٹ میں شامل کیا اور اس طرح مجھے اس تاریخی خزانے سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں اس کتاب کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ وہ ابھی تک کیوں شائع نہ ہوسکی جبکہ ان کے مزید کئی مسودے لائن میں لگے ہوئے ہیں ہر کسی کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنے اہم موضوعات کو یکجا کر کے اس قسم کی کتاب شاید برطانیہ میں ابھی تک نہیں لکھی گئی جس میں ادبی مذہبی و سیاسی اکابرین کے بارے میں معلومات کا ایک وسیع و عریض اور عمیق سمندر موجزن ہے۔ جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اور میری مودبانہ گذارش ہوگی کہ وہ اسے منصۂ شہود پر ضرور لاکر دُنیائے ادب میں ایک بہترین اضافے کا موجب بنیں۔ رانا صاحب ایک مدت سے ادب کی خدمت میں کوشاں ہیں اپنے منعقد کردہ شاندار مشاعروں سے لے کر ویب سائیڈ پر ''قندیل ادب'' جیسا شاہکار ادبی مجلہ ہر ماہ اپنے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتے ہیں جو دنیا کے بیشمار ممالک میں بڑے شوق وذوق سے پڑھا جاتا ہے ۔مقامی اخبارات میں مسلسل کالم لکھتے ہیں۔ لندن اور گردونواح کی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے قلم کو اس قدر مصروف رکھا ہوا ہے کہ ان کے مزید چار پانچ مسودے اشاعت کے لئے تیار ہیں جو امید ہے منصۂ شہود پر آکر دنیائے ادب و تاریخ میں گراں قدر اضافہ کریں گے اور پذیرائی حاصل کریں گے ۔آپ نہایت زود نویس قلمکار ہیں اور رات دن اسی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ جو برطانیہ کی ادبی فضا کے لئے ایک خوشگوار جھونکے سے کم نہیں جس سے قارئین کو فرحت ملے۔

آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو روشن ستارے کی مانند طلوع ہوکر دیکھتے ہی دیکھتے ادبی و صحافتی اُفق پر چھا جاتے ہیں۔ اور اپنا مقام ہمیشہ قابل رشک رکھتے ہوئے ایک شجرِ سایہ دار کی طرح بے شمار لوگوں کو فیض یاب کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر کیفیت میں شدت اور جذبے کی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔ جس کے پسِ منظر میں ان کی بلند قامتی بخوبی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں جذبہ حب الوطنی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ آپ وطن میں پھیلی ہوئی نفرتوں کی رِدا کو اُتار پھینکنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے طویل قد کاٹھ، پرُرعب اور پرکشش شخصیت کے حامل ہوتے ہوئے بھی نہایت منکسر اور عاجزانہ رویہ کے مالک ہیں۔ میں نے کبھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا چاہے ان کے ساتھ کیسی ہی ناانصافی ہوجائے جو کئی بار ہوتے بھی دیکھی ہے مگر یہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر اسے برداشت کر کے چہرے پر مسکراہٹ لاکر اُونہہ کر کے ٹال جاتے ہیں جو آج کے دور میں بہت بڑے ظرف کی علامت ہے ۔رانا صاحب ایک مخلص دوست، ہر کسی کے ساتھ تعاون کو تیار، ادب نواز دوست نواز انسان ہیں جو آج کے دور میں خال خال نظر آتے ہیں۔ دوسروں کو عزت دینا اور ان کا دن منانا دوسروں کو آگے لانا انہیں فوقیت دینا ان کے خمیر میں شامل ہے ۔جو ایک فرشتہ صفت انسان کی پہچان ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کے اس جذبہ صادق کو ہمیشہ قائم رکھے اور قبول فرما کر ان کی قلم میں برکت دے۔ آمین۔

پروفیسر عبدالقدیر کوکب

رانا عبدالرزاق خان صاحب
بہت سی صفات کے حامل، قلمکار، شاعر و ادیب

عاصی صحرائی کے لئے عبدالکریم قدسی کا نذرانہ

ریختہ کی ہیں ترقی سبب   رانا صاحب اور قندیلِ ادب
اسکو عزت دیجئے جس شخص کے   خدمتِ اُردو میں گزریں روز و شب
چار سالوں کی ہے محنت کا صلہ   یہ قلم کاروں کا مٹتا فاصلہ
کھا رہے ہیں حوصلہ شکنی کے تیر   رانا صاحب کا بڑا ہے حوصلہ
دُلہنِ سود و زیاں کو ایک بار   سر اُٹھا کر کبھی دیکھا نہیں
ڈھونڈتے ہیں نت نئے اہلِ قلم   اور حسابِ دوستاں رکھا نہیں

آج مجھے ایک ایسے ادیب و شاعر کے متعلق کچھ کہنا ہے جو 67۔1970 میں میرا کلاس فیلو تھا۔انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اور میں نے قائداعظم یونیورسٹی سے میتھ میں ایم ایس سی ۔ پھر ہم معاش روزگار کے چکر میں یوں سرگرداں رہے۔ یہ خلیج کی خاک چھانتے رہے۔اور خاکسار افریقہ کے صحراؤں میں ۔ یہ ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ جوانی میں کبڈی کے کھلاڑی تھے۔ گاؤں کے نمبردار بھی رہے اور اچھے خاصے دبنگ مقرر بھی ہیں ۔ یہ بارہ سال سے لندن میں مقیم ہیں ۔ کچھ سال پہلے لندن میں ایک دوسرے کی دریافت ہوئی۔ تو میں حیران ہوا یہ دیکھ کر کہ موصوف ادبی جہاد میں مگن ہیں ۔ چار سال سے ایڈیٹر قندیل ادب، یو کے ٹائمز کے کالم نگار، گوشہ ادب کے مدیر ہیں۔ کئی ادبی رسائل کے میگزین کے ادارتی بورڈ کے روحِ رواں ہیں۔ جہاں بھی مشاعرہ وغیرہ ہو تو اُس میں شامل ہونے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں ۔ ادب سے انہیں جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔

ادبی احباب سے مل کر قندیل شعر و سخن کے نام سے فورم بنایا ہوا ہے۔ ہر ماہ مشاعرے کرواتے ہیں اور اس کی نظامت بھی کرتے ہیں ۔ بڑے ہی منظم طریقے سے مہمان نوازی کرتے ہیں فوٹوگرافی، اور رپورٹنگ کا سلیقہ ان کو خوب آتا ہے اور ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے ہیں ۔ یو کے والے اکثر ادبی لوگ ان کو جانتے ہیں۔ نوجوان شعراء اور شاعرات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ سب کا کلام شائع کرنے کی لگن اُن کو رہتی ہے۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ سارا کام بے لوث کرتے ہیں ۔ سب شعراء اور شاعرات کے ساتھ ادبی شام مناتے ہیں۔ اور ان سب کو پروموٹ کرتے ہیں گوشہ ادب کے ذریعہ اور قندیل ادب کے توسط سے یہ برطانیہ اور یورپ و امریکہ و خلیج کے تقریباً ایک ہزار شعراء کا کلام اب تک شائع کر چکے ہیں۔ اور اب بھی کمربستہ ہیں ۔ ادب نواز اور بندہ پرور واقع ہوئے ہیں۔ صوفی منش، سنجیدہ طبیعت پائی ہے۔

پانچ صد سے زائد کالم لکھ چکے ہیں ۔ ان کے کالم زوردار، سچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ جن میں حقائق اور کڑوا سچ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے زورِ قلم کو ہر جگہ ہی سراہا جاتا ہے۔ مضمون نگاری میں بھی بہت کہنہ مشق ہیں۔ سوانح عمری لکھنے کے تو یہ ماہر ہیں۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے۔ محبِ وطن اور با کردار ہیں۔ خود کمپوزنگ کرتے ہیں اور ٹائپ سیٹنگ بھی۔ آج کے دور میں کمپیوٹر سے دوستی کر کے جدید دور کے صحافیوں کی صف میں زور شور سے شامل ہیں ۔ کئی کتب تیار کر رہے ہیں ۔ ماہ جنوری میں ایک کتاب آ رہی ہے۔ ویسے تو ان کی چار کتب کے مسودات تیار ہیں جو کہ جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی ۔ میں ان کی ان عظیم کاوشوں پر سلام کرتا ہوں۔ اور دعا گو ہوں کہ خدا تعالیٰ ان کو صحت والی طویل فعال زندگی سے نوازے۔ اور خوش رکھے۔ آمین۔

اُن کی خدمت میں چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ہر کسی کی اب زباں پر رانا جی کا نام ہے
سب قدم جب رُک رہے ہوں بڑھتا اُن کا گام ہے
شعر و شاعری میں بھی اُنکا منفرد مقام ہے
ساری تحریروں میں اول آتا ان کا نام ہے
نثر یا کالم نگاری پڑھنے میں آئے مزا
پڑھنے والوں کے دلوں کو رانا کرتا رام ہے
دعوتیں کھائی ہیں کتنی آپ سب نے اب تلک
آج جو کھانا ملے گا سب سے اعلیٰ طعام ہے
کھانا کھائیں اور دعا ان کے لئے کرتے رہیں
شعر سُن کر دادا دینا ہی ہمارا کام ہے

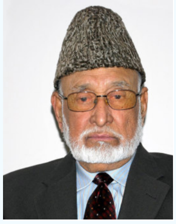

پرانا تبصرہ: (ادارہ)

محترم خان بشیر احمد رفیق خان صاحب مرحوم سابق امام مسجد لندن

غالباً دو تین سال کی بات ہے کہ ایک دن انٹرنیٹ پر میری ای میل کے ان بکس میں ایک ای میل رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی طرف سے موصول ہوا۔ میں نہ تو میں رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے شناسا تھا اور نہ ہی اس سے قبل ان کا نام سنا تھا۔ چنانچہ بڑے اشتیاق کے ساتھ جناب رانا صاحب کی ای میل کھولی۔ تو اس میں ایک نہایت خوبصورت، دیدہ زیب اور رنگین الیکٹرانک رسالہ برآمد ہوا۔ رسالے کا نام ''قندیلِ ادب'' تھا۔ اور سرورق پر اس کے بانی ایڈیٹر رانا عبدالرزاق خاں صاحب کا نام اور فون نمبر درج تھا۔ میں نے رسالے کو بڑے شوق سے لفظاً لفظاً پڑھا۔ اور اس کے معیاری مضامین، شعروشاعری، کے انتخاب اور رسالے کے گیٹ اَپ سے بے حد متاثر ہوا۔ لندن سے اور بھی بہت سے رسائل شائع ہوتے ہیں لیکن'' قندیلِ ادب'' نے ہر لحاظ سے ان سب کو مات دے دی ہے۔ اگلے ہی دن میں نے جناب رانا عبدالرزاق خاں صاحب کو فون کیا تا انہیں مبارکباد دے سکوں۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ آپ میرے نہایت ہی پیارے دوست اور بزرگ جناب ناصر احمد بہادر شیر سابق افسر حفاظت خاص کے بھتیجے اور داماد بھی ہیں۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں ان کے منعقد کردہ درجنوں مشاعروں میں شامل ہوا۔ اور اُن کی ادبی کاوشوں سے لطف اندوز اور محظوظ ہوتا رہا۔ اور اب بھی محظوظ ہوتا رہتا ہوں۔ ''قندیلِ ادب'' اب ماشاء اللہ دو لاکھ سے زیادہ قارئین کو دو صد ممالک میں ارسال کیا جاتا ہے۔ اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ایک متاثر کُن بات یہ ہے کہ رانا عبدالرزاق خاں صاحب رسالہ کی اشاعت ہر ماہ بروقت کرتے ہیں۔ انتخاب کرکے خود ٹائپنگ کرکے تزئین و آرائش کے لئے بروقت ڈیزائنگ کے لئے بھیج دیتے ہیں اور کبھی بھی رسالے میں تاخیر نہیں ہوئی۔ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو رسالہ انٹرنیٹ پر موجود ہوتا ہے۔ ''قندیلِ ادب'' کا ہر شمارہ علمی مضامین، خوبصورت شعروشاعری، معلوماتی مضامین، لطائف، افسانوں، کتب پر تبصروں، شعراء کے سوانحی خاکوں، اقوالِ زریں اور رنگین تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب یہ رسالہ اپنے خرچ پر شائع کرتے ہیں اور قارئین سے کسی قسم کی مالی معاونت کی نہ تو درخواست کرتے ہیں اور نہ ہی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بس قارئین سے یہی معاونت چاہتے ہیں کہ قارئین انہیں علمی مضامین، شعروشاعری اور معلوماتی شہ پارے بھجوائیں۔ محترم رانا عبدالرزاق خاں صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ ان کے کام کی وُسعت ایک ادارہ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ آپ صفاتِ حسنہ کا ایک خوبصورت گلدستہ ہیں۔ آپ کہنہ مشق ادیب ہیں۔ آپ کے مضامین انگلستان، اور دیگر ممالک کے جرائد و رسائل کی زینت بھی بنتے ہیں۔

آپ سینئر صحافی اور تجزیہ کار بھی ہیں۔ یو کے ٹائمز اُردو لندن میں گوشہ ادب کے مدیر بھی ہیں۔ اور ہر ہفتہ اپنا سیاسی کالم یو کے ٹائمز میں لکھتے ہیں۔ آپ ایک شاعر و ادیب ہیں۔ شاعری میں آپ کا تخلص ''عاصی صحرائی'' ہے۔ آپ کا کلام قندیل ادب کے علاوہ دیگر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ رانا صاحب مشاعرے بھی کرواتے رہتے ہیں۔ ان مشاعروں میں انگلستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی شعراء کرام شامل ہوتے رہے ہیں۔ ان شعراء میں آدم چغتائی، مبارک صدیقی، جمیل الرحمن، نکہت افتخار، سہیل لون، اقبال مجیدی، امجد مرزا امجدؔ، عبدالغفار عزم، ریاست رضوی، ارشد لطیف، عامر امیر، نورالجبیل نجمی، سوہن راہی، ایوب اولیاء اور اس کے علاوہ بہت سے شعراء شامل ہوتے رہتے ہیں۔ جناب رانا صاحب کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے مجھے تو حیرت اس بات کی ہے کہ وہ کئی مصروفیات ہونے کی بنا پر ویک اینڈ پر اس قدر وسیع ادبی کام کے لئے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب نے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے اپنے مضامین کو ایک کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے میں نے ان مضامین پر جستہ جستہ نظر ڈالی ہے اور رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی تبحرِ علمی سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ مضامین رزاق قارئین کرام کے علم میں اضافہ کے باعث ہونگے۔

انشاء اللہ اور اُردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہونگے۔

اُردو، ادبی مضامین ۔ زبانِ اُردو کا اِرتقاء کثیر اقوامِ ہند کی مشترکہ زبان

(ادارہ)

ایک جدید تحقیق کی رُو سے موجودہ اُردو زبان ہندوستان کی اس قدیم ہریانوی زبان کی اصلاح شدہ شکل ہے۔ جو سولھویں سترہویں صدی میں دہلی کے انواع و اطراف اور ماحول میں ہریانوی برج اور راجستانی کا امتزاج اور سنگم تھی، اور جس میں اہل دہلی کے محاوروں اور تاجدارانِ سُخن کے تصرفات نے اضافوں میں تغیرِ عظیم برپا کر ڈالا۔ اسی زبان کی بازگشت حیدرآباد دکن، گجرات کاٹھیاواڑ۔ لکھنؤ، کلکتہ اور پنجاب میں سنائی دینے لگی۔ (پنجاب میں اُردو تالیف علامہ حافظ محمود شیرانی محمود) دنیا کی اس عظیم الشان زبان کی تجدید اور روزمرّہ اضافوں اور ترقی وارتقاء کے ہر مرحلہ میں مسلمان بزرگوں اور ادیبوں کے دوش بدوش ہندو نیتاؤں، سکھ سورماؤں بلکہ فاضل عیسائیوں نے بھی پورے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اسے پالا، پوسا، سینے سے لگایا۔ دل میں سجایا اپنے خونِ جگر سے اس کے گلستاں کو سینچا اور طویل جدوجہد کے بعد اسے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کرنے میں قابلِ رشک حد تک کامیاب ہو گئے اور جہاں ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ (شکاگو) کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا سے پچاس سے نوے فیصد تک زبانیں ناپید ہو رہی ہیں وہاں ہمارے نزدیک اُردو کی عالمی مقبولیت میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہو رہا ہے۔

آسمانِ اُردو کے ممتاز ستارے، اُردو ادب کے محسن اور مورّخ رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ (1894.1951) بریلی کی مشہورِ عالم کتاب ''تاریخ ادبِ اُردو'' میں اس حقیقت پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہ زبان ملک کے اصل باشندوں کے علاوہ ڈاکٹر جان گلگرسٹ (1759.1841) قائم کردہ کلکتہ فورٹ ولیم کالج کی پشت پناہی میں جلد جلد ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے مسلم ہندو، سکھ اور عیسائی ادب نوازوں کے ذریعہ پروان چڑھی ہے۔ اس ضمن میں مسلمان اہل قلم اور سخنوروں کے ادبی کارناموں کی تفصیل بّرِصغیر کے مشہور محقق و ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخِ ادب اردو میں جناب حامد حسین قادری نے ''داستانِ تاریخ اُردو'' میں اور جناب ڈاکٹر ابو سعید نورالدین نے ''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ جو نہایت معلومات افروز اور سیر حاصل ہے ۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالہ میں ان قدیم اور ممتاز ہندو اور سکھ اربابِ ذوق اور اُردو ادب کے ''پرستاروں'' کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ جن کی علمی خدمات ہمیشہ آسمانِ ادب پر ستاروں کی طرح جگمگاتی رہیں گی اور جوں جوں اردو کو نقشہ عالم میں وسعت و شوکت حاصل ہوگی ان کا نام بھی فضاؤں میں نئی شان سے شہرت پاتا رہے گا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی کتاب میں بڑی شرح و بسط سے بتایا گیا ہے کہ برّصغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ہندو یا سکھ اردو نوازوں نے اردو کا پرچم بلند سے بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا ہو۔ مثلاً دکن میں مہاراجہ چندولال، راجہ گردھاری پرشاد باقی، مہاراجہ سرکشن پرشاد، دہلی میں پروفیسر رامچن ر پروفیسر ریاضی دہلی کالج، لالہ سری رام ایم اے دہلوی منشی ہرگوپال، نہال چند، فیض آباد پنڈت منوہر لال زتشی، کانپور میں منشی دیار این نگم، سیتا پور میں جوالا پرشاد برق، لکھنؤ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار پانڈے پور، (بنارس) بنارس میں دھنپت رائے پریم چند، الہ آباد میں چرن جی لال، بدایوں میں منشی پرشاد سحر، آگرہ میں ماسٹر بنسی دھر پنڈت گوراج کشور دت اور لاہور میں پنڈت ہری چند اختر دیوانمر ناتھ اکبری، پنڈت رادھا کشن، پنڈت شیونرائن شمیم، لالہ لاجپت رائے منشی، سورج نرائن مہر، وغیرہ اہلِ قلم پیدا ہوئے۔

(نقوش لاہور نمبر جولائی 1962ص 949.916)

چھاپہ خانے: مطبع نولکشور لکھنؤ کے مالک منشی نولکشور صاحب کو (سی آئی اے) متوطن بستو ضلع علی گڑھ (1936.1895) بھی ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جن کے مطبع نے ہزارہا اردو، عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کا بیش بہا لٹریچر شائع کرنے کا جنوبی ایشیا میں ایک مثالی ریکارڈ قائم کیا۔ اس شاندار روایت کو منشی نولکشور آنجہانی کے لائق و ہونہار فرزندوں منشی پراگ نرائن صاحب اور منشی بشن نرائن صاحب بھارگو نے پوری شان سے قائم رکھا، اور اردو کی خوب خدمت کی اس کے علاوہ بھائی بہادر سنگھ کے وزیر ہند پریس نے تواریخ گوروخالصہ مولفہ گیانی گیان سنگھ ہی

نہیں اور بہت سارا لٹریچر شائع کیا۔اسی طرح جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب متی بازار لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اردو رسم الخط میں نہایت دیدہ زیب طباعت اور کتابت سے آراستہ و پیراستہ ''سری گورو گرنتھ صاحب آد'' شائع کیا اور حاشیہ میں سینکڑوں گورمکھی الفاظ کے اردو معانی بھی زیبِ قرطاس کر کے اُردو دان طبقہ کو اس سے استفادہ کی راہیں آسان کر دیں۔یہ قدیم و قیمتی اور نایاب نسخہ بھی موجود ہے۔

تراجم مذہبی کتب

اُردو زبان میں وید کے تراجم بھی ایک ادبی کارنامہ ہے۔چنانچہ سام وید، یجر وید، رگ وید، بھومکا اور الکھ پرکاش کو اُردو میں بالترتیب انند سروپ، دھرم پالی، رام جگن ناتھ، رام موہن اور کنھیا لال نے منتقل کیا۔اسی طرح کلنکی پران کا آتما لال نے، ماکنڈی پران کا رگھو لال نے، اتم پران کا دیوان چند نے، وشنو پران کا، پنڈت امرناتھ مدن دہلوی نے، شیو پران کا سیوا سنگھ نے اور گنیش پران کا (منظوم) اردو ترجمہ شنکر دیال نے کیا۔ویدک شاستر کے مترجم بہاری لیل اور مجموعہ اپنشد کے بابو بہاری لال تھے۔ منوسرتی کے تراجم، ماسٹر آتما رام، دھرم پال رام بھروسہا سوامی دیال اور کرپا رام شرما جگرانوی کے قلم سے شائع ہوئے۔بھگوت گیتا کے بہت اردو تراجم ہوئے۔چند مترجمین کے نام یہ ہیں۔آتما رام، دوارکا پرشاد اُفق، رام سہائے تمنا، جانکی داس دہلوی، سوامی دیال شیام سندر لال، پربھو دیال عاشق، شنکر دیال فرحت، بشیشور پرشاد لکھنوی و منظوم ترجمہ، مہا بھارت اور رامائن کے بھی بیسویں صدی میں اُردو تراجم اشاعت پذیر ہوئے اور اُردو کے شائقین میں بہت مقبول ہوئے۔پچھلی صدی میں سکھ مت کا اُردو لٹریچر بھی نہایت کثرت سے چھپا، اور خصوصاً پنجاب میں بہت ذوق شوق سے پڑھا گیا۔مثلاً تاریخ دربار صاحب امرتسر (مولفہ سردار ادھم سنگھ) پوتھی شبد نادین محل (تیجا سنگھ سوڈھی) دھرم بچار (جواہر سنگھ) سکھ مت کی تعلیم (دلجیت سنگھ کنور) گرو گوبند سنگھ کا جیون چرتر (دولت رائے) عطر روحانی ترجمہ جپ جی (سردار عطر سنگھ) سچا بلیدان (گوپال سنگھ) گورو ارجن مہاراج کی سوانح عمری (مطبوعہ نولکشور) سکھوں کا روحانی انقلاب (لابر سنگھ)

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قاموس الکتب اردو ص 1172.1101ء ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی۔اشاعت اول جون 1961ء)

اُردو صحافت کے شاہکار

اب ہم متحدہ ہندوستان کی اردو صحافت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہندو اور سکھ دونوں تاریخی قوموں کی اُردو نوازی کا ایک نیا اور حیرت انگیز باب کھل جاتا ہے۔تاریخ ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدِ حکومت میں 1832ء سے 1939 (دوسری جنگ عظیم تک) جاری ہونے والے اخبارات و رسائل (مع ان کے مالکان یا مدیران کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔(ماخذ ''صحافت پاکستان و ہند میں'' تالیف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ناشر مجلس ترقی ادب لاہور۔پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ مرتبہ ڈاکٹر مسکین علی حجازی ناشر سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور 1977ء)1822ء جامِ جہاں نما (کلکتہ) مدیر منشی سدا سُکھ۔1845ء قران السعدین (دہلی) رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن، فوائد الناظرین (دہلی) ماسٹر رام چندر پانی پتی بنارس اخبار (بنارس) گووندر گھوناتھ۔ 1846ء خیالی (لکھنؤ) منشی خیال رام۔1847ء محب وطن ماسٹر رام چندر۔روائد الشائقین (دہلی) پربھودیال، بنارس گزٹ (بنارس) بابو رگھو ناتھ ٹھاٹھے۔گوالیا اخبار (گوالیار) خیراتی لال۔1850ء زائرین ہند (آگرہ) مالک لالہ ہربنس رام پنجاب (گجرانوالہ) ہفت روزہ ایڈیٹر سکنڈ مل۔1852ء نور مغربی (دہلی) ایڈیٹر بلور سنگھ۔گوالیار اخبار (گوالیار) کچھمن داس۔1853ء آفتاب ہند (بنارس) پہلے ایڈیٹر پرکاش داس پھر بابو نور علی نور (سیالکوٹ) منشی دیوان چند۔1859ء۔چشمہ فیض گوبندر ناتھ سیالکوٹ منشی دیوان چند۔1860ء گنجِ شائقان (لاہور) جاری کردہ منشی ہر سُکھ رائے مدیر پنڈت سورج بھان۔1861ء خیر خواہ ''پنجاب'' مدیر منشی گیان چند شوق۔1866ء آفتاب پنجاب (لاہور) دیوان بوٹا سنگھ۔ستارہ ہند (سیالکوٹ) منشی دیوان چند، ماہنامہ کوہِ طور (گوجرانوالہ) منشی دیوان چند ماہنامہ مجمع العلوم چشمہ فیض (گجرانوالہ) منشی گیان چند۔1870ء اتالیق پنجاب، ایڈیٹر منشی پیارے لال۔1880ء وکٹوریہ پیپر (سیالکوٹ) مدیر منشی گیان چند۔ 1884ء آئینہ ہند (لاہور) رنگی رام کی زیرِ ادارت 1885ء شیخ چلی (لاہور) مان سنگھ 1891ء سیالکوٹ پیپر (سیاکوٹ) مالک و مدیر ٹوڈر مل۔1895ء پنجاب آرگن (وزیر آباد) دیوان آتما۔1905ء انڈیا اور پٹوار گزٹ، ایڈیٹر شمشیر سنگھ بی۔اے۔1913ء ٹمپرنس گزٹ ماہنامہ (گجرانوالہ) میلا سنگھ سنسار۔1914ء ہفت روزہ کھشتری (گجرانوالہ) مالک و مدیر سیٹھ چرن داس۔1918ء ماہنامہ

حکمت سنیاس (گجرانوالہ) مدیر لکھمن سنگھ گجرانوالہ وار گزٹ (گجرانوالہ) لالہ خوشی رام ہیڈ ماسٹر۔1919ء پرتاب (لاہور) مہاشہ کرشن۔1920ء بندے ماترم(لاہور) لالہ لاجپت رائے۔1921ء روزنامہ کیسری (لاہور) شاملال کپور۔پریم بیلاس (گجرانوالہ) سر سٹامی مترسین۔1922ء ہفت روزہ رام گڑھیاں شیر (گجرانوالہ) گوپال سنگھ رام گڑھی۔نہنگ (لاہور) مدیر ٹھاکر سنگھ۔1923ء ملاپ (لاہور) مہاشہ خوشحال چند خورسند سابق مدیر ''آریہ گزٹ''

1924ء ریاست (دہلی) دیوان سنگھ مفتون۔1926ء ہفت روزہ پنجاب گزٹ ڈاکٹر دیال چند مالک مدیر صداقت (گجرانوالہ) گیانی جے سنگھ۔1928ء ویر بھارت (لاہور) سوامی گنیش دت گجرانوالہ گزٹ (گجرانوالہ) مدیر جہانگیر چند۔1930ء ندھڑک (گجرانوالہ) مدیر جہانگیر چند۔حقیقت مدیر جہانگیر چند رام لال ولد کرم چند مالک و مدیر۔رگڑا (گجرانوالہ) حویلی رام ولد مکند لال۔1931ء گورو نانک خالصہ کالج میگزین انگریزی۔ اردو ہندی اور گورمکھی پر مشتمل مجلہ (گجرانوالہ) مدیر باوا نرائن سنگھ۔1932ء ڈسٹرکٹ گزٹ (گجرانوالہ) مدیر و مالک دیال چند پنجاب ایڈووکیٹ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔ اکالی گزٹ (گجرانوالہ) ٹھاکہ سنگھ۔تجارت (گجرانوالہ) مالک و مدیر رام لعل۔ملاپ خالصہ (گجرانوالہ) ایشر سنگھ۔

1933ء پنجاب موٹر گزٹ (گجرانوالہ) دیال چند۔ماہنامہ برہمن سندیش (گجرانوالہ) رام لعل۔دیہات سدھار (گجرانوالہ) بیدی شیر سنگھ انسپکٹر آف سکولز۔نشان خالصہ (گجرانوالہ) ٹھاکر سنگھ۔1934ء ہندو ہیراڈ ہندو ملاپ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔1935ء روزنامہ ہندو (لاہور) بھائی پرمانند ہندو سبھائی لیڈر۔ڈسٹرکٹ گزٹ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔جوبلی (گجرانوالہ) سرداری لعل۔1936ء سیوک (گجرانوالہ) اننت رام نارنگ۔1937ء پریم (گجرانوالہ) ہنس راج وید۔منزل (گجرانوالہ) مدیر و مالک رام لبھایا۔خالصہ (گجرانوالہ) کرتار سنگھ مالک و مدیر۔منشی فاضل ایس طالب مدیر تھے۔انمٹیکس گزٹ (گجرانوالہ) ڈاکٹر دیال چند۔ماہنامہ حکیم (گجرانوالہ) ڈاکٹر کرم چند مالک و مدیر۔1939ء ماہنامہ رنجیت (گجرانوالہ) بلبیر سنگھ گیانی۔ماہنامہ راجپوت (گجرانوالہ) سوہن لال سوہترہ۔(ماخوذ)

***

اُردو کی اِرتقائی منازل اور مختلف نام (ادارہ)

اُردو ایک ایسی پیاری اور دلکش زبان ہے کہ اُس کی زلف گرہ گیر کے اَسیر ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔اُردو کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔اس گلستاں کی سیر کرنے والا کبھی تشنہ نہیں رہ سکتا۔اُردو کو اُردو کہنا بقول کسے صرف اُردو کے ساتھ بے اِنصافی ہی نہیں، پورے برّصغیر کی تہذیب، تاریخ اور باہمی میل ملاپ سے زیادتی ہے۔اُردو کو جینے کا ایک سلیقہ، ایک طرزِ زندگی اور ایک اسلوبِ زیست کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

معروف ادیب جناب رضا علی عابدی اپنی کتاب ''اُردو کا حال'' میں لکھتے ہیں:

''رشید احمد صدیقی کیسے بھلے آدمی ہیں انہوں نے لکھا تھا کہ زبان کے علاوہ اُردو بہت کچھ اور بھی ہے۔جیسے ایک قیمتی ورثہ، ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کُن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمان وفا، یا اس طرح کی کتنی اور باتیں، جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں۔''

(اُردو کا حال از رضا علی عابدی سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور)

اُردو ایسا ہی ایک مسحور کُن نغمہ ہے کہ جو لسانی اور سماجی اختلاط و ارتباط سے وجود میں آیا۔ جسے ہر چاہنے والے من پسند نام سے پکارا۔اُمیر خسرو نے اُسے ہندوی یا دہلوی کے نام سے پکارا۔ اُردو نے جتنی بھی ارتقا کی منازل طے کیں۔اتنے ہی اس کے نام بنتے چلے گئے اور مختلف ادوار میں یہ نام بدلتے بھی گئے ۔ ناموں کی اس تبدیلی کے پس پردہ لسانی اور تہذیبی خصوصیات بھی تھیں۔اس شیریں زبان کو کبھی ہندوی کہا گیا۔تو کبھی ریختہ کے نام سے یاد کیا گیا۔کبھی اُسے اُردوئے معلی بھی کہا گیا اور کسی زمانے میں اُسے دکنی اور گجراتی کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔اُردو کے ناموں کا یہ سفر بالآخر اُردو پر ہی اختتام پذیر ہوا۔انہی ناموں کی مختصر کہانی درجِ ذیل ہے ۔ہندی یا ہندوی۔فصیح الملک نواب مرزا داغ نے اپنی ایک مشہور غزل کے مقطع میں یوں سخن آفرینی کی تھی کہ:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اب تک کی لسانی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ داغ نے جس اُردو پر ناز کیا تھا وہ یہ اُردو نہ تھی۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی سے لے کر

موجودہ زمانے کے لسانی محققین کی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی نسبت اسے ہندی یا ہندوی کہا جاتا رہا ہے۔ اس نام کی شہادت قدیم لغات اور ادبی تصانیف میں بھی ملتی ہے۔ ریختہ۔ غالبؔ نے میر کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

دراصل ریختہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جو مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بنانا، ایجاد و اختراع کرنا، نئے سانچے میں ڈھالنا، اور موزوں کرنا وغیرہ۔ لیکن ہندوستانی ادبیات میں بالکل نئے معانی میں استعمال کیا گیا۔ اُردو کے نغمے جب راگ رنگ کی محفلوں میں سماں باندھنے لگے تو اسے ریختہ کہا جانے لگا۔ چنانچہ بعد میں مختلف زبانوں اور بولیوں کے اختلاط کی بناء پر بطور استعارہ اُردو کو بھی ریختہ کہا جانے لگا۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی تصنیف ''آبِ حیات'' میں ریختہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں۔ ''گری پڑی پریشان چیز'' چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں۔ اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔

(آبِ حیات از مولانا محمد حسین آزاد سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور)

اُردوئے معلّٰی

دہلی کا پہلا مسلمان حکمران قطب الدین ایبک ابتدا میں شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ وہ جلد ہی اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر فوج کا جرنیل بن گیا۔ اس نے 1193ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اسی فوج کے متعلق ہمیں لفظ اُردو کا استعمال تاریخی کتب میں نظر آتا ہے۔ اس لشکر کو اُردوئے معلّٰی یعنی عسکرِ اعلیٰ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے یہ نام اُردو زبان کو بھی دیا گیا۔ جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ صرف اُردو ہی رہ گیا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔ ''ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جُلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہوگیا'' (آبِ حیات از مولانا محمد حسین آزاد بحوالہ اُردو ادب کی مختصر تاریخ ص 49) میر تقی میرؔ کے صاحب زادے میر کلو عرشؔ سے جو شعر منسوب ہے اس میں بھی اُردو زبان کو ''اُردوئے معلّٰی'' ہی کہا گیا ہے۔

ہم ہیں اُردوئے معلّٰی کے زبان دان اے عرش
مستند ہے جو ارشاد کیا کرتے ہیں

(اُردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر ص 56)

دیگر مختلف نام

اُردو کے مختلف ناموں کے ضمن میں اکثر ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کی نسبت سے اُردو بعض اوقات دکنی، گجراتی، گوجری، لاہوری، دہلوی، ہریانی، ہندوستانی اور پنجابی وغیرہ کہلاتی رہی ہے۔ ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے اب صرف اُردو ہی کا لفظ مروج ہے۔ اور باقی سب متروک قرار پاچکے ہیں۔ اس ساری بحث کے آخر پر فرازؔ کا شعر یاد آرہا ہے۔ جو اس حوالے سے انتہائی موزوں ہے کہ

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو نام بھی تجھ سا رکھے

(ماخوذ)

عبدالمجید ظفر

چہل پہل تھی رونق میلہ جھوم رہے تھے سارے لوگ
رام کہانی کس کو سناؤں کہاں گئے یہ سارے لوگ
دیر نہیں ہے بات صبح کی کہتے تھے آؤ بیٹھو پاس
دن ڈھلے سے ڈھونڈ رہا ہوں کہاں گئے یہ سارے لوگ
یہ کیسا جمہور ہے یارو بادشاہ ہو یا صدر وزیر
جو چاہیں وہ آپ کریں خاموش کھڑے ہیں سارے لوگ
ایک وقت تھا اپنے دل میں پیار کا دریا بہتا تھا
کب وہ طوفاں آیا جس میں ڈوبے آنکھ کے تارے لوگ
جس کی کوٹھی میں ہیں دانے رات گئے تک جاگے ہیں
دن بھر محنت کرنے والے وقتی سوگئے سارے لوگ
سفر طویل جو کرکے آئے بیٹھ گئے سستانے کو
تیز قدم تھے جن کے آگے نکل گئے ہیں سارے لوگ
ظفر تو اب کیا ڈھونڈ رہا ہے ہوش کے اب تو ناخن لے
دن نکلا اور رات گئی جب چھپ گئے چاند ستارے لوگ

چند مشاعروں کی جھلکیاں

رانا عبدالرزاق خان صاحب کی کتاب ’’دانشکدہ‘‘ کی تقریب رونمائی دسمبر 2017

3 مارچ 2017ء کے ایک مشاعرہ کی کاروائی کا منظر

مشاعرہ دسمبر 2017ء کے موقع پر حاضرین

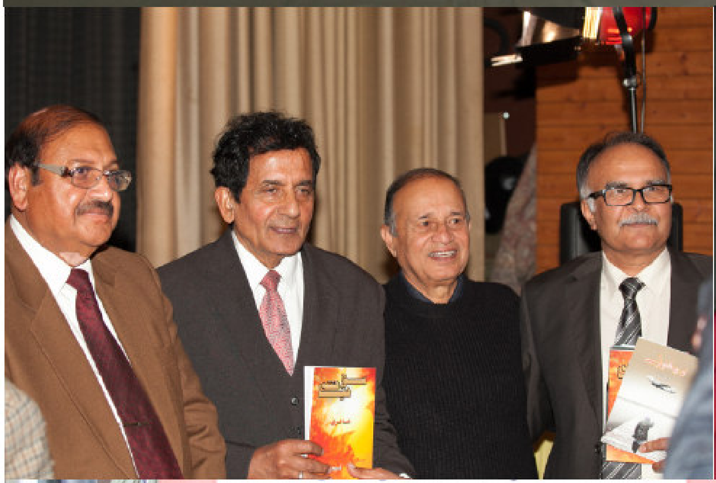

جرمنی میں منعقدہ ایک مشاعرہ کی یادیں

اکتوبر 2017 کے ایک مشاعرہ میں شامل معززین مشاعرہ

2017ء کے ایک مشاعرہ کو سنتے ہوئے شعرائے کرام

2017ء کے ایک مشاعرہ کی یادگار تصویر

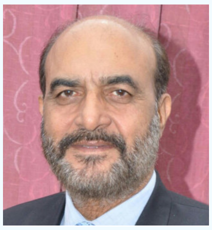

معروف شاعر بے باک صحافی اور بے مثال استاد

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی شخصیت اور زندگی کا ارتقائی سفر

شہزادہ مبشر گلاسگو (سکاٹ لینڈ)

ڈاکٹر عبدالکریم خالد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ ایک ماہر نقاد، مستند محقق، مشہور شاعر بے باک صحافی اور بے مثال استاد ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا ہر پہلو دوسرے سے منفرد اور یگانہ ہے۔ ذیل میں ان کے عہد بہ عہد سوالی کوائف پیش خدمت ہیں تا کہ قارئین ان کے ارتقائی سفر سے بخوبی آگاہ ہوسکیں۔ **1952**ء ولادت 8 اگست روز جمعۃ المبارک (کاغذات میں 15 اگست درج ہے)

والدہ ماجدہ : محترم امۃ الحفیظ ، والد ماجد : محترم عبدالقادر مرحوم وبہنیں: امۃ النصیر، امۃ المتین برادران: عبدالرحیم طارق، عبدالحلیم احمد **1957**ء:: والدہ محترمہ اور دادی جان (محترمہ غلام فاطمہ) سے قرآن پاک ناظرہ کا دور مکمل کیا۔ **1961**ء:: پرائمری سکول میں ابتدائی تعلیم کا آغاز۔ دادی جان مرحومہ ساتھ لے کر سکول میں داخل کروانے گئیں۔ 1961ء:: تیسری جماعت میں پہلی بار ”علم کے فائدہ“ ہے کے موضوع پر تقریر کی اور درجے میں سکول کے ایک ڈرامے میں حصہ لیا۔ 1962ء:: انہیں سکول کے اساتذہ الطاف احمد صاحب اور محمد ارشد صاحب کی خصوصی توجہ اور شفقت حاصل رہی ۔ دونوں اساتذہ کرام زبردست فنکارانہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور تعلیمی ماڈل تیار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ماسٹر ارشد صاحب گندھی ہوئی مٹی سے مختلف پھلوں کے ماڈل بنانا سکھاتے تھے۔ 1963ء:: پانچویں جماعت کے ورینکلر کے امتحان میں شرکت کی۔ 1964ء:: گورنمنٹ تعلیم الاسلام ہائی سکول چناب نگر میں داخلہ ہائی سکول کے اساتذہ عبدالرحمن اتالیق صاحب، محمد ابراہیم سارچوری صاحب، محمد ابراہیم بھامڑی صاحب، عبدالرب صاحب محمد اسماعیل صاحب محمد صدیق صاحب اور دیگر اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ 1965ء:: جنگ ستمبر۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے جنگی ترانوں اور قومی نغموں کی ولولہ انگیز صدائیں آج بھی ان کی ساعت میں محفوظ ہیں۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنے علاقے میں قومی تحفظات کے حوالے سے ڈیوٹی بھی دی۔ 1966ء:: ادب اور شاعری سے دلچسپی، کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور لکھنے سے رغبت ہوئی۔

1967ء:: نویں جماعت میں پہلی بار اردو کے استاد عبدالرشید صاحب کی طرف سے حوصلہ افزائی پر بچوں کے رسالے کے لیے ایک کہانی لکھی۔ اسی سال سکول کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لے کر دوم انعام حاصل کیا۔ 1968ء:: میٹرک کا امتحان سائنس کے مضامین میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ کالج (گورنمنٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر پنجاب) میں شماریات اقتصادیات اور عربی کے مضامین میں گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا۔ کالج کی شماریات ہ سوسائٹی کے اسٹنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ 1969ء:: کالج کی بزم اردو کے صدر منتخب ہوئے جس کے نگران پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی تھے۔ پروفیسر حمید احمد خان مرحوم بزم اردو کی تقریب میں کالج میں تشریف لائے۔ اس تقریب کی صدارت کی سعادت عبدالکریم خالد کے حصہ میں آئی۔ جس میں پروفیسر حمید احمد خان مرحوم اور پروفیسر چودھری محمد علی صاحب نے مقالات پڑھے۔ اسی سال ”یوم غالب“ کے موقع پر ایک تمثیلی مشاعرہ اسٹیج ہوا جس میں خالد نے مرزا رفیع سودا کا کردار ادا کیا۔

1970ء:: ایف ۔ اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1971ء:: بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ اردو علی اور عربی اختیاری کے مضامین لئے۔ اردو کے استاد پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی کی خاص توجہ نے ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اسی سال کالج یونین کے سیکرٹری نامزد ہوئے۔ 1972ء:: بی۔ اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ کالج کی طرف سے مختلف بین الکلیاتی اردو مباحثوں اور مشاعروں میں شرکت کی اور متعدد انعامات حاصل کئے۔ 1973ء:: ایم اے عربی میں داخلہ لیا۔ کالج میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بین الکلیاتی مباحثوں اور سیرت کانفرسوں میں مقرر کے طور پر شہرت ملی۔ کالج کی ”بزم ارشاد“ کے صدر مقرر ہوئے ۔ ایم ۔ اے کے اساتذہ کرام میں پروفیسر صوفی بشارت الرحمن صاحب ، پروفیسر محمد سلطان اکبر صاحب، پروفیسر اسلم صابر صاحب، پروفیسر محمد اسلم، شاد منگلا صاحب

اور پروفیسر ملک مبارک احمد صاحب کی خصوصی توجہ اور شفقت حاصل رہی۔1974ء:: ایم اے عربی کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1975ء:: حمایت اسلام لاء کالج میں داخلہ لیا۔اس کے ساتھ ہی روزنامہ مغربی پاکستان میں بطور سب ایڈیٹر ملازمت کا آغاز کیا۔1976ء:: روزنامہ مغربی پاکستان میں ڈیلی کالم ’’سوہنا شہر‘‘ لکھنا شروع کیا۔اخبار کے تعلیمی صفحہ کے انچارج مقرر ہوئے۔اسی سال آپ کی دادی جان محترمہ غالم فاطمہ صاحبہ کا انتقال ہوا۔اس صدمے نے ایک طویل عرصہ انہیں اپنی گرفت میں رکھا۔

1977ء:: چچا زاد عائشہ پروین سے شادی ہوئی ۔ اسی برس اشاعتی ادارے شیخ غلام علی اینڈ سنز سے وابستہ ہوئے اور جریدی کتابوں کے سلسلے ’’روشن کتابیں‘‘ کی مجلس مشاورت میں عین کاف خالد کے قلمی نام سے شامل ہوئے۔1978ء:: بچوں کے رسالہ ’’جگنو‘‘ کی ادارت سنبھالی۔شیخ غلام علی اینڈ سنز کو خیر باد کہہ کر چند روز ضیاء شاہد کے ہفت روزہ ’’صحافت‘‘ سے منسلک رہے۔نذیر ناجی کے اخبار روزنامہ ’’حیات‘‘ سے بھی کچھ عرصہ وابستہ رہے۔1979ء:: ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس دوران میں نامور رہنماؤں نوبزادہ نصراللہ خان، محمد حنیف رامے اور تاج محمد خان جمالی کے انٹرویوز کئے۔مختلف سیاسی شخصیات پر خاکے بھی لکھے۔ 1980ء:: ’’خالدین‘‘ کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کیا اور ادبی کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔مگر دو تین کتابیں شائع کرنے کے بعد ہمت جواب دے گئی پہلے بیٹے اعجاز خالد کی ولادت۔

1982ء:: بڑی بیٹی فائزہ نصرت کی پیدائش۔1983ء:: گلبرک کیمبرج میں بطور اساتذہ ملازمت کی۔اسی دوران میں ڈاکٹر عبدالرشید تبسم کا پندرہ روزہ ’’انقلابِ نو‘‘ شائع کرنا شروع کیا مگر تین شماروں کے بعد یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔1985ء:: پنجاب یونیورسٹی میں بطور پرائیویٹ امیدوار ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔اس دوران پرائیویٹ ادارے بو علی سینا سائنس کالج میں اُردو کا مضمون پڑھایا۔حلقہ ارباب ذوق کے رکن بنے۔ دوسری بیٹی بشریٰ مریم کی ولادت۔1987ء:: بطور لیکچرار اُردو گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور میں تقرر ہوا۔دوسرے بیٹے حفاظ توصیف احمد کی پیدائش۔1988ء:: گورنمنٹ ایف ایس سی کالج میں ایم اے اُردو کی تدریس وابستہ ہوئے۔2000ء:: گورڈن یونین کالج راولپنڈی کے مجلہ ’’گورڈن یونین‘‘ کا سوسالہ خصوصی نمبر شائع کیا۔گورنمنٹ ایجوکیشن کالج لوئر مال لاہور میں تبادلہ۔2001ء:: حکومت پنجاب کے تحت پہلی سے بارہویں جماعت کے اردو کے نصاب کی نظر ثانی اور تدوین کمیٹی کے کنویز کی حیثیت سے تقرر۔گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تبادلہ۔ایم۔اے اردو کی کلاسوں کی تدریس میں مامور ہوئے۔

2002ء:: گورنمنٹ کالج آف سائنس لاہور میں تبادلہ۔شاعری میں رومانی اور اخلاقی مضامین کا بیان نظم نگاری کی طرف توجہ۔

2003ء:: گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن لوئر مال میں تبادلہ۔ والد گرامی عبدالقادر صاحب کے انتقال کا صدمہ جانکاہ جھیلنا پڑا۔2004ء:: یونیورسٹی آف ایجوکیشن کے ایم۔اے اردو و تدریس میں اردو کے نصاب کی تدوین میں شریک ہوئے اور ایم۔اے کی کلاس کو لسانیات کا پرچہ پڑھانا شروع کیا۔2005ء:: ڈاکٹر سہیل احمد خان کی نگرانی میں ممتاز ’’مفتی کے افسانوی ادب میں نفسیات نگاری‘‘ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یونیورٹی آف ایجوکیشن کے تحت ایم فل اردو کی کلاس کے اجزاء پر ’’تحقیق‘‘ کا نصاب پڑھانے پر مامور ہوئے۔ بڑی بیٹی فائز و نصرت کی شادی انیس الرحمٰن انس مقیم (لندن) سے انجام پائی۔2006ء:: تصنیف و تالیف کی طرف توجہ۔ نامکمل اور ادھورے منصوبوں کی تکمیل کا مصمم ارادہ۔’’چند اور مضامین‘‘ کے عنوان سے مضامین کے مجموعے کی اشاعت ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے مضامین کا پہلا باقاعدہ مجموعہ ’’نئے پرانے مضامین‘‘ کے نام سے ۱۹۹۸ء میں اظہار سنز لاہور نے شائع کیا۔اس مجموعے میں درج ذیل سولہ مضامین شامل ہیں۔

(1) بیسویں صدی کی اردو نظم (2) بیسویں صدی کی اردو غزل (3) حبیب جونپوری۔ایک مطالعہ (۴) ملاقاتیں ادھوری ہیں (عطاالحق قاسمی کی شاعری) (5) احمد عقیل روبی کی خاکہ نگاری (6) شبیہ الحسن کی ترجیحات (7) امراؤالقیس۔حُسن کا شاعر (8) نابغہ ذیبانی (9) زہیر بن ابی سلمیٰ (10) نامور مرثیہ گو۔خنساء (11) حسان بن ثابت (12) تشبیب 13) واہ باقر صاحب (ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی رحلت پر) (14) آہ باقر صاحب (ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی پہلی برسی پر) (15) رومان کی موت (فرخندہ لودھی کی افسانہ نگاری کے بارے میں) (16) کومل جذبوں کا شاعر (فرقان احمد قریشی کے حوالے سے)

***

عبدالکریم قدسی فن وقدر کا ایک عظیم مقبول روایتی شاعر

شہزادہ مبشر گلاسگو (سکاٹ لینڈ)

نام: عبدالکریم قدسی۔ والد کا نام: میاں اللہ دتّہ
تاریخ پیدائش :6 جون 1948ء موضع کرتو ضلع شیخوپورہ۔ تعلیم : میٹرک، پنجابی فاضل۔ ادبی سفر کا آغاز: 1968ء ادبی شناخت: شاعر، افسانہ نگار، کہانی کار، سفرنامہ نگار، گیت نگار

پنجابی کتب: پیڑ دے پتھر (آزاد نظمیں) 1977ء سر دل (غزلاں)، برہوں دی رڑک (گیت) ۲۰۰۲ء۔ ہنگال (ٹپے، ماہیے، بولیاں، چو مصرعے)، پاسکو (غزلاں نظماں، گیت) پکھیرو بال ادب نمبر 2006ء، منظوم پنجابی ترجمہ ''القصید''، قلم کبوتر (دوستاں نوں لکھے گئے منظوم خط)

اُردو کتب: اے میرے پیارے امام (غزلیں نظمیں)، رزق خیال (غزلیں، نظمیں) آداب ہجر (غزلیں نظمیں)، دستِ منور (غزلیں نظمیں) اشک رواں (غزلیات)

ایوارڈ:: پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ، مسعود کھدر پوش ایوارڈ، پی ٹی وی ایوارڈ برائے گیت کار۔ حرفِ نو ایوارڈ برائے پنجابی غزل۔

وابستگی: روزنامہ امروز، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ مشرق، روزنامہ مغربی پاکستان، روزنامہ مساوات ہفت روزہ لاہور تخلیق۔ ماہنام تحریریں، نصرت، لہراں، پنجابی ادب، سویر انٹرنیشنل ،میری بولی میر ادھرم۔ محترم عبدالکریم قدسی صاحب کو جو ایوارڈ ملے میں اُس میں پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ کی تقریب میں دیا جانے والا آدم جی ایوارڈ بھی شامل ہے۔ چنانچہ اس ایوارڈ کے تفصیل اور عبدالکریم قدسی صاحب کو دئے جانے کے حوالہ سے ایک یادداشت اور خوبصورت واقعہ درج ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ رائٹرز گلڈ کے پہلے سیکریٹری اشفاق احمد خاں پھر سید وقار عظیم، قتیل شفائی، ڈاکٹر وحید قریشی، میرزا ادیب، ڈاکٹر رشید انور، محمد طفیل، ارشد میر، جاوید طفیل اور حفیظ صدیقی بطور سیکرٹری گلڈ کام کرتے رہے۔ آج کل اقبال صلاح الدین اس کے سیکرٹری ہیں۔ ۲۵ سال قبل گلڈ کے پلیٹ فارم سے آدم جی انعام، نیشنل بنک انعام اور کئ دوسرے انعام دیئے جاتے تھے۔ پھر بوجود یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب دوبارہ انعامات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جو فی الحال پنجاب کی سطح تک ہے۔

سال 2001ء میں شائع شدہ پنجابی کتابوں پر ایوارڈ کی تقریب:

جناب عبدالکریم قدسی کو ان کے شعری مجموعہ ''سر دل'' پر اور جناب افضل احسن رندھاوا کو ان کے ناول ''پندھ'' پر انعام دیا گیا۔ انعام ایک خوبصورت شیلڈ، سرٹیفکیٹ اور ڈھائی ہزار روپے نقد پر مشتمل تھا۔ (ان دونوں کتابوں کو مسعود کھدر پوش ایوارڈ بھی مل چکا ہے،) اس سلسلہ میں ایک پروقار تقریب مورخہ 7 اگست 2003ء کو الحمرا ہال نمبر 3 لاہور میں منعقد کی گئی جس کی صدارت صوبائی وزیر ثقافت و امور نوجوانان چوہدری شوکت علی بھٹی نے کی۔ تلاوت کے بعد تیمور افغانی نے عارفانہ کلام سنایا۔ اس کے بعد جاوید طفیل مدیر نقویش نے سپاسنامہ پیش کیا۔ انہوں نے بتایا پاکستان رائٹرز گلڈ نے 25 سال کے تعطل کے بعد انعامات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان کے بعد شفقت تنویر مرزا، بیدار سرمدی اور بشیر احمد بھٹی نے حاضرین سے خطاب کیا۔ مقررین نے کہا کہ اہل قلم ہنگاموں سے دور رہنے والا پُرامن طبقہ ہوتا ہے اور ان کے لئے حکومت کی طرف سے مراعات ملنی چاہئیں۔

وزیر ثقافت چوہدری شوکت علی بھٹی نے بھی دانشوروں کی فلاح و بہبود کے لئے مراعات دینے کا وعدہ کیا۔ تقریب کی خاص بات نامور شاعر اور کالم نگار اعزاز احمد آذر کی نظامت کی۔ انہوں نے برمحل اشعار، واقعات اور دانشورانہ گفتگو سے حاضرین کو اپنی گرفت میں لئے رکھا۔ عبدالکریم قدی کو ایوارڈ کے لئے بلانے سے قبل انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ پنجاب اور پنجابی ادب کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر جگتار امریکہ میں اپنے شاگرد کے پاس گئے اس نے ڈاکٹر صاحب سے فرمائش کی کہ مجھے پاکستان کے کسی ایسے پنجابی شاعر سے فون پر ملوایئے۔ جو بہت تیکھے اور کٹیلے شعر کہتا ہو۔ ڈاکٹر جگتار نے قدسی صاحب کا نمبر ملایا اور کہا کہ میرے شاگرد کلوندر سے بات کریں اور اسے کوئی اچھی غزل سنائیں۔ قدسی صاحب نے کلوندر سے کہا بھائی اس وقت پاکستان میں رات کے گیارہ بجے اور لوڈ شیڈنگ ہے۔ اور مجھے کوئی مکمل غزل یاد نہیں۔ البتہ ایک تازہ شعر سُن لیں اور وہ شعر یہ تھا۔

لُوں لُوں قرض گروی پایا عزت مٹی ہوگئی
اکّو سال دے اندر اندر داڑھی چٹی ہوگئی

(یعنی قرضے نے میرا بال بال گروی رکھ کر میری عزت خاک میں ملا دی ہے اور اس غم کی وجہ سے میری سیاہ داڑھی صرف ایک سال میں سفید ہوگئی ہے) کلوندر شعر سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے کہا کہ بس بس قدسی صاحب دیگ میں سے ایک دانہ دیکھنا ہی کافی ہوتا ہے اور اگلے ہفتے اس نے ایک سو ڈالر کا چیک بطور نذرانہ قدسی صاحب کو بھجوایا۔ دونوں انعام یافتگان نے حاضرین اور رائٹرز گلڈ کی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح ہی سادہ مگر پروقار تقریب اپنے اختتام کو پہنچا۔

عبدالکریم قدسی صاحب کے بارے میں دانشورانِ ادب کے رائے

بھارت کے مشہور شاعر پروین کمار اشک پٹھانکوٹ پنجاب، انڈیا عبد الکریم قدسی صاحب کے بارے میں بعنوان ''عبدالکریم قدسی ایک انسان نواز شخصیت'' تحریر کرتے ہیں کہ قارئین! کیا آپ نے بھی زخموں کا لباس اوڑھے کسی خانماں برباد فقیر کو اپنے گم شدہ گھر کا پتا ڈھونڈتے ہوئے دیکھا ہے؟ نہیں ناں؟ یہ خانہ بدوش اللہ کا بندہ عبدالکریم قدسی ہے۔ جس کے پورے وجود پر سیاسی درندوں اور مذہبی ٹھیکے داروں نے احساساتی طور پر اتنے کوڑے برسائے کہ اس کو گھر بار چھوڑ کر اپنی زمین سے کوسوں دور پرائے ملکوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا:

ہمارا گھر بھی جلا اور ہمیں سزا بھی ہوئی
ہمارے عہد کے منصف بھی دل دکھا کے چلے
گھر کی دیواریں مہاجن کی نظر رکھتی تھیں
گھر کا ماحول تھا مقروض گھرانوں جیسا

اپنی بدحالیوں کا خونچکاں منظر نامہ قدسی صاحب اتنی شدت سے پیش کرتے ہیں کہ قاری بے ساختہ اداس ہو کر ان کا ہمدرد بن جاتا ہے:

ظالم گنے نہ لوٹنے والے گنے گئے
لیکن ہمارے منہ کے نوالے گنے گئے
گھر میں رہ کر سفر میں رہتا ہوں
یہ سفر مدتوں سے جاری ہے
سانحہ کیا ہوا دسمبر میں
جون میں بھی ٹھہرے ٹھہرے رہنا

زمینی بدعنوانیوں کے شکار عبدالکریم قدسی فرماتے ہیں:

لوگوں نے مل کے وقت کو تسخیر کر لیا
اور ہم ہیں ذات پات کے قیدی بنے ہوئے

عہد حاضر میں برپا دہشت گردانہ انسان کشیوں کی وارداتی تصویر طنزیہ دردناک اسلوب میں دیکھئے:

ہم نے عبادتوں کے قرینے سکھا دیئے
تازہ لہو سے صحن، معابد سجا دئے

اجنبی ملک میں زندگی کیسے بسر ہوتی ہے حساس فنکار بیان کرتا ہے۔

یہ فضا یہ راستے نا آشنا
میں نے جانا تھا کہاں، آیا کہاں

ایک ملک بدر کی کربنا کی موثر انداز میں کتنے زاویوں سے عیاں ہو رہی ہے۔

مجاور بھی انہیں کیوں یاد رکھیں
کہ جن کی قبر پر کتبے نہیں ہیں

ایک شریف النفس مفلس کی معاشی تنگدستی اس کو خون کے آنسو کیسے رلاتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

لئے جو دھوپ میں چھاؤں کے قرضے
رُتیں گزریں ابھی تیرے نہیں ہیں

مندرجہ بالا حیات کش فضاؤں میں بھی عبدالکریم قدسی انتہائی مضبوط آہنی ارادوں اور پُرامیدوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

اگر چہ خشک ہیں اور ختم ہونے والے ہیں
یہ کم نہیں کہ میسر ابھی نوالے ہیں
گلستاں چھوڑنا شکست نہیں
ابھی بھی کانٹوں میں چٹک جاری ہے
دھوپ کیسی بھی تھی مگر ہم نے
سر سے پگڑی نہیں اتاری ہے
سفر میں رہنا نہ شکوہ گلہ کوئی کرنا
یہ مشقِ ظرف تو آبِ رواں سے آتی ہے

عبدالکریم قدسی صاحب کی تجرباتی شاعری اور انسان نواز شخصیت مجھے دونوں عزیز ہیں۔ خدا ایسے نیک فنکار کو صحت و سلامتی کے ساتھ زندہ رکھے۔ آمین۔ مجھے یقین ہے ان کا آمدہ غزلیہ مجموعہ اپنی انوکھی معنویت اور شعری صداقتوں کی بدولت پزیرائی حاصل کرے گا۔ آمین۔

دیسی گوری

(ایک سچی کہانی افسانے کے روپ میں)

امجد مرزا امجدؔ

میں لمب لین بریڈفورڈ پر اپنی دکان میں تھا اور ایک دوست محو گفتگو تھا کہ وہ چونکا اور دکان سے باہر نکل کر ایک پتلی لمبی انگریز عورت کو آواز دی ''میگی اے میگی ذرا ادھر آنا'' میں حیران ہوا کہ یہ صاحب ٹھیٹھ پنجابی میں گوری کو بلا رہے ہیں اور یہ دیکھ کر حیرانگی سے سانس رک گئی' منہ کھل گیا اور گوری مسکراتی ہوئی دکان میں داخل اور ان صاحب سے مخاطب ہوئی ''اوے بسم اللہ خواجہ جی بڑی مدت کے بعد نظر آئے ہو'' لہجہ خالص کشمیری تھا اور تلفظ میں کوئی لچک نہ تھی۔ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور میں گنگ کھڑا اس عورت کو دیکھتا رہا۔ ایک انگریز عورت کو بریڈفورڈ کے شہر میں روانی سے خالص میرپوری زبان میں پنجابی بولتے دیکھنا ایک عجوبے سے کم نہ تھا۔ کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا' خواجہ صاحب نے تعارف کرایا ''یہ میگی ہے' پورا نام مارگریٹ ہے۔ ہمارے پرانے دوست شبیر کی بیوی ہے اور دیکھا پتہ چلتا ہے کہ ابھی چک سواری سے آئی ہے'' عورت بہت زیادہ باتونی تھی۔ وہ ایک گھنٹہ دکان میں بیٹھی' خواجہ نے مجھے سنانے کیلئے اسے باتوں میں لگائے رکھا اور پھر اس سے پاکستان جانے کا قصّہ سنانے کو کہا' اور مجھے مسکرا کر کہا ''مرزا جی ذرا خود ہی میگی کی زبانی یہ کہانی سنیں کہ جب شبیر اسے تین بچے دے کر پاکستان بھاگ گیا تو میگی نے کیا کیا'' میگی کے چہرے پر چمک ابھری' اس نے سگریٹ سلگا کر لمبا سا کش لیا اور زور سے ہنسی ''یار کتنی بار سناؤں یہ قصّہ اب تو شاید بریڈفورڈ کا ہر آدمی جانتا ہے۔ ہوا یہ کہ شبیر کیساتھ میری دوستی ریڈ لائن پب میں ہوئی' میں وہاں دھندا کرتی تھی اور میرے زیادہ تر گراہک پاکستانی ہی تھے۔ بریڈفورڈ میں تم لوگوں کی آبادی دن بدن بڑھتی جارہی تھی اور ہم لڑکیوں کا کاروبار بھی زوروں پر تھا' ساری رات مصروفیت رہتی لہذا میں نے زبان سیکھنے کی کوشش شروع کردی،

تمہارے لوگ انگریزی بھی نہیں بول سکتے تھے لہذا ان کیلئے آسانی ہوگئی' میں اس وقت مطلب کے ٹوٹے پھوٹے لفظ ہی بول پاتی' پھر میں نے سوچا کسی پاکستانی کے ساتھ مستقل رہا جائے تاکہ پنجابی بولنے کا زیادہ موقع ملے تو مجھے شبیر پسند آیا اور میں اسکے ساتھ رہنے لگی۔ جس گھر میں شبیر رہتا تھا اس گھر میں چھ اور پاکستانی رہتے تھے اور میں تنہائی میں سب کی جسمانی ضرورت پوری کرتی جو پتہ لگنے پر شبیر کو بہت برا لگتا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو یہ میرا دھندا ہے اور میں اسے نہیں چھوڑ سکتی' تو وہ اپنے مشرقی جذبات سے مجبور ہو کر کہنے لگا کہ میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ دھندا چھوڑ دو۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ مجھے پیار کرنے لگا لہٰذا میں نے قسم کھائی کہ آئندہ کوئی مرد مجھے نہ چھوئے گا مگر جس روز تم نے بے وفائی کی' وہ تمہارا آخری دن ہوگا اور پھر ہم نے اپنا مکان خرید لیا۔ ہمارے تین بچے ہوئے اور زندگی بہت پیار سے گذرنے لگی اور اس تمام عرصہ میں میں نے خوب محنت کی اور پنجابی زبان مکمل سیکھ لی۔ پاکستان سے لوگوں کے بیوی بچے آنا شروع ہوگئے تھے اور پاکستانی عورتیں مجھے پنجابی بولتا دیکھ کو دانتوں سے انگلیاں کاٹ لیتی۔ آٹھ سال گذر گئے شبیر کو گھر سے خط آنے لگے کہ ملنے کیلئے آؤ۔ وہ جب انگلینڈ آیا تھا پاکستان نہ جاسکا لہٰذا اس نے چھٹیاں بک کرائیں اور پاکستان چلا گیا اور پھر اسکی چھٹیاں ختم ہوگئیں اور اسے نوکری سے برخاست کردیا گیا میرے کسی خط کا جواب نہ دیتا اسکے دوست مجھے طرح طرح کی باتیں سناتے۔ آخر میں نے ایک فیصلہ کیا بچوں کو اپنی بہن کے پاس چھوڑا' کچھ رقم دوستوں سے ادھار لی اور پاکستان جا پہنچی' وہاں خوب رونقیں تھیں۔ اس کے گھر کاغذ کی رنگ برنگ جھنڈیاں لگی ہوئیں تھیں اور دو دن بعد جناب کی شادی ہونی تھی۔ مجھے صحن میں دیکھ کر اس کی ماں چیخنے لگی اور بولی ہوئے یہ گوری کنجری یہاں بھی آپہنچی' انہیں یہ پتہ نہ تھا کہ میں ان کی زبان انہی کے لہجہ میں بولتی ہوں۔ میں نے بوڑھی کو گت سے پکڑ کر صحن میں گھمایا اور ایسی ایسی گالیاں دیں کہ فرشتے بھی گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے ہونگے۔ سارا گاؤں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ شبیر اور اس کا باپ آگے بڑھے تو میں نے دیکھا کھرلے کے پاس کپڑے دھونے کی منگلی پڑی ہے میں نے اٹھا کر ایک دو شبیر کے گھٹنوں پر لگائیں اور دو اس بوڑھے کی کمر پر جمائیں بس پھر کیا تھا سب ٹھنڈے پڑ گئے۔ گاؤں والوں کیلئے یہ ایک ایسا تماشہ تھا جو انہوں نے زندگی بھر نہ دیکھا ہوگا۔ میں غصّے میں پاگل' گالیاں بکے جارہی تھی اور منگلی ہاتھ میں پکڑ کر للکار رہی تھی مگر کس کی ہمت کہ جو آگے آتا' دوسرے دن گاؤں کے بزرگ بیٹھے' شبیر کو لعن طعن کی' مجھ سے معافی مانگی ہماری صلح کرائی۔ چند دنوں بعد میرا نکاح کیا گیا اور میں ہفتہ بھر رہ کر شبیر کو ساتھ لیکر واپس آگئی'' اس نے قہقہہ لگایا اور سگریٹ کو دیکھا جو اسکی انگلیوں میں سلگتا راکھ بن چکا تھا۔ میگی نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چونک کر خالص پوٹھواری میں کہا ''ہائے ماڑیا اللہ نگار گُٹھا شبیر ماڑے کی ڈیکنڑا ہوسی کہ کھوتی کتھے مرگئی اے' میں چُلی آں ۔۔۔ ایں ۔۔۔ میں اس دوران ایک لفظ نہ بول سکا ۔۔۔ خواجہ صاحب مجھے مسکرا کر دیکھ رہے تھے اور میں گنگ کھڑا تھا۔

بزمِ علم-و-ادب

نعت

عبدالسلام اسلام لندن

محمدؐ کی جو جبیں دیکھتے ہیں
وہ چاند اور سورج نہیں دیکھتے ہیں
جو "شق القمر" والی انگشت دیکھیں
وہ موسیٰ کی کب آستیں دیکھتے ہیں
دل ان پر تصدق ہوا چاہتا ہے
ادا ان کی ہر دلنشیں دیکھتے ہیں
مرا مصطفیٰ بڑھ گیا نوریوں سے
بصد رشک رُوح الامیں دیکھتے ہیں
ادھر تخت دل پر وہ ہیں جلوہ فرما
کھڑے ہیں جو اس در پہ پھیلا کے دامن
وہ دامن میں دنیا و دیں دیکھتے ہیں
مرادل ہے خوشی سے بلیوں اُچھلتا
وہ جب مرا قلب حزیں دیکھتے ہیں
اگر بچ گیا ہوں میں ان کی نظر میں
تو پھر کیوں مجھے نکتہ چیں دیکھتے ہیں

مبارک احمد

تلاش و جستجو گر کوُ بہ کوُ ہو
تجھے حاصل وہ یار خو برو ہو
وہ کافر تھا کہ جو انکار کرے
مے و مطرب ہو اور جام و سبو ہو
تجھے خود سے حجاب آئے اگر تو
گھڑی بھر آئینے کے رُوبرو ہو
جوانا! سرخ رُو دنیا میں ہوگا
اگر علم و ہنر کی جستجو ہو
سرِ مے خانہ ساقی مہرباں ہو
تو پھر رندوں میں برپا ہاؤ ہو
وہی محفل رہے گی رونقوں پر
ہاں جلوہ نما اے شوخ! تو ہو
یہی ہے باصفا رندوں کی محفل
وہی آسکتا ہے جو باوضو ہو
غزل تیری الاپے اے مبارکؔ
وہی مطرب جو سب میخوش گلو ہو

سلیم شاہ جہانپوری

جوش جنوں میں بک جاتے ہیں کیا کچھ دیوانے لوگ
آپ ہماری بات نہ مانیں آپ تو ہیں فرزانے لوگ
حق حق کرتے کرتے ہیں شہر میں جب متانے لوگ
چارطرف سے آجاتے ہیں نیزے بھالے تانے لوگ
بستی بستی پھیل گئے ہیں ہر جانب فرزانے لوگ
صحرا میں بھی کوئی نہیں ہے کدھر گئے فرزانے لوگ
کتنی کڑوی لگتی ہے اس دور میں حق کی بات
اپنے بھی تو آجاتے ہیں سینہ ودل برمانے لوگ
حق کی بات نکالو منہ سے پھر دیکھو تیور ان کے
کتنے انجام لگتے ہیں یہ جانے پہنچانے لوگ

عاصی صحرائی لندن

عشق جب سے ہوا ہے ایمان میرا
دشمن تب سے ہوا ہے جہان میرا
بند ہوا در قفس جب سے
ہر پرندہ ہوا ہے پریشان میرا
میں نے رقیب کو پھول بھیجے تھے
تب سے شروع ہوا ہے نقصان میرا
جوزمان و مکان سے باہر ہے
وہی ایزد وہی ہے یزدان میرا
دوستوں سے بے جا توقع کرتا رہتا ہوں
اسی لئے آج دل ہوا ہے پریشان میرا
بات کو جتنا بھی انسان اہم کردے
پھر بھی بالا ہوا ہے کلام رحمان میرا
عاصیؔ ذکرِ خدا میں ہے برکت
ورنہ میں کیا اور کیا ہے دیوان میرا

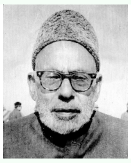

روشن دین تنویر مرحوم

ایک کعبہ کروڑوں بت خانے
اک حقیقت کروڑوں افسانے
وحی حق کے بغیر علم کہاں
عقل بے چاری اس کو کیا جانے
شمع جب تک نہ خود جلے پہلے
جلنے آتے نہیں ہیں پروانے

ہے بگولوں سے خیر مقدم قیس
ناچ اُٹھے خوشی سے ویرانے
جان مردوں میں ڈال کر تنویر
کر دیا جاوداں مسیحا نے

لئیق عابد پاکستان

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا لکھوں
سبھی اوصاف کا مظہر، تو ہے یکتا لکھوں
تیری آمد سے گلستانِ نبوت میں بہاریں
گل کہہ کے پکاروں لالہ لکھوں
نام آجائے غلامانِ محمدؐ میں میرا
مجھ سے پوچھو تو یہی حرف تمنا لکھوں
نقش درنقش تیرے حسن کے جلوے دیکھوں
عکس درعکس تیرا چاند اُبھرتا دیکھوں
تیر ہر ایک لیا ہاتھ پہ اور اُف نہ کہا
تیرے عشاق میں اک نام میں طلحہ لکھوں
چشم عاشق میں چھلکتا ہوا اک سبز سا رنگ
میں جو دیکھوں تو اسے تو گنبد خضرا لکھوں
مجھ کو جس لمحہ میں ہو آپ کا دیدار نصیب
زندگانی کا میں حاصل وہی لمحہ لکھوں
تو ہی اول تو ہی آخر تو ہی مقصودِ حیات
تیری چاہت ہی کو میں روح کا سجدہ لکھوں
تیری ہر جنبش لب وحی الہٰی پیارے
تو جو بولے تو اسے وحی یوحیٰ لکھوں
تیری مدحت میں کروں وقف میں اپنے اشعار
میں جو لکھوں تو فقط تیرا قصیدہ لکھوں
سارا عالم ہے تیرا چاہنے والا لیکن
میں تو آقا تجھے اپنا، فقط اپنا لکھوں

اکرم ثاقب کنیڈا

دل سمندر تھا تو آنکھیں تھیں بیاباں کوئی
ایسے رستے میں ملا جیسے ہو انجان کوئی
رات آئے تھے زمانے میری دہلیزوں پر
صبح کو چھوڑ گیا بے سر و ساماں کوئی
میری وسعت ہے میری آنکھ تلک اس کے بعد
ایک ہجرت پہ لکھی ہے میری پہچان کوئی
لشکر شام ہے اور ہاتھ ہیں خالی میرے
دَشتِ تنہا میں کھلا دیدہ حیران کوئی
چاند نکلا بھی نہیں رات کے سناٹے میں
دل بہلنے کا بھی اب کے نہیں امکان کوئی
ڈھل گئے شام دریچوں سے پرے ثاقب جی
پھر سے اُبھرے گا میرے دل میں بیابان کوئی

ڈاکٹر فرزانہ فرحت

درد میں ڈوبے ہوئے میرے مہ و سال نہ دیکھ
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں مرا حال نہ دیکھ
تو جو دیکھے گا نجومی تو اُلجھ جائے گا
میری قسمت کے ستاروں کی ابھی چال نہ دیکھ
دیکھ اس دل کا یہ بے رنگ سا پھیکا موسم
میں نے اوڑھی ہے جو رنگوں بھری وہ شال نہ دیکھ
گر مرے دل میں ہے رنجش تو بیاں کر مجھ سے
میرے اس شیشۂ دل میں تو کوئی بال نہ دیکھ
میں خطا کار ہوں، لاچار ہوں، کمزور بھی ہوں
میرے مولا! تو مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
دیکھ صیّاد پرندوں کی تو اونچی پرواز
قید کرنے کو انہیں کوئی حسیں جال نہ دیکھ
میرے پیروں میں تو کانٹے ہی چبھے ہیں فرحتؔ
میرے اس باغ کی پھولوں بھری تو ڈال نہ دیکھ

محمد اسحاق اطہرؔ جرمنی

ہے نہیں فریاد لب پہ عاشق بیتاب کے
کچھ نہ سن پاؤ گے منہ سے عشق میں غرقاب کے
مصلحت کے بند بھی باندھے اگر عقل سلیم
یہ نہیں ٹھہرے گی آگے عشق کے سیلاب کے
کچھ خبر تجھ کو ہے عاقل کہ ہے یہ عشق کیا
عقل آجاتی ہے عاجز سامنے گرداب کے
پھول پر سرسوں کے ہمیں لگتے ہیں اچھے اسلئے
یاد آجاتے ہیں نظارے ہمیں پنجاب کے
اپنی کس خوبی ہی اترا رہے ہو ہر گھڑی
کونسے ہیں پر لگے اطہرؔ تمہیں سرخاب کے
ٹھیکہ لیا ہے دین کی تبلیغ کا مگر
اہلبیت کے نام کراتا ہے مولوی
چربی چڑھی ہے دیکھئے گردن پہ تہہ بہ تہہ
ملت کے غم میں پھولتا جاتا ہے مولوی
بارہ وفات ہو کہ محرم کا چاند ہو
سیزن مین دام اپنے بڑھاتا ہے مولوی
ہاشم خدا گواہ بساط حیات پر
دست اجل کی شکل میں آتا ہے مولوی

مسعود چوہدری جرمنی

وہ سوز و ساز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
مری آواز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
محبت جس سے زندہ ہو، مٹا دے نفرتوں کو جو
وہی انداز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے

میں شاہیں ہوں عدو صیّاد سے میرا تخاطب ہے
مری پرواز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
مقابل آ گیا ہوں سامری زادوں کے پھر سے میں
مرا اعجاز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
مجھے بھی سر اُٹھا کر چلنا ہے بزمِ نگاروں میں
مرے وہ ناز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
عذاب جہاں نہ بن جائے یہ میری دشتِ تنہائی
مرا دمساز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
ستارے تو سجا بیٹھے ہیں محفل کہکشاؤں کی
مرا مہ ناز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے
مرے اندر تلاطم ہے بپا مسعودؔ رازوں کا
مرا ہمراز واپس دو، مجھے بھی بات کرنی ہے

عاصی صحرائی لندن

ہے قیامت کا اندھیرا اور محشر تیرگی
جل گیا سارا جہاں پہنچی ہے گھر گھر تیرگی
چار شو ہے کفر کی تیرگی آتی نظر
شرک ہے، الحاد ہے اور ہے یہی شر تیرگی
ہے پرستش مادیت کی، چار جانب ہے یہی
روشنی دیکھی جہاں اب اس ہی در پر تیرگی
ناخدا سب معبدوں کے ہر جگہ مدہوش ہیں
انکے جذبوں میں اُتر آئی سراسر تیرگی
ہے عجم بھی اور عرب بھی نور کو ترسے ہوئے
نور آتا ہے تو کہتے ہیں کہ بہتر تیرگی
رات بھر طیور تلاش روشنی کرتی رہے
ہوگئی سورج کے آنے سے منور تیرگی
ہے زمین و آسماں میں نور سب اللہ کا
اس سے مٹتی ہے زمانے میں برابر تیرگی
نور کی قندیل لے کر پیر عاصیؔ آ گئے
اب تو بھاگی جا رہی ہے جوتھی اندر تیرگی

سلیم کوثر مرحوم

تم نے سچ بولنے کی جرأت کی
یہ بھی توہین ہے، عدالت کی
منزلیں راستوں کی دھول ہوئیں
پوچھتے کیا ہو تم، مسافت کی
اپنا زادِ سفر بھی، چھوڑ گئے
جانے والوں نے کتنی عجلت کی
میں جہاں قتل ہو رہا ہوں وہا ں
میرے اجداد نے، حکومت کی
پہلے مجھ سے جدا ہوا اور پھر
عکس نے، آئینے سے ہجرت کی
میری آنکھوں پہ اس نے ہاتھ رکھا
اور اک خواب کی، مہورت کی
اتنا مشکل نہیں، تجھے پانا
اک گھڑی چاہیے ہے فرصت کی
ہم نے تو، خود سے انتقام لیا
تم نے کیا سوچ کر محبت کی
کون، کس کیلئے تباہ ہوا؟
کیا ضرورت ہے اس وضاحت کی
عشق جس سے نہ ہوسکا، اس نے
شاعری میں، عجب سیاست کی
یاد آئی تو ہوئی شناخت، مگر
انتہا ہوگئی ہے، غفلت کی
ہم وہاں، پہلے رہ چکے ہیں سلیم
تم نے جس دل میں اب سکونت کی

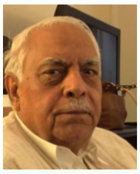

عبدالشکور کلیولینڈ

یہ رنگ کیسا شفق میں سمویا، دیکھو تو
یہ لعل کیسا دھنک میں پرویا دیکھو تو
یہ رنگ بد اماں حسین ابنِ علی
یہ لعل، لعل بدخشاں حسین ابنِ علی
یہ رنگ درد کی سوغات ساتھ لایا ہے
لُٹی لُٹی ہوئی اک کائنات لایا ہے
وہ کائنات سمٹ آئی کربلا میں آج
کہ بولتا ہے لہو اس کی ہر ادا میں آج
لہو جو اصغر بے شیر کے گلو میں ہے
لہو جو سجدِ شبیر کے وضو میں ہے

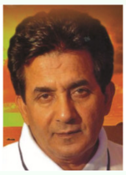

بشارت احمد بشارت

عشق کے امتحان دیکھے ہیں
چاہتوں کے جہان دیکھے ہیں
کہکشاؤں سے چاند تاروں پر
ہوتے ہر روز دان دیکھے ہیں
قہقہے گونجتے جہاں دیکھے
وہیں رہتے مکاں دیکھے ہیں
نفرتیں کھا نہ جائیں دور مرا
بڑھتی جنگ کیفشان دیکھے ہیں
عقل انسان مرگئی شائد
لڑتے انسان حیواں دیکھے ہیں
ٹینک توپیں اور ایٹمی گیسیں
اس ترقی کے دان دیکھے ہیں
آگے اب راستہ نہیں کوئی
موت کے سائبان دیکھے ہیں

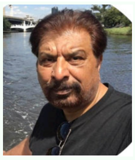

ناصر جمیل امریکہ

ادھورے لمحے کی ایک ادھوری نظم

راتوں میں ایک رات تھی
پورے چاند کی رات تھی
چاندنی نہ تھی کہیں
چاندنی کا احساس تھا
لمحہ پگھلتی ہوئی
ہاتھوں سے پھسلتی رات تھی
خشک ہونٹوں پہ جمی ہوئی
جنم جنم کی پیاس تھی
خیالوں میں گم کہیں
وہ دور تھی نہ پاس تھی
دیہان کے آتش دان میں
زرد پتوں کا ڈھیر تھا
جو دل کو چھو کے گزر گئی
وہ گئے دنوں کی بات تھی

ڈاکٹر ابرار احمد مرحوم

راہ دشوار بھی ہے، بے سر و سامانی بھی
اور اس دل کو ہے کچھ اور پریشانی بھی
یہ جو منظر ترے آگے سے سرکتا ہی نہیں
اس میں شامل ہے تری آنکھ کی حیرانی بھی
صرف افسوس کا سایہ ہی نہیں ہے ہم پر
ہم کہ ہیں خواب تب و تاب کے زندانی بھی
اپنے مجبور پہ کچھ اور کرم ہو کہ اسے
کم پڑی جاتی ہے اب غم کی فراوانی بھی
رہ تری چھوڑ کے کیوں جانب دنیا آ
ہم کو جینے نہیں دیتی یہ پشیمانی بھی
بے نیازی کی وہ خو جیسے کبھی تھی ہی نہیں
خواب تھے جیسے وہ ایام تن آسانی بھی

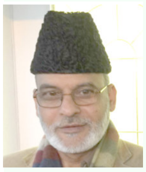

مبارک ظفر لندن

مان نہ کریں پناہواں دا
زور اے اپنی باہواں دا
رہندا پانی دے وچ وی
حقہ خشک ملاحواں دا
سر منہ جس تھیں بگا اے
او گھٹا اے راہواں دا
بلبلے توں وی نازک اے
کیہ بھروسہ ساہواں دا
اکھیں ڈٹھا اساں ظفر
تختہ ہندا شاہواں دا

مبشر احمد راجیکی مرحوم

اے چشمہ حیواں آ بھی جا
اے روضہ رضواں آ بھی جا
اے رحمت باری تھام بھی لے
اے نصرت یزداں آ بھی جا
اے باد بہاری تیز بھی چل
اے بوئے گلستاں آ بھی جا
اے رونقِ یثرب دیر نہ کر
اے نازش فاراں آ بھی جا
اے داورِ محشر بھیج بھی دے
اے ہادی دوراں آ بھی جا
یہ اشک آہ ہیں تیرے لئے
ہم دیدہ براہ ہیں تیرے لئے

ناصر احمد سید مرحوم

ہماری دھڑکنیں پرواز پر ہیں
تمہاری اُنگلیاں کس ساز پر ہیں
بیاں اس کشف کو کیسے کروں میں
بہت سی بندشیں الفاظ پر ہیں
تماشے سے اُٹھا لی ہیں نگاہیں
نگاہیں اب تماشہ ساز پر ہیں
نہیں بجھتے چراغ اُس آدمی کے
ہوائیں دم بخود اس راز پر ہیں
قیامت خیز رفتاریں ہیں اُس کی
قدم ہر پل کسی اعجاز پر ہیں
شہادت دے رہا ہے ہر نیا دن
یہ دل لبیک اک آواز پر ہیں

بشارت ریحان کنیڈا

دیکھا میں نے ہر طرف کو نامہ بر کوئی نہ تھا
ما سِوا میرے، وہاں پر دیدہ تر کوئی نہ تھا
لمبے چوڑے سلسلے تھے یوں تو کائنات کے
اس بھری دنیا میں لیکن اصلی گھر کوئی نہ تھا
جل رہا تھا کب سے میں اس چلچلاتی دھوپ میں
مجھ پہ سایہ کرتا جو ایسا شجر کوئی نہ تھا
میں تو ہوتا ہی رہا قربان سب کے واسطے
جب کبھی مشکل بنی میرا مگر کوئی نہ تھا
جس طرف بھی دیکھا میں نے دیکھتا ہی رہ گیا
سب ہنر والے تھے، مجھ سا بے ہنر کوئی نہ تھا

چپہ چپہ چھان مارا سر جھکانے کو ریحانؔ
جتنا عالی ان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا در ہے، ایسا در کوئی نہ تھا

انصر رضا کنیڈا

ہیں ان کی آنکھوں سے مدہوش سب شراب سے کم
جہاں میں روشنی اس سے ہے افتاب سے کم
مرے طبیب کچھ ایسی کرو مسیحائی
کہ مجھ کو چین ملے لیکن اضطراب سے کم
مری کتاب حیات اس کے نام سے منسوب
گو داستاں ہے مری لیکن انتساب سے کم
میں کاروبارِ محبت میں سرخرو ہی رہا
اگر چہ کھویا زیادہ ہے دستیاب سے کم
گو چاہتا تھا مجھے، پر تھا خوفِ رسوائی
وہ مجھ سے ملتا رہا لیکن اجتناب سے کم
مجھے ہی جرمِ محبت پر کیوں ملے تعزیر
اسیر عشق تھا میں بھی پر آنجناب سے کم
رضاؔ ہے دید کا مشتاق اور کچھ بھی نہیں
کرم سے دیکھتے رہیے اسے عتاب سے کم

اعظم نوید

نفرتوں کی آگ ہر سو چُھپ کے بھڑکائی گئی
پابجولاں زیست دیواروں میں چُنوائی گئی
ایک زندہ نعش کی صُورت ہے سارا یہ جہاں
ظُلم پر بھی چُپ ہیں رہتے جیسے گویائی گئی
جن کی فطرت میں تھا ڈسنا ہر گھڑی ڈستے رہے
پھر قُرونِ اُولیٰ کی تاریخ دُہرائی گئی
عُمر بھر کی چاہتوں کا ہے صِلہ کس کو مِلا
ہجر میں رو رو کے آنکھوں کی ہے بینائی گئی
فاصلے صدیوں کے کاٹے تو خبر دل کو ہوئی
ذات جس کی جستجو تھی دل میں ہے پائی گئی
ایک جاہل کی جہالت نے اُجاڑی فصلِ گُل
سائے کی صورت ہمارے ساتھ رُسوائی گئی
شرم کا پیکر اسے کہتے بھی شرماتا ہے دل
بے حجابی جس کے سینے میں ہے دفنائی گئی
بے بسی نے کر دیئے مسدود سارے راستے
زندگی کے باب سے ساری ہے رعنائی گئی
صندلی ہاتھوں پہ قُدرت نے نہ جانے کیا لکھا
مرتے دَم تک ساتھ اپنے غم کی شہنائی گئی
اک کرونا سے ہوئیں سب طاقتیں زیروزبر
ان کی نخوت خوب قدرت سے ہے پٹوائی گئی
آگئی ہیں راس اعظمؔ دل کو بھی ویرانیاں
جس جگہ بھی ہم گئے ہیں ساتھ تنہائی گئی

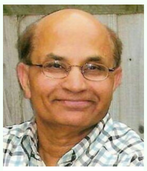

طاہر مجید

اب تک میری نگاہ میں کوئی بسا نہ تھا
میں جس کو ڈھونڈتا تھا وہ تیرے سوا نہ تھا
کیا ہے وفا نا آشنا یہ طرز گفتگو
جو تو نے کہہ دیا ہے کسی نے کہا نہ تھا
میں اس سے شکوہ سنج تھا وہ مجھ سے بدگماں
اس کشمکش میں پیار کا کوئی مزا نہ تھا
اک میں تجھ کو سمجھا کیا روح زندگی
اک تو کہ اس طرح سے کبھی سوچتا نہ تھا
یوں اجنبی نظر سے مجھے دیکھتے ہو تم
جیسے جہاں میں کوئی کسی کا ہوا نہ تھا
بے تابیوں کی گود میں کتنا اداس ہوں
میں نے بھی دل کسی کو کو یہ اب تک دیا نہ تھا
دل سے مجھے اتار لیکن یہ یاد رکھ
دنیا تجھے کہے گی کہ طاہر برا نہ تھا

شائق نصیر پوری،

دھڑکنِ دل سے ہے اُبھری ایک آشا غور کر
عشق میں کرتا لہو بھی ہے تماشہ غور کر
دِل شِکستہ نفرتوں کی ہر زباں کو بھول کر
بولتا میرا قلم ہے امن بھاشا غور کر
ہے مِرے افکار کا کندھوں پہ بارِ زندگی
آپ کو لگتا ہے یہ ہی رتی ماشہ غور کر
پیٹ بھرنے کو تو شیر وشکر اب ہیں بے بہا
بچپنے کی یاد میں ٹوٹا پتاشہ غور کر
خون میں لت پت ہوا دستور میرے دیس کا
ہے سیاست نے اسے کیسے تراشا غور کر
آدم وحوا نے کھایا جو ثمر اک بھول سے
اُس ثمر کا ہم بھی کھائیں روز قاشہ غور کر
پٹ گیا مفہومِ ذلت سے وہ شائقؔ بے گناہ
پھر رہا ہے خود اُٹھائے اپنا لاشہ غور کر

شاہینہ کشور

زمیں کا لقمہ بنیں گے سارے
ازل سے اُلجھے ابد کیتارے
خدا کی مرضی پہ جینے والے
جئیں گے کب تک بتا اے پیارے
نظر نظاروں سے بھاگتی ہے
خود اپنی قسمت سے جب ہارے
سناؤ کوئی تو شعر ایسا
جو میرے من کی تھکن اُتارے
تری محبت، ہوس ہے گویا
جو مرچکی ہے بدن کنارے

مری محبت کو پالے کشور
اگر تو سمجھے مرے اشارے

عظمیٰ محمود

نشان ہے یہ مرے بے نشان ہونے کا
غبار ہے جو پسِ کارواں اداسی کا
نہ جانے کیوں مری آنکھیں بھگو گیا عظمیٰ
کس چراغ سے اٹھتا دھواں اداسی کا
زمیں اداسی کی اور آسماں اداسی کا
ٹھہر گیا ہے یہاں پر سماں اداسی کا
کسی کیبس میں نہیں تھا بیاں اداسی کا
نہیں تھا کوئی یہاں ترجماں اداسی کا
جو ہو سکے تو مرے چارہ گر بتا مجھ کو
کوئی علاج مری بے کراں اداسی کا
میں سوچتی ہوں مگر کچھ سمجھ نہیں آتا
کوئی جواز مری رائیگاں اداسی کا

فارغ بخاری

کچی کلیاں پکی فصلیں سر چھپائیں گی کہاں
آگ شہروں کی لپک کر آ رہی ہے گاؤں میں
زخم نظارہ ہیں جسموں کی برہنہ ٹہنیاں
دو گھڑی بیٹھے تھے زُلفِ عنبریں کی چھاؤں میں
چبھ گیا کانٹا دلِ حسرت زدہ کے پاؤں میں
کم نہیں ہیں جب کہ شہروں میں بھی کچھ ویرانیاں
کس توقع پر کوئی جائے گا اب صحراؤں میں
ایسے پت جھڑ میں کھلیں گے پھول کیا آشناؤں میں
کیا کہوں طول شبِ غم پل میں صدیاں ڈھل گئیں
وقت یوں گزرا کہ جیسے آبلے ہوں پاؤں میں
حسن کے دیکھے ہیں ہم نے ماہتابی روپ بھی
لیکن ایسی سانولی خوشبو کہاں سلماؤں میں
زندگی میں ایسی کچھ طغیانیاں آتی رہیں
بہہ گئی ہیں عمر بھر کی نیکیاں دریاؤں میں
اے خدائے فصلِ گل، آخر یہ کیا اندھیرا ہے
خارگلزاروں میں پھوٹیں، گل کھلیں صحراؤں میں
جلتے موسم میں کوئی فارغ نظر آتا نہیں
ڈوبتا جاتا ہے ہر اک پیڑ اپنی چھاؤں میں

انیس احمد نفیس

میں اپنی دوستی کو شہر میں رسوا نہیں کرتا
محبت میں بھی کرتا ہوں مگر چرچا نہیں کرتا
جو مجھے ملنے آئے میں اس کا خادم ہوں
جو اُٹھ کر جانا چاہے میں اسے روکا نہیں کرتا
جسے میں چھوڑ دیتا ہوں اسے پھر بھول جاتا ہوں
پھر اس ہستی کی جانب میں کبھی دیکھا نہیں کرتا
تیرا اصرار سر آنکھوں پر کہ تم کو بھول جاؤں میں
میں کوشش کر کے دیکھوں گا مگر وعدہ نہیں کرتا

حنیف تمنا

جنوں کو بھی شعور آگہی ہے
محبت آج دیوانی نہیں ہے
پشیمانِ جفا ہو بھی تو کیوں کر
وہ جس کی آنکھ میں پانی نہیں ہے
وہ ہر جائی ہے، دنیا کہہ رہی ہے
یہ میری عقل میں آنی نہیں ہے
کرے اب کون تجدید محبت
کہ اب جذبوں کی ارزانی نہیں ہے

ڈاکٹر محمد عامر خان

اگر آ گئے ہم ذرا لہر میں
غزل ایک لکھیں گے اس بحر میں
تو اشکوں سے اس کو بجھاتا ہے کیا
عجب آگ ہے ہر طرف دہر میں
صداقت نہ جانے کہاں کھو گئی
کوئی ہم سا پاگل نہیں شہر میں
اٹھا کر جو لائے ہو جذبوں کی لاش
بہا دو اسے یاس کی نہر میں
نہ گھائل کرو نفس کی اونٹنی
خدا آ نہ جائے کہیں قہر میں
طلب ہے ہمیں تو فقط نور کی
نہیں فرق کوئی مہ ومہر میں
یہ دیکھو کہ عامر تو زندہ ہے آج
ملاوٹ سی لگتی ہے کچھ زہر میں

آفتاب احمد اختر

عشق بھی نماز ہے اس کا بھی قیام کر
بندگی میں ہو سکے تو رفعتِ مقام کرو
ذکر یار سے ملے لذت سجود بھی
لفظ باوضو رہیں ایسا اہتمام کر
خواہش گناہ بھی ناموجبِ سرور ہوں
حیات آفرین ہوں وہ عمل شاد کام کر
یہ کیفیت اضطراب یہ تشنگی روح کی
علاج درد و ہجر بھی نہ طشت ازبام کر
پانچ وقت کیلئے جو میکدہ کھلا تو کیا
دل کو میکدہ بنا رات دن قیام کر

لاکھ بندشوں میں جب شرابِ وصل مل سکے
بھیڑ بھاڑ سے نکل، خود اپنا انتظام کر
تیرے نام سے اگر جہاں یہ ناشناس ہے
اپنے اس کلام سے جہاں میں خاص نام کر
یہ معاملے دل ونظر کے جس سے ہیں جڑے ہوئے
جو ہو سکے تو آفتاب تو اس کو ہم کلام کر

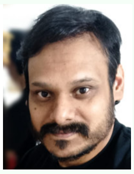

طاہر احمد، فن لینڈ

اس محبت کے صدقے کسی نے اتارے نہیں لگتے
شکستہ حال سفینے یوں ہی کنارے نہیں لگتے
کترا کے گزرتے ہو مجھ سے جو کبھی یوں
کچھ غیر سے لگتے ہو ہمارے نہیں لگتے
یہ منصف بھی تیری محبت کا لگتا ہے وکیل
اقرار پر بھی جس کو جرائم تمہارے نہیں لگتے
کہتے تو ہیں رو رو کے گزاری ہے شب ہجر
چہرے مگر شب غم میں گزارے نہیں لگتے
اس شہر تمنا میں ہیں تیری وفاؤں کے چرچے
سچ پوچھو تو وہ قصے تمہارے نہیں لگتے
وہ جو لوٹ کے آئے ہیں میرے آنگن میں دوبارہ
تھی داماں پکھیرو تیرے سدھارے نہیں لگتے
اُجڑی سی بستی میں بے حال سے پھرتے ہیں
کیوں اچھے تجھے طاہر یہ نظارے نہیں لگتے

سید طاہر احمد زاہد

وہ ہمارا بھی ہو نہیں سکتا
یوں گزارا بھی ہو نہیں سکتا
عشق ایسا ہے باخدا تجھ سے
اب کنارا بھی ہو نہیں سکتا
سحر طاری ہے تیری محفل پر
اک اشارا بھی ہو نہیں سکتا
جس نے اپنوں کا دل دکھایا ہو
وہ تمہارا بھی ہو نہیں سکتا
وہ نہ چاہے تو سارے امبر پر
اک ستارا بھی ہو نہیں سکتا
مجھ سے زاہد کہا طبیبوں نے
کچھ تمہارا بھی ہو نہیں سکتا

ایم۔ مبرور

اُلجھے معاملات کو یوں حل کیا گیا
آنکھوں کو جھیل روح کو بادل کیا گیا
دھرتی پہ اک سماج بسانے کے واسطے
جنگل کو شہر، شہر کو جنگل کیا گیا
اے حسنِ ناشناس ادھورا تھا ایک عمر
دیکھا تجھے تو شعر مکمل کیا گیا
پتھر کسی غریب پر برسائے اس قدر
عاشق مزاج شخص کو پاگل کیا گیا

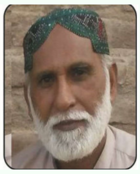

امین اوڈیرائی

ملے دکھ دے کے آزمایا گیا
پھر مجھے تخت پر بٹھایا گیا
موت رکھی گئی ہتھیلی پر
زیست کا خواب بھی دکھایا گیا
اپنا چہرہ نا بھول جائے کوئی
اس لیئے آئینہ بنایا گیا
ایک بھی غم تیری جدائی کا
جو نہیں آنکھ سے بہایا گیا

ڈاکٹر نکہت افتخار

اس کا معمول ہے ہر روز شکایت صاحب
مجھ پہ لازم ہے کہ دینی ہے وضاحت صاحب
آسمانوں کو مرے چھین لیا، اس کے عوض
دی گئی ہے مجھے اک چھت کی سہولت صاحب
ہائے زنداں کی گھٹن میں ترا احساں مجھ پر
سانس لینے کی مجھے دے دی اجازت صاحب
دھوپ برسات سے پھیکے نہیں ہونگے ہرگز
اپنے رنگوں کی میں دیتی ہوں ضمانت صاحب
جنگ جیتی ہے انا کی سو وہ مسرور پھرے
میں بھی دفنانے کو بیٹھی ہوں محبت صاحب
میں منافق تو بہر حال نہیں ہو سکتی
جب نہ ایمان رہا، کیسی اطاعت صاحب
تم میں دم ہے تو کرو ختم تعلق مجھ سے
کر رہی ہوں میں سرِ محفل بغاوت صاحب

شعیب ناصر کنیڈا

تمہاری یاد تمہارا دھیان رکھتے ہیں
کڑی ہے دھوپ مگر سائبان رکھتے ہیں
خدا کرے کے انہیں اذن گفتگو مل جائے
ترے دیوانے بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
ہوا سے کہہ دو سنبھل کر چلے ہماری طرف
ہم اہل عشق ارادے جوان رکھتے ہیں
امیرِ شہر ہو یا ہو فقیہہ شہرِ طرب
ترے فقیر ہتھیلی پہ جان رکھتے ہیں
ہوا سے دشتِ طلب میں ہیں معرکہ آرا
ہوا کے دیپ عجب آن بان رکھتے ہیں

تم اپنے جال میں پھانسو گے کس طرح ناصرؔ
پرند سارے ہی اونچی اُڑان رکھتے ہیں

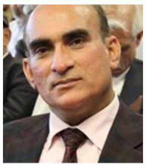

شفیق مراد۔ جرمنی

خمارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
میں کائنات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
تمھاری بات کے چکر میں پھنس گیا ہوں میں
تمھاری بات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
تمھارے حُسن کی اور عشق کی حقیقت کیا
جمالیات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
میں اس کے ہاتھ کی الجھی لکیر میں ہوں کہیں
میں اس کے ہاتھ سے باہر نکل کے دیکھوں گا
سنا ہے ہجر کی لذت عجیب لذت ہے
ملن کی رات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
چھپا ہوا ہوں ابھی تک میں اس کے لہجے میں
کبھی تو بات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
قدم قدم پہ فتوحات رقص میں ہونگی
جب اپنی مات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
بغیر فکر کے گزرے گی زندگی اپنی
لوازمات سے باہر نکل کے دیکھوں گا
میں دل کی بات اسے برملا کہوں گا مرادؔ
تکلفات سے باہر نکل کے دیکھوں گا

سر ابنِ انشاء مرحوم

ٹھہری ٹھہری ہوئی طبیعت میں روانی آئی
آج پھر یاد محبت کی کہانی آئی
آج پھر نیند کو آنکھوں سے بچھڑتے دیکھا
آج پھر یاد کوئی چوٹ پرانی آئی
مدّتوں بعد چلا اُن پہ ہمارا جادو
مدّتوں بعد ہمیں بات بنانی آئی
مدّتوں بعد پشیماں ہوا دریا ہم سے
مدّتوں بعد ہمیں پیاس چُھپانی آئی
مدّتوں بعد کھُلی وسعتِ صحرا ہم پر
مدّتوں بعد ہمیں خاک اُڑانی آئی
مدّتوں بعد میسر ہوا ماں کا آنچل
مدّتوں بعد ہمیں نیند سُہانی آئی
اتنی آسانی سے ملتی نہیں فن کی دولت
ڈھل گئی عمر تو غزلوں پہ جوانی آئی

چل انشاء اپنے گاؤں میں
یہاں اُلجھے اُلجھے رُوپ بہت
پر اصلی کم، بہرُوپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رُکنا
جہاں سایہ کم ہو، دُھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سُکھ کی چھاؤں میں
کیوں تیری آنکھ سوالی ہے؟
یہاں ہر اِک بات نرالی ہے
اِس دیس بسیرا مت کرنا
یہاں مُفلس ہونا گالی ہے
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سُکھ کی چھاؤں میں
جہاں سچے رشتے یاریوں کے
جہاں گھونگھٹ زیور ناریوں کے
جہاں جھرنے کومل سُکھ والے
جہاں ساز بجیں بن تاروں کے
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سُکھ کی چھاؤں میں

سلیم فگار لندن

بدن کی آگ پہ ہاتھوں کو تاپنے کے لئے
پڑی ہوئی ہے رات ابھی جاگنے کے لئے
چلا رہا ہے کوئی تیز دھار لمحوں کو
ہماری عمر کی رسی کو کاٹنے کیلئے
ہوا کے دوش پہ رکھنے پڑیں گے پاؤں مجھے
زمیں کی قید سے اک روز بھاگنے کیلئے
لہو کے شور میں خاموشیوں کے بین سنے
کسے ہیں فرصتیں اس دل میں جھانکنے کیلئے
میں اپنی آنکھ کا کاسہ اُٹھا کے لایا ہوں
سیاہ رات سے اک خواب مانگنے کیلئے

ہاشم رضا ہاشم

پگڑی اُچھالنے سے بھی کرتا نہیں گریز
آداب زندگی بھی سکھاتا ہے مولوی
سجدوں کا ہے جبیں پہ نشاں دل مگر سیاہ
ڈرتا نہیں خدا سے ڈراتا ہے مولوی
روشن چراغ کرتا ہے اندھوں کے سامنے
اہلِ نظر سے آنکھ چراتا ہے مولوی
کرتا دین فروخت فتاویٰ کی شکل میں
انسانیت کا منہ بھی چڑاتا ہے مولوی
واعظ کی شکل میں کبھی ناصح کے روپ میں
دیوار بن کے راہ میں آتا ہے مولوی

جمشید مسرور ناروے

دور کھڑا ہے دشت میں ایک شجر لگا ہوا
جیسے فصیل شہر سے شہر بدر لگا ہوا

سوز سے یوں نڈھال ہے زخم جگر لگا ہوا
جیسے زمیں پہ درد سے خواب کا سر لگا ہوا
شعبدہ باز لوگ ہیں چشم زدن میں کیا ہوئے
خاک پہ دھڑ پڑا ہوا پیڑ پہ سر لگا ہوا
ملتے ہیں روز شہر میں چند مزین آدمی
خوک کی دم لگی ہوئی بوم کا پر لگا ہوا
جانے کدھر سے ہوکے آج موج خیال آئی ہے
چوٹ اُدھر لگی ہوئی زخم ادھر لگا ہوا
خاک پہ ہوکہ طاق پر پھول کی وہ جگہ نہیں
جیسے مقام پر نہیں نیزے پہ سر لگا ہوا
خود سے ہی اختلاف تھا بات بھی ایسی کچھ نہ تھی
اور اسی ایک بات کا مجھ کو ڈر لگا ہوا

شازیہ عالم شازی

دل بہت اداس ہے اور وہ بھی آج کل
جانے کس کے پاس ہے اور وہ بھی آج کل
جس کا وصل تھا کبھی خواب سے کہیں حسیں
اس کا ہجر راس ہے اور وہ بھی آج کل
عام سا دکھائی وہ دے رہا تھا ہائے جو
ہر نظر میں خاص ہے اور وہ بھی آج کل
مسکرا کے گزرا ہے کون شہر درد سے
پتھروں میں باس ہے اور وہ بھی آج کل
یاد کے گلاب کچھ کھل رہے ہیں اس طرح
مشکبو لباس ہے اور وہ بھی آج کل
جلد لوٹ آتے ہیں چھوڑ کر جو جاتے ہیں
یہ بھی اک قیاس ہے اور وہ بھی آج کل

اختر چیمہ۔سیالکوٹ

جو ہوسکے تو مجھ سے ملنے آ سیالکوٹ میں
کہ چل رہی ہے پیار کی ہوا سیالکوٹ میں
ترے لبوں کی نغمگی ہے سوز و ساز زندگی
محبتوں بھرے ترانے گا سیالکوٹ میں
تری نظر کے ساگروں میں ڈوبنے کا شوق ہے
قدم سے بس قدم کبھی ملا سیالکوٹ میں
دل فسردہ کو ترے وصال کا جنون ہے
نہیں ہے کوئی اپنا ہمنوا سیالکوٹ میں
پتا چلے گا پھر تجھے کہ پیار کس کو کہتے ہیں
نظر سے بس نظر کبھی ملا سیالکوٹ میں
ترے ورود سے بہار دشت دل میں آئے گی
کریں گے ہم وفا کی انتہا سیالکوٹ میں
بچھڑ کے تجھ سے میری زندگی عذاب بن گئی
کہ میرا کون تھا ترے سوا سیالکوٹ میں
مری ہو یا ایوبیہ کہیں بھی ہم نہ جائیں گے
اداس دل کی تشنگی بجھا سیالکوٹ میں

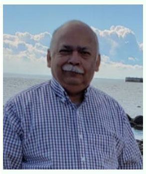

کفیل احمد

کفیل احمد اک عجب سا ہوا ہے سناٹا
دل میں آ کے رہا کرے کوئی
صبر میرا غضب نہ بن جائے
ظلم یوں نا کیا کرے کوئی
زخم اے دوست سہہ لیا میں نے
کس لئے اب دعا کرے کوئی
بات کرنی ہے صرف سچ مجھ کو
جھوٹ کہہ کر جیا کرے کوئی
دیکھ کر حسن کی بہار تری
کیوں نا جاں بھی فدا کرے کوئی
آ بھی جاؤ زندگی میں اب
وعدہ جیسے وفا کرے کوئی
کہتے سب ہیں کہ کچھ ہوا مجھ کو
میری بھی تو سنا کرے کوئی

ایم قاہر

مجھے تم خیال سے رکھو
میں گر کے ٹوٹ سکتا ہوں
کھلونے سا ہے دل میرا
اسے عادت ہے پھولوں کی
سحر سے خوب رشتہ ہے
آذان مرغ کا ہے لطف
عجب شوق فراخی ہے
ستاروں سے بھی یاری ہے
مدد مانگیں تو کس سے ہم
سنائیں کس کو حال دل
نہ اپنا کوئی حامی ہے
نہ اپنا کوئی جانی ہے
دھلاسے دینے والے کیوں
بھلا پیدا نہیں ہوتے
جو تھپکی دیں کہ اُٹھ بیٹا
ابھی دنیا بہت سی ہے
تو بس اک بے وفا پیچھے
بنا بیٹھا ہے شاعر اور

***

الیاس احمد وقار

اب تو سنسان سے لگتے ہیں نگر شام کے بعد
تیرا جانا ہے کہ اترا ہو قہر شام کے بعد
آ کبھی تجھ کو دکھاؤں میں دل کا منظر
جیسے ویران سی دکھتی ہو قبر شام کے بعد
میری دنیا بھی ستاروں کی ضیاء ہو جائے
کر دو اک شام میرے نام اگر شام کے بعد
ڈھونڈنے روز نکلتا ہوں تجھے پانے کو
پہلو میں اپنے ہی پاتا ہوں مگر شام کے بعد
شام کے غم کا بھلانا تو بڑی بات نہیں
شمس نے ہی تو اجالا ہے قمر شام کے بعد
جن درختوں پہ پرندوں کی حمد جاری ہو
کیسے لگتے ہیں سہانے وہ شجر شام کے بعد
کیوں نہ ہوں اپنے مقدر پہ میں نازاں وقار
آج اُترا ہے میرے گھر میں قمر شام کے بعد

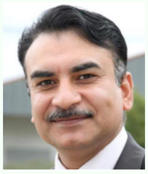

طاہر عدیم

زانو پہ تیرے دھر کے یہ سر جاگتے رہے
ہم عمر بھر بہ کارِ ہنر جاگتے رہے
ہم کو فقط یہی ہے خبر جاگتے رہے
جتنی بھی کی ہے عمر بسر جاگتے رہے
اے ماں!! کہیں سے ہم کو وہ لوری سنا کہ ہم
مر جائیں گے مزید اگر جاگتے رہے
گلشن میں کہہ رہی ہے یہ پھیلی ہوئی نمی
شب بھر تھے گل بہ دیدہ تر جاگتے رہے
دونوں طرف تھے ذہن وساوس بھرے ہوئے
دونوں طرف تھا ایک ہی ڈر، جاگتے رہے
ہم سادہ دل کہ وصل کا گر ایک پل ملا
برسوں اسی کے زیرِ اثر جاگتے رہے
رستے میں تیرے سارا بدن سو گیا مگر
آنکھوں کی پتلیوں کے بھنور جاگتے رہے
طاہرؔ میں سو گیا تھا مگر پاؤں میں مرے
رستے بہت سخی تھے، سفر جاگتے رہے

فوزیہ ظہیر

تھام لینا اے خدا گرنے سے پہلے ہی ہمیں
اُلجھنوں کے جال میں بس تو ہمارے ساتھ ہو
بُن رہے ہیں ہم وفا کے ریشمی دھاگوں سے جو
اس ہماری شال میں بس تو ہمارے ساتھ ہو
آسماں تک ہوں بلند جس پیڑ کی شاخیں سبھی
اس کی ہر ہر ڈال میں بس تو ہمارے ساتھ ہو
راگ ایسا چھیڑ دیں ہم جھوم اُٹھے سارا جہاں
ان سروں کی تال میں بس تو ہمارے ساتھ ہو
آئے نہ لغزش ہمارے حوصلوں میں اے خدا
صبر و استقلال میں بس تو ہمارے ساتھ ہو
وقت کی نبضوں پہ یونہی ہاتھ رکھ کے ہم چلیں
دن مہینوں سال میں بس تو ہمارے ساتھ ہو

منظور احمد بزمی

بستر تو بچھانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن
دولت کے سوچتا ہوں انبار لگا لوں
محلوں سے ورا شان کا گھر دار بنا لوں
سیاحت کی بھی چاہت کو میں جی بھر کے مٹا لوں
دنیا کے سفر کر لوں فضاؤں کا مزہ لوں
سب کر کے بھی جانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن
بستر تو بچھانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن
چوٹی ہو پہاڑوں کی یا تہہ ہو سمندر کی
میرے نام کی تختی ہو میرے چھاپ ہو قدموں کی
بس جشنِ بہاراں ہو جھرمٹ ہوں ستاروں کے
خوشیوں کے لبادے ہوں آہٹ نہ ہو صدموں کی
سب کر کے بھی جانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن
بستر تو بچھانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن
اے کاش میسر ہو توفیق اطاعت کی
قرآن کی، سنت کی، مہدی کی خلافت کی
انسان کی خدمت کی، دنیا میں سخاوت کی
اللہ کی چاہت کی، ایماں کی حفاظت کی
سب کر کے بھی جانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن
بستر تو بچھانا ہے تہہِ خاک ہی اک دن

حارث راجہ

میرے خواب تم سے میرا نام تم سے
میرا جو بھی ہے وہ مقام تم سے
میرے غم کا صحرا ہے میرے اندر
میرا مسکرانہ سر عام تم سے
وہ تم سے دلکش تھا لمحہ لمحہ
تھا زیست کا انصرام تم سے
جو تم نہیں ہو تو کھوجتا ہوں
وہ صبح کی رونق وہ شام تم سے
ہے میری خلوت میں گونجتا اب
وہ جلوتوں میں کلام تم سے
تمہاری یادوں سے ہیں مزین
جو تھے حسیں دروبام تم سے

مہدی علی کے نام

(عبدالسلام جمیل)

یقین جان! ایک بار
نہیں ہوا مجھے گماں
جو تیری جان چلی گئی
بے سود چلی گئی
جو تیرا خون بہہ گیا
بہہ گیا ہے رائیگاں
مہدی تجھے پتہ تو ہے
مقام جو شہید کا
موازنہ نہیں کوئی
حسین کا، یزید کا
شہید کی موت تو
دائمی حیات ہے
شہید کے وجود سے
قوم کو ثبات ہے
تو آخریں کی صف میں تھا
سابقون سے مل گیا
غنچہ تھا صفات کا
گلاب بن کے کھل گیا
تجھے لگی جو گولیاں
بہشت کی تھی چابیاں
دیکھ وہ در کھل گیا
جس سے جو گزر گیا
خدا کا قرب پا گیا
ہو گیا وہ جاوداں
تابہ ابد ضوفشاں

دیکھ اپنا اعزاز تو
امام وقت کی زباں
پیار سے رندھی ہوئی
تیرے ذکر سے ہے تر
گن وا رہی ہے نیکیاں
پڑھ رہی تیرے شعر
دہرا رہی ہے خوبیاں
یہ بھی نہیں تیرا فراق
سینے کا دکھ نہیں بنا
تیرے ہر ایک گھاؤ پہ
دل سے میرے لہو بہا
دیکھ تیری لحد پہ
اک ہجوم قدسیاں
پلکوں پہ ہے لئے ہوئے
پیار کی لو کے دیے
آیا ہے کہنے الوداع
صبر سے اپنے لب سیے
یہ تیرا نصیب ہے
ہوا سرفراز تو
قوم کو دے گیا
ایک اور اعزاز تو
اب باغ بہشت میں
ہمارے لئے دعا تو کر
ہم پہ آئے وقت گر
ہم بھی اسی راہ پر
وار دیں یہ زندگی
ہم بھی ہوں جاوداں
تابہ ابد ضوفشاں

نصیر احمد خان

اُبھر رہے ہیں تصور میں پھر وہی خدو خال
رواں ہے پھر اس منزل کو کاروانِ خیال
شباب و شعر کی رت گدگدا گئی دل کو
خیالِ یار ہے گویا خرامِ بادِ شمال
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ مہرو ماہ تمام
کسی کے نور کا پرتو کسی کے رخ کا جمال
یہ جستجو کہ جسے ہم حیات کہتے ہیں
ازل اُٹھان ہے اس کی ابد ہے اس کا کمال
ہمارا ذوقِ طلب احتیاجِ دیدہ و دل
تمہارا لطف و کرم بندہ پروری پروال
چمن میں تو گل و بلبل کی داستاں مت چھیڑ
تمام عشق خرابی تمام حسن زوال
جھٹک کے ناز سے دامن چھڑانے والے سن
کسی کے شیشہ دل میں نہ آگیا ہو بال
جواب یہ ہے کہ اس کا جواب کیا ہوگا
سوال یہ ہے کہ کیوں لب پہ آگیا ہے سوال
ہجومِ اشک سے بحرِ الم تلاطم خیز
وفورِ غم سے زمینِ دل کی زلزلت زلزال
بجھی بجھی سی تمنا مٹا مٹا سا سراب
یہ کائنات ہے دل کی وہ ہے نظر کا کمال
یہی ہے دنیا میں امن و سلامتی کی روش
کہ کل جہان سے نیکی کر اور کنویں میں ڈال
دلِ نصیر پہ ٹوٹے ہیں کوہِ غم کیا کیا
یہ سرگزشت ہے اپنی نہ اس میں قیل نہ قال
(المنار۔اپریل،مئی،جون 1962)

2022
ادب کا نوبل انعام فرانسیسی ناول نگار خاتون
Annie Ernaux کے نام

طارق احمد مرزا آسٹریلیا

امسال یعنی 2022ء کے ادبی نوبل انعام کی مستحق 82 سالہ فرانسیسی ناول نگار خاتون اینی ارنو (Annie Ernaux) کو ٹھہرایا گیا جن کا تعلق فرانس کے علاقہ نارمنڈی کے ایک گاؤں سے ہے۔ نوبل انعام کی رقم ایک کروڑ سویڈش کرونا ہے جو لگ بھگ آٹھ لاکھ چالیس ہزار برطانوی پاؤنڈ کے برابر ہے لیکن نوبل انعام حاصل کرنا ایک ایسا عالمی اعزاز ہے جس کی قدر سونے چاندی یا کسی سکہ رائج الوقت میں نہیں لگائی جاسکتی۔

واضح رہے کہ اینی ارنو ادب میں نوبل انعام حاصل کرنے والی پہلی فرانسیسی خاتون ہیں۔ آپ متعدد ناولوں کی مصنفہ ہیں جن میں زیادہ تر وہ خود اپنی زندگی کے بیتے تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے معاشرے کا پوسٹ مارٹم ایک پیشہ ورانہ انداز میں کرتی ہیں اور آپ کا قلم کسی ماہر سرجن کے نشتر کی طرح خوب کام کرتا ہے۔

ایک عورت کی حیثیت سے آپ اپنی زندگی کے ان گوشوں پر سے پردہ ہٹاتے بالکل بھی نہیں شرماتیں جو درحقیقت آپ کے آس پاس کے معاشرہ کی منافقتوں اور صنفی عدم مساوات کی عکاسی کرتی یا ان کا شاخسانہ ہیں۔

آپ کے نزدیک آپ کی زندگی ہر عام سی عورت کی زندگی ہے لیکن آپ ایسی ہر عورت کی زبان اور قلم بن گئی ہیں جو کہنا اور لکھنا تو چاہتی ہیں مگر معاشرے کے دباؤ اور خوف کے باعث خاموش ہی رہتی ہیں، کچھ بھی نہیں کہہ سکتیں۔ آپ کا نوبل انعام اسی ہمت اور جراءت کو خراج تحسین پیش کررہا ہے۔

دی ییرز (The Years) اینی ارنو کی آپ بیتی پر مبنی کتاب ہے جو آپ کی زندگی کی چھ دہائیوں کے تذکرے اور یادداشتوں پر مشتمل ہے اور یوں فرانس کی جدید تاریخ سے متعلق ہے جو 1940 میں اینی کی پیدائش سے لے کر 2007 تک کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس کی مصنفہ پوری کتاب میں لفظ "میں" کا کہیں بھی استعمال نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی کی حیثیت زیادہ رکھتی ہے۔ ان چھ دہائیوں کا جس طرح سے سامنا آپ نے کیا، فرانس کی ہر عورت نے بھی کم وبیش اسی طرح کیا۔ اسی لیئے آپ صیغہ واحد متکلم یعنی "میں" کی بجائے "ہم" کی اصطلاح بھی استعمال کرتی ہیں جو کبھی کبھار صیغہ مؤنث غائب (She) یعنی "اس عورت" میں بدل جاتا ہے۔

اینی نے محض صنفِ نازک کے بارہ میں ہی قلم نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے والد کی زندگی کو بھی بڑی گہری نظر سے دیکھا اور سمجھا۔ آپ نے اپنے والد کے روپ میں اس معاشرے کے ہر مرد کے بحیثیت بیٹے، بھائی، خاوند اور باپ، اس کے روپ، رویوں، اس کی مجبوریوں اور "مرد بنو" کے مروجہ سلوگن کی لاج رکھنے کی کوششوں اور جدوجہد کو بھی موضوع قلم بنایا۔ آپ کا ناول "ایک مرد" (The man) ان کے والد کی زندگی سے ہی متعلق ہے۔ اسی طرح اپنی والدہ کے بارہ میں بھی ایک کتاب ناول کی شکل میں لکھی۔ نوبل انعام سے قبل اینی ارنو کو ادبیات میں مختلف قسم کے ایوارڈ اور انعامات مل چکے ہیں۔ آپ کی شائع شدہ کتابوں، مضامین، افسانوں وغیرہ کی فہرست کافی طویل ہے جو آپ کی اپنی ویب سائٹ www.annie-ernaux.org پر دستیاب ہے۔ اخبارات کے مطابق جب انہیں ادب کے نوبل انعام کے حقدار ٹھہرائے جانے کی خبر دی گئی تو انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب ان کے کندھوں پر اور بھی زیادہ ذمہ داری عائد ہوگئی ہے جو معاشرے میں طبقاتی مساوات اور عدل کے قیام کی کوششوں سے متعلق ہے۔

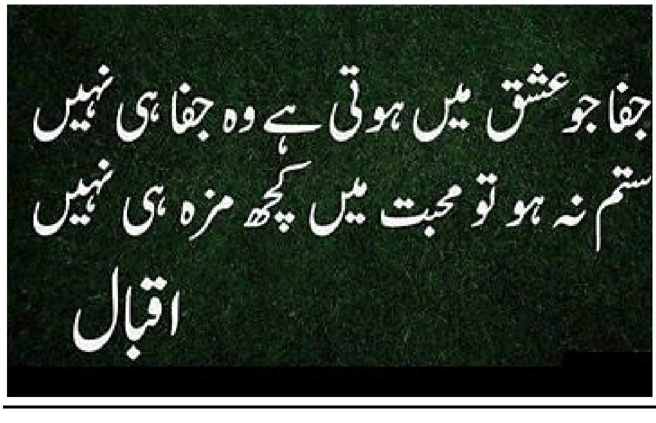

ڈاکٹر طارق احمد مرزا (آسٹریلیا) بحیثیت نثر نگار

عاصی صحرائی

ڈاکٹر طارق احمد مرزا (آسٹریلیا) قندیل ادب کے دیرینہ معاونین میں شامل ہیں۔ آپ کا تعلق نوشہرہ (خیبر پختونخوا) کے مردم خیز شہر سے ہے۔ سکول اور کالج کے زمانہ سے آپ کے مضامین شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آپ شاعری میں ثاقب زیروی صاحب کو اپنا استاد جبکہ نثر نگاری میں علامہ رازق الخیری صاحب کو اپنا محسن گردانتے ہیں جو مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے تھے۔

آپ ایک بہترین انشاء پرداز، ادیب وشاعر، محقق ومبصر، اور بلند پایہ مصنف بھی ہیں۔ آپ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھانے کا ارادہ کرتے ہیں پہلے اس کے متعلق مکمل مطالعہ کر کے پھر اسے اس کی شان کے مطابق تحریر کرنے کی عادت رکھتے ہیں۔ کسی بھی مضمون کو تحریر سے قبل اس کی گہرائی اور مکمل حصول علم کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر کافی محنت اور مطالعہ کے بعد اس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ میرے خیال میں طارق مرزا عاشق اردو ادب ہیں۔ جو بھی رسالہ یا اخبار محترم تک پہنچتا ہے۔ انہیں جب تک چین نہیں آتا جب تک اُسے پڑھ نہ لیں۔ یہی ایک سچے عاشق کی نشانی ہے۔ ان کی تحریر میں ایک جادو ہے۔ مجھے ان کی اس عاشقی پر بھی رشک آتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

آپ ہر موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور دنیا کے مختلف اخبارات، جرائد ورسائل میں آپ کے کالم، بلاگ، سائینسی، تحقیقی وتاریخی مضامین، نیز تراجم وغیرہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ذیل میں آپ کی نثر نگاری کے بارہ میں چند آراء درج کی جاتی ہیں :۔ (ایڈیٹر، مصنف)

محترم ایس ایچ ہادی صاحب، کینیڈا۔

ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "ماشاءاللہ آپ ڈاکٹر بھی ہیں اور بلند پایہ ادیب بھی۔ ترجمے کے اسلوب میں تو سبحان اللہ۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اردو ادب میں سمونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ آپ ایک کہنہ مشق قلم کار ہیں۔ آپ نے انتہائی مشکل اور تکنیکی مضامین کو عوام الناس کی زبان میں سمجھایا ہے اور اپنا لوہا منوایا ہے آپ کے ہاں الفاظ کا بیش بہا ذخیرہ ہے اور زبان وبیان پر دسترس حاصل ہے۔"

محترم امجد مرزا امجد صاحب، یو کے۔

(معروف شاعر، مصنف، ٹی وی اینکر، جرنلسٹ) فرماتے ہیں: "طارق احمد مرزا آسٹریلیا میں مقیم ہیں اچھے شاعر ہیں اور مجھے اپنے کلام سے نوازتے رہتے ہیں جو میں مقامی اخبار نیشن شائع کرواتا ہوں یا اسے گرافک میں بنا کر ادب دوستوں کے ذوق مطالعہ کی نذر کرتا ہوں"۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں: "ہمارے طارق مرزا آسٹریلیا سے نہایت خوبصورت تحریریں بھیج کر محظوظ کرتے ہیں۔ اس بار ان کی نثر پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ جہاں شاعری میں کمال کرتے ہیں نثر میں بھی باکمال ہیں"۔

(ایڈیٹر قندیل ادب کے نام خط)

محترم عبدالکریم قدسی صاحب، امریکہ۔ (معروف شاعر وادیب)۔

"طارق احمد مرزا صاحب کا علمی اور تحقیقی مضمون پسند آیا۔ موصوف کا قلم نظم ونثر کی منزلیں خوب طے کر رہا ہے" اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین۔

صادق باجوہ

کروں نذر ایسی نظر کو کیا جو نظر نظر میں سما گئی
تری یاد کتنی عجیب ہے جو دل و دماغ پہ چھا گئی
تری آرزو، تری جستجو ہوئی گومگو پھری کوبکو
غم ہجر کے بڑھے سلسلے مرے نیر کتنے بہا گئی
وہ حیات کا کوئی باب تھا، کوئی خواب تھا کہ سراب تھا
بڑی چاہتوں کا حساب تھا، تری یاد وہ بھی مٹا گئی
کوئی بے پناہ سی چاہ تھی، رہ ظلم و جور تباہ تھی
کسی بے نوا کی وہ آہ تھی، سرِ شام حشر جگا گئی
جو غموں کو دل سے لگا لیا تو جہاں کو اپنا بنا لیا
جو طلب تھی اس سے سوا دیا یہ حیات مژدہ سنا گئی
شب غم طویل سہی مگر، ہیں نویدِ صبح کے منتظر
یہی جھلملاتی ہوئی سی لو کوئی مشعلیں ہے جلا گئی
جو خلوص دل کی ملے رمق، سمجھ اسکو صادق عطائے حق
یہی راہِ صدق و وفا تو ہے مری زندگی جو بنا گئی

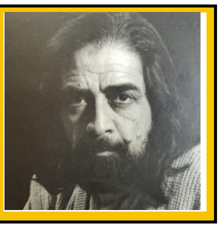

عبیداللہ علیم

آصف محمود ڈار

محترم علیم صاحب ۱۲ جون ۱۹۳۹ء کو بھوپال میں محلہ چندپورہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد مکرم رحمت اللہ بٹ صاحب اوورسیئر تھے اور انہوں نے سیالکوٹ سے بھوپال ہجرت کی تھی۔ بعد ازاں وہ انجینئر ہوئے، پھر ٹھیکیداری کی اور زمینداری بھی کی۔ ان کی چار بیویوں میں سے آپ کی والدہ کا نمبر دوسرا تھا اور وہ بھوپال کی ہی رہنے والی تھیں۔آپ کے دادا مکرم مولوی جان محمد صاحب اس زمانہ میں B.A,B.T تھیا ور سیالکوٹ میں کسی سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے تھے۔وہ بھی شعر کہا کرتے تھے۔محترم علیم صاحب ۱۹۴۶ میں قادیان میں تیسری جماعت میں پڑھا کرتےتھے۔ پھر آپ کے والد کراچی چلے آئے توآپ بھی اپنی والدہ کے ہمراہ وہاں آ گئے لیکن آپ کے والد کو آپ کے آنے کی اطلاع نہ تھی اور آپ کو ان کا پتہ معلوم نہ تھا چنانچہ دو چار روز اسٹیشن پر گزارنے پڑے۔ پھر اپنے والد کے ہمراہ لالو کھیت (لیاقت آباد) کے محلہ میں ایک کمرہ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ چند مہینے بعد والد کے ہمراہ جنگ شاہی آ گئے جہاں وہ ایک سیمنٹ فیکٹری میں ملازم ہو گئے تھے۔ یہاں پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھریلو حالات کی وجہ سے آپ کو بھی اسی فیکٹری میں مزدوری کرنی پڑی۔پھر حسن ابدال آنا پڑا جہاں آپ کے والد نے آپ کو پنجہ روڈ پر ایک جنرل سٹور ’’عبیدیہ جنرل سٹور‘‘ کے نام سے کھلوا دیا۔چھوٹا بھائی بھی آپ کے ہمراہ تھا جس کی ناگہانی وفات کے صدمہ سے آپ بہت غمگین ہو گئے اور پھر اپنی بڑی والدہ کے کہنے پر واپس آ گئے اور تعلیمی سلسلہ دوبارہ استوار کر لیا۔ ایک سال میں دو دو کلاسیں پاس کیں،سکول کے جریدہ کے نائب ایڈیٹر بھی رہے اور بیت بازی سے بھی شغف رہا۔نویں جماعت میں اپنی موزوں طبیعت کا ادراک ہوا۔انہی دنوں رسالہ ’’المصلح‘‘ کراچی میں آپ کی ایک نظم بھی چھپی۔ آغاز میں آپ بزرگ شاعر شاہد منصور صاحب سے اصلاح لیتے رہے۔میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد وہ سال تک ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں کلرک کے طور پر ملازم رہے۔۱۹۵۹ میں اردو کالج میں داخلہ لیلیا اور مالی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ٹیوشنوں کا سہارا لیا۔ ا دوران مشاعروں میں بھی بلائے جاتے اور شوق سے سنے جاتے۔ ۸ ۱۹۵ کے مارشل لاء کے بعد سیاسی تنظیموں سے وابستہ ہوئے تو ۱۹۶۱ء میں انٹر کے بعد کالج کے دروازے آپ پر بند ہو گئے۔ چنانچہ پہلے کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے اور پھر پاکستان انسٹیٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹنسی سے وابستہ ہو گئے۔ ۳۶ء میں ملازمت ترک کر کے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا۔اس زمانہ میں جماعتی طور پر بھی سرگرم کارکن رہے۔

۶۴۔۱۹۶۳ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے متعلق آپ کی ایک نظم الفضل میں شائع ہوئی تو آپ کو حضورؓ کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے ایک خط ملا کہ حضور انور نے آپ کی نظم پڑھی ہے اور آپ کے لئے بہت دعا کی ہے۔حقیقت میں اس دور میں ہی آپ کو خوب پذیرائی ملنا شروع ہوئی۔محترم علیم صاحب نے ۱۹۵۶ء میں بی۔اے فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور دو سال بعد ایم۔اے بھی کر لیا۔ پھر ریڈیو پروڈیوسر کیلئے درخواست دی،ڈیوٹی آفیسر کی پیشکش ہوئی مگر آپ نے انکار کر دیا اور ٹیلی ویژن پروڈیوسر کے لئے درخواست دی تو کامیاب ہوئے۔ اس دوران آپ کی غزلیں ریڈیو اور ٹی وی پر گائی جانے لگی تھیں۔ایک مشہور غزل تھی۔

آنکھ سے دور سہی، دل سے کہاں جائے گا
جانے والے تو ہمیں یاد بہت آئے گا

محترم علیم صاحب نے پروڈیوسر کے طور پر بچوں کے اور موسیقی کے پروگرام کئے، دو چار مشاعرے بھی کئے، پھر مذہبی پروگرام کئے اور ان سب پروگراموں کا فارمیٹ یکسر تبدیل کر دیا۔ان جدتوں کی وجہ سے ۲ ۳ علماء کا فتویٰ آپ کے خلاف جاری ہوا مگر آپ کی مقبولیت کی وجہ سے بے اثر رہا۔آخر جب ضیاء کی حکومت آئی تو پھر آپ کے عقیدہ کا سوال اُٹھا تو آپ نے استعفیٰ دے دیا اور ہمہ وقت شاعری کے ہی ہو رہے۔ ۱۹۷۴ میں آپ کی پہلی کتاب ’’چاند چہرہ ستارہ آنکھیں‘‘ منظر عام پر آئی اور ملک گیر شہرت حاصل کی۔اسی سال کا ’’آدم جی ایوارڈ‘‘ بھی آپ کے حصے میں آیا۔اب تک اس کتاب کے بیس سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔اسی سال آپ نے رائٹر گلڈ کے ریجنل سیکرٹری سندھ زون کا انتخاب جیتا۔ ٹی وی پروگرام ’’سخنور‘‘ میں ۱۹۷۴ میں آپ کو Outstanding Poet قرار دیا گیا۔ آپ کی دوسری کتاب ’’ویران سرائے کا دیا‘‘ جولائی ۱۹۸۶ء میں چھپی۔حضرت

خلیفۃ المسیح الثالثؒ آپکے کلام کو بہت پسند فرماتے تھے اور خلافت رابعہ کے دور میں تو آپ کو ایسی محبت اور شہرت ملی جس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔MTA کے ذریعہ تمام دنیا میں آپ کا کلام نشر ہوا۔ انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ وغیرہ میں اعزازی مشاعرے منعقد ہوئے۔حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ۲ اپریل ۸۹ء کے ایک خط میں آپ کو تحریر فرمایا’’آپ جانتے ہیں، مجھے آپ سے کیسی دلی محبت ہے اور آپ کی یگانہ فنی صلاحیتوں کا کس قدر دل سے مداح ہوں۔نظم ونثر میں اس سارے زمانہ میں بس ایک ہی۔ عبید اللہ علیم ہے‘‘محترم علیم صاحب ہر سال مجلس مشاورت پر ربوہ تشریف لایا کرتے تھے۔۸ ۹ء میں بھی تشریف لائے۔ ایک عرصہ سے دل کے عارضہ میں مبتلا چلے آتے تھے، مشاورت کے بعد دل کا شدید حملہ ہوا اور کئی روز تک فضل عمر ہسپتال کے بعد دل کا شدید حملہ ہوا اور کئی روز تک فضل عمر ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ پھر کراچی تشریف لے گئے جہاں ۱۸ مئی ۱۹۹۸ءکو ۵۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگلے روز احمدیہ قبرستان’’باغ احمد‘‘میں سپرد خاک ہوئے۔ پسماندگان میں آپ نے دو بیگمات ، چار بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔محترم علیمؔ صاحب نے غزل، نظم اور آزاد نظم بھی لکھی ہے مگر معتد بہ حصہ غزل پر ہی مشتمل ہے۔آپ کی شاعری عام روش سے ہٹ کر ہے۔ زباں بہت شستہ اور رواں ہے اور شاعری میں ہر قسم کے مضامین ملتے ہیں۔ حمد و نعت کے مضامین کو بھی آپ نے غزل ہی کی کیفیت میں باندھا ہے۔

نمونہ کلام کے طور پر محض چند اشعار پیش ہیں۔

کرکے سپرد اک نگہ ناز کے حیات
دنیا کو دین، دین کو دنیا کرے کوئی

وہ حسن اس کا بیاں کیا کرے جو دیکھتا ہو
ہر اک ادا سے کئی قد نئے نکلتے ہوئے

ہر اچھی بات پہ یاد آیا
اک شخص عجیب مثال ہوا

ایسا لگتا ہے کہ اس کی صورت
عالم خواب نما سے آئی

چلتے ہیں نقش قدم پر اسکے
جس کو رفتار صبا سے آئی

یونہی قامت وہ قیامت نہ ہوا
ہر ادا ایک ادا سے آئی

حسن اس کا تھا قیامت اس پر
وہ قیامت جو حیا سے آئی

یہ ادا عشق و وفا کی ہم میں
اک مسیحا کی دعا سے آئی

محترم علیمؔ صاحب کی شاعری میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء کی ذات کو اکثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

سایہ سایہ ایک پرچم دل پہ لہرانے کا نام
اے مسیحا تیرا آنا زندگی آنے کا نام

جس پر اترا وہ مسیحا دل مینارہ، دل دمشق
استعارے پھول میں خوشبو کو سمجھانے کا نام

عرش سے تا فرش اک نظارہ و آواز تھا
جب وہ اترا جامہ نور سخن پہنے ہوئے

نور سے بھر جائے دل وہ رنگ ہے تحریر کا
آپ کیا ہوگا کہ جب عالم ہے یہ تصویر کا

جب ہوئے ہم گوش بر آواز تو ہم پر کھلا
ہر نئے عالم میں اک عالم تیری تقریر کا

موج نشاط وسیل غم جاں تھے ایک ساتھ
گلشن میں نغمہ سنج عجب عندلیب تھا

میں بھی رہا ہوں خلوت جاناں میں ایک شام
یہ خواب ہے یا واقعی میں خوش نصیب تھا

رکھتا نہ کیوں میں روح و بدن اس کے سامنے
یوں بھی تھا وہ طبیب وہ یوں بھی طبیب تھا

وہ جس پہ رات ستارے لئے اترتی ہے
وہ ایک شخص دعا ہی دعا ہمارے لئے

دئے جلائے ہوئے ساتھ ساتھ رہتی ہے
تمہاری یاد تمہاری دعا ہمارے لئے

نوروں نہلائے ہوئے قامت گلزار کے پاس
اک عجب چھاؤں میں ہم بیٹھے رہے یار کے پاس

تم بھی اے کاش کبھی دیکھتے ، سنتے اس کو
آسمان کی ہے زباں، یار طرحدار کے پاس

یہ محبت تو نصیبوں سے ملا کرتی ہے
چل کہ خود آئے مسیحا کسی بیمار کے پاس

پھر اسے سایہ دیوار نے اُٹھنے نہ دیا
آکے اک بار جو بیٹھا تیری دیوار کے پاس

تجھ میں اک ایسی کشش ہے کہ بقول غالب
خود بخود پہنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

اے شخص! تو جان ہے ہماری
مرجائیں اگر تجھے نہ چاہیں

سو بار مریں تو تیری خاطر
سو بار جیئیں تو تجھ کو چاہیں

سائے میں تیرے دھوپ نہائے بصد نیاز
اے چھاؤں چھاؤں شخص تری عمر ہو دراز

وطن سے اپنی محبت کو آپ نے یوں بیان کیا:

میں تری خاک سے لپٹا ہوا اے ارض وطن
ان ہی عشاق میں شامل ہوں جو معتوب آئے

جی جان سے اے ارض وطن مان گئے ہم
جب تو نے پکارا ترے قربان گئے ہم

ہم ایسے وفادار و پرستار ہیں تیرے

جو تونے کہا، تیرا کہا مان گئے ہم

محترم علیمؔ صاحب نے کراچی کے حالات پر بھی کھل کر اپنے کرب کا اظہار کیا ہے

میں یہ کس کے نام لکھوں، جو الم گزر رہے ہیں
میرے شہر جل رہے ہیں، میرے لوگ مر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطہ زمیں پر
وہی خطہ زمین ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
کچھ کم نہیں تھا پہلے بھی پامال میرا شہر
یہ کس کے پاؤں نے اسے پامال تر کیا

والد نے آپ کو پنجہ روڈ پر ایک جنرل سٹور ''عبید یہ جنرل سٹور'' کے نام سے کھلوا دیا۔ چھوٹا بھائی بھی آپ کے ہمراہ تھا جس کی ناگہانی وفات کے صدمہ سے آپ بہت غمگین ہو گئے اور پھر اپنی بڑی والدہ کے کہنے پر واپس آ گئے اور تعلیمی سلسلہ دوبارہ استوار کر لیا۔ ایک سال میں دو دو کلاسیں پاس کیں، سکول کے جریدہ کے نائب ایڈیٹر بھی رہے اور بیت بازی سے بھی شغف رہا۔ نویں جماعت میں اپنی موزوں طبیعت کا ادراک ہوا۔ انہی دنوں رسالہ ''المصلح'' کراچی میں آپ کی ایک نظم بھی چھپی۔ آغاز میں آپ بزرگ شاعر شاہد منصور صاحب سے اصلاح لیتے رہے۔ میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد وہ سال تک ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں کلرک کے طور پر ملازم رہے۔ ۹۵۹۱ء میں اردو کالج میں داخلہ لیلیا اور مالی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ٹیوشنوں کا سہارا لیا۔ اس دوران مشاعروں میں بھی بلائے جاتے اور شوق سے سنے جاتے۔ ۸۵ء کے مارشل لاء کے بعد سیاسی تنظیموں سے وابستہ ہوئے تو ۶۱ء میں انٹر کے بعد کالج کے دروازے آپ پر بند ہو گئے۔ چنانچہ پہلے کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے اور پھر پاکستان انسٹیٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹنسی سے وابستہ ہو گئے۔ ۶۳ء میں ملازمت ترک کر کے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا۔

اس زمانہ میں جماعتی طور پر بھی سرگرم کارکن رہے۔ ۶۴۔ ۶۳ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے متعلق آپ کی ایک نظم الفضل میں شائع ہوئی تو آپ کو حضورؓ کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے ایک خط ملا کہ حضور انور نے آپ کی نظم پڑھی ہے اور آپ کے لئے بہت دعا کی ہے۔ حقیقت میں اس دور میں ہی آپ کو خوب پذیرائی ملنا شروع ہوئی۔ محترم علیمؔ صاحب نے ۵۶ء میں بی۔اے فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور دو سال بعد ایم۔اے بھی کر لیا۔ پھر ریڈیو پروڈیوسر کیلئے درخواست دی، ڈیوٹی آفیسر کی پیشکش ہوئی مگر آپ نے انکار کر دیا اور ٹیلی ویژن پروڈیوسر کے لئے درخواست دی تو کامیاب ہوئے۔ اس دوران آپ کی غزلیں ریڈیو اور ٹی وی پر گائی جانے لگی تھیں۔ ایک مشہور غزل تھی۔

آنکھ سے دور سہی، دل سے کہاں جائے گا
جانے والے تو ہمیں یاد بہت آئے گا

محترم علیمؔ صاحب نے پروڈیوسر کے طور پر بچوں کے اور موسیقی کے پروگرام کئے، دو چار مشاعرے بھی کئے، پھر مذہبی پروگرام کئے اور ان سب پروگراموں کا فارمیٹ یکسر تبدیل کر دیا۔ ان جدتوں کی وجہ سے ۳۲ علماء کا فتویٰ آپ کے خلاف جاری ہوا مگر آپ کی مقبولیت کی وجہ سے بے اثر رہا۔ آخر جب ضیاء کی حکومت آئی تو پھر آپ کے عقیدہ کا سوال اُٹھا تو آپ نے استعفیٰ دے دیا اور ہمہ وقت شاعری کے ہی ہو رہے۔ ۷۴ء میں آپ کی پہلی کتاب ''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں'' منظر عام پر آئی اور ملک گیر شہرت حاصل کی۔ اسی سال کا ''آدم جی ایوارڈ'' بھی آپ کے حصے میں آیا۔ اب تک اس کتاب کے بیس سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اسی سال آپ نے رائٹر گلڈ کے ریجنل سیکرٹری سندھ زون کا انتخاب جیتا۔ ٹی وی پروگرام ''سخنور'' میں ۱۹۷۴ء میں آپ کو Outstanding Poet قرار دیا گیا۔ آپ کی دوسری کتاب ''ویران سرائے کا دیا'' جولائی ۶۸ء میں چھپی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ آپکے کلام کو بہت پسند فرماتے تھے اور خلافت رابعہ کے دور میں تو آپ کو ایسی محبت اور شہرت ملی جس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ MTA کے ذریعہ تمام دنیا میں آپ کا کلام نشر ہوا۔ انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ وغیرہ میں اعزازی مشاعرے منعقد ہوئے۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ۱۲ اپریل ۸۹ء کے ایک خط میں آپ کو تحریر فرمایا ''آپ جانتے ہیں، مجھے آپ سے کیسی دلی محبت ہے اور آپ کی یگانہ فنی صلاحیتوں کا کس قدر دل سے مداح ہوں۔ نظم ونثر میں اس سارے زمانہ میں بس ایک ہی۔ عبید اللہ علیم ہے''، محترم علیم صاحب ہر سال مجلس مشاورت پر ربوہ تشریف لایا کرتے تھے۔ ۸۹ء میں بھی تشریف لائے۔ ایک عرصہ سے دل کے عارضہ میں مبتلا چلے آتے تھے، مشاورت کے بعد دل کا شدید حملہ ہوا اور کئی روز تک فضل عمر ہسپتال کے بعد دل کا شدید حملہ ہوا اور کئی روز تک فضل عمر ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ پھر کراچی تشریف لے گئے جہاں ۸۱ مئی 1998 کو ۵۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگلے روز احمدیہ قبرستان ''باغ احمد'' میں سپرد خاک ہوئے۔ پسماندگان میں آپ نے دو بیگمات، چار بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔ محترم علیمؔ صاحب نے غزل، نظم اور آزاد نظم بھی لکھی ہے مگر معتدبہ حصہ غزل پر ہی مشتمل

ہے۔آپ کی شاعری عام روش سے ہٹ کر ہے۔ زباں بہت شستہ اور رواں ہے اور شاعری میں ہر قسم کے مضامین ملتے ہیں۔حمد و نعت کے مضامین کو بھی آپ نے غزل ہی کی کیفیت میں باندھا ہے۔نمونہ کلام کے طور پر محض چند اشعار پیش ہیں۔

کر کے سپرد اک نگہ ناز کے حیات
دنیا کو دین، دین کو دنیا کرے کوئی

وہ حسن اس کا بیاں کیا کرے جو دیکھتا ہو
ہر اک ادا سے کئی قد نئے نکلتے ہوئے

ہر اچھی بات پہ یاد آیا
اک شخص عجیب مثال ہوا

ایسا لگتا ہے کہ اس کی صورت
عالم خواب نما سے آئی
چلتے ہیں نقش قدم پر اسکے
جس کو رفتار صبا سے آئی
یونہی قامت وہ قیامت نہ ہوا
ہر ادا ایک اداسے آئی
حسن اس کا تھا قیامت اس پر
وہ قیامت جو حیا سے آئی
یہ ادا عشق و وفا کی ہم میں
اک مسیحا کی دعا سے آئی

محترم علیمؔ صاحب کی شاعری میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء کی ذات کو اکثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

سایہ سایہ ایک پرچم دل پہ لہرانے کا نام
اے مسیحا تیرا آنا زندگی آنے کا نام
جس پر اترا وہ مسیحا دل مینارہ، دل دمشق
استعارے پھول میں خوشبو کو سمجھانے کا نام

عرش سے تا فرش اک نظارہ و آواز تھا
جب وہ اترا جامہ نور سخن پہنے ہوئے

نور سے بھر جائے دل وہ رنگ ہے تحریر کا
آپ کیا ہوگا کہ جب عالم ہے یہ تصویر کا
جب ہوئے ہم گوش بر آوا ز تو ہم پر کھلا
ہر نئے عالم میں اک عالم تیری تقریر کا

موج نشاط و سیل غم جاں تھے ایک ساتھ
گلشن میں نغمہ سن عجب عندلیب تھا
میں بھی رہا ہوں خلوت جاناں میں ایک شام
یہ خواب ہے یا واقعی میں خوش نصیب تھا
رکھتا نہ کیوں میں روح وبدن اس کے سامنے
یوں بھی تھا وہ طبیب وہ یوں بھی طبیب تھا

وہ جس پہ رات ستارے لئے اترتی ہے
وہ ایک شخص دعا ہی دعا ہمارے لئے
دئے جلائے ہوئے ساتھ ساتھ رہتی ہے
تمہاری یاد تمہاری دعا ہمارے لئے

نوروں نہلائے ہوئے قامت گلزار کے پاس
اک عجب چھاؤں میں ہم بیٹھے رہے یار کے پاس
تم بھی اے کاش کبھی دیکھتے ، سنتے اس کو
آسماں کی ہے زباں، یار طرحدار کے پاس
یہ محبت تو نصیبوں سے ملا کرتی ہے
چل کہ خود آئے مسیحا کسی بیمار کے پاس
پھر اسے سایہ دیوار نے اُٹھنے نہ دیا
آکے اک بار جو بیٹھا تیری دیوار کے پاس
تجھ میں اک ایسی کشش ہے کہ بقول غالب
خود بخود پہنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

اے شخص! تو جان ہے ہماری
مرجائیں اگر تجھے نہ چاہیں
سو بار مریں تو تیری خاطر
سو بار جیئیں تو تجھ کو چاہیں

سائے میں تیرے دھوپ نہائے بصد نیاز
اے چھاؤں چھاؤں شخص تری عمر ہو دراز

وطن سے اپنی محبت کو آپ نے یوں بیان کیا:

میں تری خاک سے لپٹا ہوا اے ارض وطن
ان ہی عشاق میں شامل ہوں جو معتوب آئے

جی جان سے اے ارض وطن مان گئے ہم
جب تو نے پکارا ترے قربان گئے ہم
ہم ایسے وفادار و پرستار ہیں تیرے
جو تونے کہا، تیرا کہا مان گئے ہم

محترم علیمؔ صاحب نے کراچی کے حالات پر بھی کھل کر اپنے کرب کا اظہار کیا ہے۔

میں یہ کس کے نام لکھوں، جو الم گزر رہے ہیں
میرے شہر جل رہے ہیں، میرے لوگ مر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطہ زمیں پر
وہی خطہ زمین ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں

کچھ کم نہیں تھا پہلے بھی پامال میرا شہر
یہ کس کے پاؤں نے اسے پامال تر کیا

مہدی علی قمر

اے ذوالمنن! اے مہرباں!
اس سے پہلے کہ میرے گناہ
میری نیکیوں سے بڑھ جائیں
اور ہوجائے یہ وجود میرا
تیری دھرتی پہ بوجھ کی مانند
اس سے پہلے کہ ہو کے بے بس میں
کسی انسان کو سجدہ کر ڈالوں
اس سے پہلے کہ تیرا فضل و عطا
مجھ سے ہونے لگے گریزاں تو
پاس اپنے مجھے بلا لینا
اس جہاں سے مجھے اُٹھا لینا
اپنی بخشی ہوئی حیات اے خدا
میری سانسوں سے تو چرا لینا
اور بھلا کر میری خطاؤں کو
اپنی جنت میں تو بسا لینا
اے ذوالمنن! اے مہرباں!

شکرانہ عمرہ وزیارت

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں دیارِ نبوی ﷺ اور حرم پاک کی امسال فروری میں زیارت کی توفیق عطا فرمائی۔ ہم آٹھ افراد کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ۔ اہل خانہ میں خاکسار کا بیٹا اور اس کی اہلیہ، ایک پوتی، تین پوتے اور خاکسار کی بیگم اس قافلے میں شامل تھے۔ اس کا سارا خرچ میرے بیٹے رانا عبدالوحید خاں نے بخوشی برداشت کیا۔ الحمدللہ۔ ان پاک مقامات پر جو سکون قلب میسر ہوا اپنے لئے اور اپنے پیاروں کیلئے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر دُعائیں کرنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ التجا کا بھی موقع ملا۔ میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آرزو مند کو یہ موقعہ نصیب کرے۔ اس یادگار موقعہ کی نسبت سے چند تصاویر ملاحظہ ہوں۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ (مدیر)

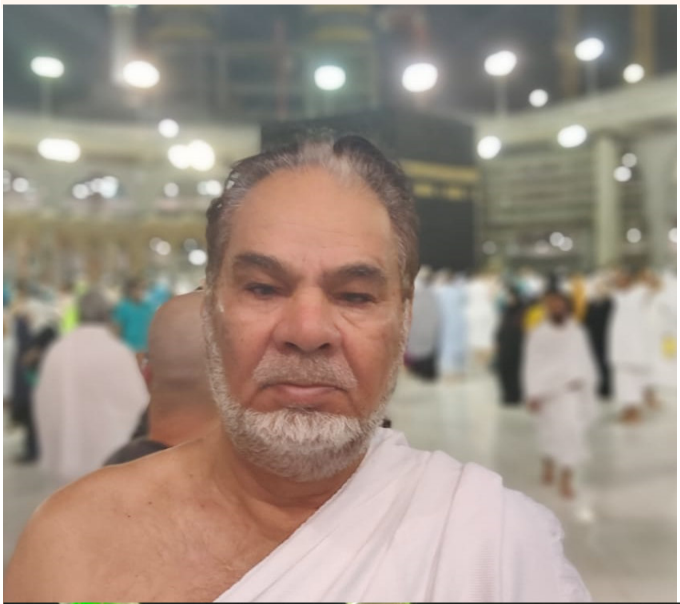

پاکستانی معاشرے کی تربیت کرپٹ ماحول میں ہوتی ہے

رانا عبدالرزاق خان

پاکستان کے اسلامی معاشرے کو اس مدرسہ باز مولویوں نے بد سے بد ترین بنادیا ہے۔ اسلام کے اراکان پر عمل نہ کر کے مسلمانوں سے ٹھٹھا کیا گیا ہے۔ یہ کانگرسی ملاں جوایسے تہی علم ہیں کہ پکی روٹی اور بہشتی زیور سے آگے نہیں گئے۔ اگر قرآن ناظرہ پڑھنے کی توفیق ہوئی تو ترجمہ صرف نحو سے نابلد یہ ملاں صرف اپنی ہم جنس پرستی سے آگے نہیں نکل سکا۔ مستزاد یہ کہ اس مخلوق کو کذب و صدق کے درمیان فرق کا ذرا بھی علم ہو۔ وہ ایک پاک اور مطہر معاشرے کو کیسے تعمیر کرسکتا ہے۔ جس مولانا کی شادی تیس سال کی عمر کے بعد ہو۔ اور وہ بھی کوئی داؤ لگا کر یا کسی مجبور عورت کو اغوا کر کے کی گئی ہو وہ لوگوں کو اسلام کی شان کیسے بیان کرسکتا ہے۔ آغاز جوانی میں کئی ناز واس کے محبوب رہے ہوں تو معاشرے کے لوگ اچھائی اس سے کیسے سیکھ سکتے ہیں۔ ان مدارس نے جہاں ہمارے معاشرے کی جڑ ہی اکھیڑ کر رکھ دی ہے ۔ اب دیکھیں کہ سچ بولنے کا رواج ہمارے معاشرے سے اُٹھ گیا ہے۔ کوئی بھی طبقہ اس برائی سے مبرا نہیں۔ اسی معاشرے سے لوگ آگے آتے ہیں۔ جو میڈیا، میں جاتے ہیں، بیوروکریسی یا کسی بھی محکمے میں جاتے ہیں تو وہ یہ بنیادی تربیت ساتھ لاتے ہیں ۔ تربیت والدین کی ہو، اساتذہ کی ہو علمائے سُوکی ہو۔ وہ اپنا رنگ چڑھاتی ہے۔ یہ مدرسہ باز علمائے سُو نے اس ستر سالوں میں اپنی شکم پری تو خوب مکمل کی مگر سارے معاشرے کو ایک دیمک لگا دی ہے۔ مثلاً ہمارے پاکستانی اسلامی معاشرے کی روایات کو کلیتاً اسلام سے دور کردیا ہے۔ مندرجہ ذیل قوانین کے مقاصد بدل کر رہ گئے ہیں بلکہ عملاً بدل دیئے گئے ہیں۔

گاؤں یا محلے کا نمبردار:

جب کسی عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی ہو تو وہ دیوار سیدھی کیسے رہ سکتی ہے۔ آج اس کا تصور بدل چکا ہے۔ نہایت مکار، چالاک، حکام کا نمائندہ، پولیس کا ٹاؤٹ، ظالم، ابن الوقت، سیاسی اور بدکردار، دولت مند، دولت پرست، درباری، غریب کے لئے ظالم، امیر کے لئے معاون۔ گاؤں کے لوگوں کے لئے کوئی اخلاقی مثال نہیں بنتا اور نہ ہی لوگوں کے لئے کوئی اچھا کردار ہوتا ہے۔ وہ اپنے مفادات کے دائرے میں رہتا ہے۔

گاؤں یا محلے کا پٹواری:

جس کے متعلق جب کوئی سوچتا ہے تو وہ شخص راشی نظر آتا ہے۔ اس کا کام ہر زمیندار سے رشوت اینٹھنا ہے۔ سرکار کے مفادات کو پس پشت ڈال کر اپنے مفادات کے لئے ہر وقت سرگرداں رہنا۔ غلط گرداوری کرنا، غلط کام کرنا، اور اس کے لئے رشوت لینا پھر ان کو درست کرنے کے لئے بھی رشوت لینا پٹواری کا کام ہے۔ افسران بالا کو خوش رکھنا اور کاغذی کاروائی درست رکھنا۔ غلط انتقال درج کرنا اور اس کی فیس کھانا، زمین کی قیمت کم لکھوانا تا کہ حکومت کو ٹیکس کم جائے۔ گاؤں میں مل کر عشر زکوۃ مل بانٹ کر کھانا، وغیرہ۔

گاؤں یا محلے کا مولوی:

مسجد میں پانچ وقت نماز پڑھانا ۔ بچوں کو قرآن پڑھانا، جنازہ، نکاح پڑھانا۔ لوگوں کو اپنے فرقے کے مطابق فتاویٰ دینا وغیرہ۔ کوئی بیمار پڑ جائے تو اس کے لئے دم درود کرنا، پڑھنا۔ عید یا شب رات، میلادالنبی پہ اچھے کھانے لوگوں سے پکوا کر کھانا ۔ حلالہ کرنا، طلاق اور باقی مسائل میں کم علم لوگوں کی راہنمائی کرنا۔ پھر مولوی کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں ۔ جوان، شادی شدہ، غیر شادی شدہ، بوڑھا، وغیرہ۔ اگر کسی قرآن پڑھنے والے بچے سے منہ کالا نہ کرے تو جوان مولوی تو کسی نہ کسی تاڑ میں رہتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں شادی ہو جائے۔ اگر کوئی رضامند ہوگئی تو دوڑا کر کسی اور جگہ جا چھپے اور شادی کر لی۔ جب ایک آدھ بچہ ہو گیا تو پھر واپس وطن لوٹنا۔ شادی شدہ مولوی بہتر ہوتا ہے وہ اپنے رزق کو بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ہم فرقہ کے افکار کے مطابق باقی فرقوں کے خلاف نفرت پھیلانا ۔ اپنے فرقے کے علاوہ باقی مسلمانوں کو کافر گردانا، یہ بھی مسلمانوں کی تربیت کا حصہ ہے۔ مثلاً دیو بندی، بریلوی، اہل حدیث، سنی، احمدی وغیرہ کو۔ چونکہ یہ امام مسجد زیادہ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اپنی عقل کے مطابق ساری قوم کے افراد بچوں کی غلط تربیت کر رہے ہوتے ہیں۔

گاؤں یا محلے کے پرائمری اسکول کے ٹیچرز:

اول تو ہر گاؤں میں اسکول نہیں ہوتا اگر سکول ہو تو استاد نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو کبھی کبھار آتا ہے۔ دو استاد ہوں تو وہ باری باری آتے ہیں۔ استاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ بچوں کو آدابِ زندگی سکھائے۔ ان کو سچ کے فائدے اور جھوٹ کے نقصانات بتائے ۔ باہمی اخوت بتائے۔ صفائی اور محبت کے فائدے بتائے

اور بچوں کو ڈسپلن بتائے۔ مگر ہوتا کیا ہے اول استاد اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اگر کبھی کبھار آتے ہیں تو رٹے رٹائے قائدے یاد کروا دیتے ہیں۔ ہر بچے پر توجہ نہیں دے سکتے جن بچوں کو ان کے والدین پڑھاتے ہیں وہ ہونہار باقی پرائمری پاس کرتے وقت بھی ان پڑھ رہ جاتے ہیں۔ یہ بنیادی تربیت نے ہی ہماری قوم کو قوم بننے نہیں دیا۔

گاؤں یا محلے کا ڈاکٹر یا حکیم:

کوئی بھی ڈاکٹر گاؤں کے سب افراد سے ذاتی تعلق رکھا کرتا ہے۔ دوائی کے کسی کے پاس روپے ہوتے ہیں اور کسی نے اُدھار کرنا ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹر کے پاس سب لوگوں کی خبر ہوتی ہے بلکہ یہ سب کا راز دان ہوتا ہے حتیٰ کہ ناجائز حاملہ خواتین بھی ابورشن کے لئے اسی گاؤں کے ڈاکٹر سے حکیم سے دوائی لیتی ہیں۔ اگر یہ راز فاش ہو جائیں تو بات قتل تک اور پھر پولیس تک بھی چلی جاتی ہے۔ گاؤں کے عیاش مولوی، نمبردار، پٹواری، کونسلر سب اس ڈاکٹر کے کانے ہوتے ہیں۔ یہ برائی زیر زمین آج کل زیادہ پھیل رہی ہے جب سے فون، فیس بک، ٹوئٹر، وٹس ایپس، انٹرنیٹ آئی ہے معاشرہ جنسی بے راہ روی کا شکار ہو گیا ہے۔ بچے بچیوں کے حالات کا والدین سے ملوث افراد زیادہ جانتے ہیں۔ بلکہ انٹرنیٹ اور جنسی فلموں نے ہنستے بستے گھر اُجاڑ دیئے ہیں۔

گاؤں کا یا محلے ویڈیو سنٹر یا کوئی دکان:

یہ برائی کا اڈہ ہے بلکہ ابلیس کا گھر۔ اس سے آپ نہیں بچ سکتے۔ ہر قسم کی برائی یہیں سے پھیلتی ہے۔ فون، انٹرنیٹ، ٹی وی نے اس معاشرے کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں۔ جنسی وڈیو، اب تو یہ سب کچھ فون پر دستیاب ہے۔ یوٹیوب پر سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے فوٹو کے ذریعہ سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ نوجوان بچے بچیوں کو خود دوستانہ ماحول میں سمجھانا ضروری ہے اس کے فوائد اور نقصانات پہلے ہی بتانا ضروری ہیں۔

علاقے کے ایم پی حضرات۔ یا ممبر قومی اور صوبائی اسمبلی:

یہ لوگ ہمارے معاشرے کے لیڈر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا رہن سہن شاہانہ اور کام بے ایمانہ ہوتے ہیں۔ یہ فصلی بٹیرے ہوتے ہیں۔ انتظامیہ سے ان کی ملی بھگت ہوتی ہے۔ ہر کسی کی غمی خوشی میں شامل ہوتے ہیں۔ حکومت کے سب ملازمین سے ان کے تعلقات ہوتے ہیں۔ آپ کو کوئی کام بھی ہو تو ان سے رابطہ کریں۔ ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ ڈی سی او ضلع۔ ایس پی ضلع سب ان کے ساتھ ہوتے ہیں کوئی بھی جائز یا ناجائز کام ہو ان کے بس میں ہوتا ہے۔ الیکشن کے دنوں میں ان کی چاندی ہوتی ہے۔ ووٹ کا اندراج، حلقہ بندیوں میں ردوبدل ان کا ہی کام ہوتا ہے۔ ضلع یا علاقے کو حکومتی مراعات یہ حکام بالا سے لے کر دیتے ہیں۔ کوئی سڑک کوئی پل، کوئی سکول، ہسپتال ان کی تصدیق کے بغیر نہیں مل سکتا۔ بلکہ کسی بھی مقدمے کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہی ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارا سارا نظام اسلامی نہیں بلکہ حرامی ہے۔ یہاں عدل فاروقی کے بجائے عدل شریف کا بول بالا ہے۔ ساری انتظامیہ میرٹ کے بغیر چلتی ہے۔ جس کا پلڑا بھاری ہو اسی طرف سب کی رائے جاتی ہے۔ جس طرح فرعون اور یزید منصفی کرتے تھے یہ بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ علاقے میں کوئی بھی برائی، ڈاکہ، لوٹی کام ہو جائے تو آپ کے علاقے کے ایم پی اے اس کو کنٹرول کرتے ہیں۔ کوئی لڑکی اغوا ہو جائے، یا کوئی زنا بالجبر کا کیس ہو۔ چوری، ڈاکہ ہو۔ ان سب کے فیصلے ان کے واسطے سے ہی ہوتے ہیں۔

ضلع کے کرپٹ اعلیٰ حکام ڈی سی او۔ ڈی پی او وغیرہ:

یہ سب لوگ سیاستدانوں کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کی ترقیاں۔ تبادلے، تقرریاں، چیف سیکرٹری کی وساطت اور سب سیاسی حکام کی مداخلت سے ہوتی ہیں لہٰذا یہ سب ایک دوسرے کے تعلقدار ہوتے ہیں۔ جو بھی حکم یا سفارش اوپر سے تصدیق ہو کر آئے گا وہ یہ بسر و چشم قبول کریں گے۔ اس لئے ان سے کوئی امید کی ضرورت نہیں۔

ہمارے کرپٹ کالج، یونیورسٹیز، ہائی اسکول اور کالج سب آزاد ہیں:

جہاں کو تدریس نہیں ہوتی۔ صرف سائنس کے طلباء کچھ محنتی ہوتے ہیں۔ باقی سب جعلی ڈگری تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ کمرہ امتحان میں نقل عام چلتی ہے بلکہ رشوت لے کر چلائی جاتی ہے۔ رشوت نے ہمارے اندر سے اسلام نکال کر اسلام آباد فٹ کر دیا ہے۔ گلی گلی معاشقے چلتے ہیں اور والدین کا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ وکیل کا بیٹا وکیل، جج کا بیٹا جج اور ڈی پی او کا بیٹا ڈی ایس پی ہی بنتا ہے۔ عوام صرف عوام ہے۔ غریب پڑھتا ہے امیر مزے اُڑاتا ہے۔

ہماری راشی عدالتیں:

ہماری عدالتیں کچھ زیادہ ہی راشی ہیں۔ امیر کو یہاں جلدی انصاف ملتا ہے اور غریب کی زندگی گزر جاتی ہے مگر انصاف لیٹ ہو جاتا ہے۔ ججوں کی اکثریت مادہ پرست رہی ہے۔ اسلام کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں۔ ججوں کا اگر ذاتی کردار دیکھا جائے تو وہ بیشتر کا کردار مشکوک ہی ہے۔ کسی بھی معاشرے کے لئے انصاف بنیادی کردار ادا کیا کرتا ہے۔ مگر اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ سب کورٹ سرخ فیتہ کا شکار ہیں۔ کنبہ پروری، اور شکم پری نے ہماری عدالتوں کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔

ہمارے نام نہاد لیڈر:

اس موضوع پر تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان سے لے اب تک بہت سے لیڈر آئے۔ چند ایک کو چھوڑ کر سب ہی لوگ غدار وطن تھے۔ یا محب وطن نہیں تھے۔ علمائے سُو نے وطن دشمنی کے ساتھ ساتھ اسلام دشمنی میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ تفرقے نے اس قدر مذہبی تعصب کو پھیلایا کہ ملک کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ مدرسہ بازی نے تو نفرت کی اسقدر آبیاری کی کہ اب وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور لیڈر تو پہلے ہی مصلحت اندیش ثابت ہوا ہے۔ ہمارے لیڈر بدکردار شرابی اور زانی ثابت ہوئے ہیں۔ یحییٰ خان، قوم کا بہترین اور بدترین زانی اور شرابی تھا۔ بھٹو صاحب تھوڑی سی پی لیتے تھے۔ اس کے بعد ایک فرعون مردمومن کی شکل میں آیا کہ جس نے سعودیہ اور امریکہ کی کفش برداری میں کمال کا تمغہ لیا۔ جہاد افغانستان کی بھٹی میں ساری قوم کو جھونک کر خود جہنم فی النار ہوا۔ پھر اس کا نام نہاد فرزند آن ٹپکا جس نے ساری دولت لوٹ لی اور کشکول قوم کے نصیب میں لکھ دیا۔ نواز خبیث نے تو ملک کی لٹیا ہی ڈبو دی۔ زرداری نے براستہ ایان علی ساری دولت باہر نکال کر قابو کر لی۔ ہم سے بنگلہ دیش بھی آگے نکل گیا، انڈیا تو بہت آگے ہے۔ ہم اُمت مسلمہ کا رونا روتے رہ گئے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ علمائے سُو نے خوب گل چھرے اُڑائے۔ لوطی مدرسے کھول کر خودکش بمبار بھی فروخت کئے اور اپنے پیٹ بھی بھرے۔ حج بھی کئے عمرے بھی کئے۔ بیچارو بھی رکھیں۔ اور شادیاں بھی من مرضی کی کیں، اور مولانا سمیع الحق کی طرح لونڈوں سے بھی خوب کھیلے۔ اسلام بھی اور اسلام آباد بھی قابو رکھا۔ فتاویٰ بھی چلائے اور پیسے بھی کھائے مگر قوم کی تربیت کی کوئی فکر نہ کی بلکہ اپنی انانیت کے چکر میں ساری قوم کو پارہ پارہ کر دیا نہ قوم کی تنظیم ہوئی، اور نہ قوم میں اتحاد آیا، ایمان ویسے ہی غائب ہے۔

ساری قوم میں ایک بھی ایسا لیڈر نہیں جس میں کوئی کردار ہو، خدا خوفی ہو،، انسانیت ہو۔ ہم علمائے سُو سمیت سب ہی مجرم اور گنہگار ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت بھی منتشر تھے اور اب تو زیادہ انتشار آ گیا ہے۔ ہر ایک فرقے کے مولوی نے اپنی اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا رکھی ہے۔ مادہ پرستی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ آخرت کا کسی کو کوئی فکر نہیں۔ ہر کوئی کہتا ہے میں ہی درست ہوں۔ باقی رہی اُمت مسلمہ۔ دجالی طاقتوں نے سب مسلم ممالک کو اُلو بنایا ہوا ہے۔ سعودیہ سے لے کر ترکی ایران پاکستان فرنگی کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔ اسرائیل کی پالیسی چل رہی ہے اور انڈیا بھی اس میں بہت بھیانک کردار ادا کر رہا ہے۔ اور اُمت مسلمہ انشاءاللہ اور ماشاءاللہ کے ورد میں مصروف ہے۔

شہزاد قیس

اَبر کے چاروں طرف باڑ لگا دی جائے
مفت بارِش میں نہانے پہ سزا دی جائے
سانس لینے کا بھی تاوان کیا جائے وُصول
سب سِڈی دُھوپ پہ کچھ اور گھٹا دی جائے
رُوح گر ہے تو اُسے بیچا، خریدا جائے
وَرنہ گودام سے یہ جنس ہٹا دی جائے
قہقہہ جو بھی لگائے اُسے بِل بھیجیں گے
پیار سے دیکھنے پہ پرچی تھما دی جائے
تجزیہ کر کے بتاؤ کہ منافع کیا ہو
بوندا باندی کی اَگر بولی چڑھا دی جائے
آئینہ دیکھنے پہ دُگنا کرایہ ہوگا
بات یہ پہلے مسافر کو بتادی جائے
تتلیوں کا جو تعاقب کرے چالان بھرے
زُلف میں پھول سجانے پہ سزا دی جائے
یہ اَگر پیشہ ہے تواِس میں رِعایت کیوں ہو
بھیک لینے پہ بھی اَب چُنگی لگا دی جائے
کون اِنسان ہے کھاتوں سے یہ معلوم کرو
بے لگانوں کی تو بستی ہی جلا دی جائے
حاکمِ وَقت سے قزاقوں نے سیکھا ہوگا
باج نہ ملتا ہو تو گولی چلا دی جائے
کچی مِٹّی کی مہک مفت طلب کرتا ہے
قیسؔ کو دَشت کی تصویر دِکھا دی جائے

اس وقت ساری اُمت کے پاس کوئی اتحاد، تنظیم ایمان نام کی کوئی چیز نہیں اور روپے کے علاوہ نہ ہی مثبت دماغ ہے فرنگی یا امریکہ کا سب سے بڑا پٹھو آج کل سعودیہ ہے جو کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے درپے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی فضل کرے گا۔ سعودیہ ایران دشمنی دو بلاک بنا چکی ہے۔ اور اب جنگ قریب ہی ہے۔

آپ کے خطوط

✓ ساجد رانا لندن سے رقم طراز ہیں:

قندیل ادب جنوری 2014ء بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔کیا خوب آپ کی سلیکشن ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔خدا تعالیٰ آپ کی کاوشوں میں مزید برکت دے۔ دیارِ مغرب میں کیا ہی خوبصورت قندیلِ ادب آپ نے روشن کی ہے۔

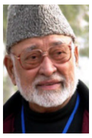

✓ محترم خان بشیر احمد خان صاحب لکھتے ہیں:

رانا صاحب السلام علیکم

آپ کا میگزین ملا۔ شکریہ۔ میں ہمیشہ آپ کا میگزین اپنے دوستوں کو ساری دنیا میں فارورڈ کرتا ہوں۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ جو یہ عظیم خدمت اُردو کی دیارِ غیر میں کر رہے ہیں اور قارئین قندیل ادب کا بھلا کر رہے ہیں اور قارئین قندیل ادب کا بھلا کر رہے ہیں۔ برائے مہربانی جاری رکھیئے۔ میں انگریزی اور اردو رسائل کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک رسالہ نکالنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ میری سمجھ سے یہ بالا ہے کہ آپ اتنا خوبصورت رسالہ کس قدر محنت سے اور شوق سے مستقل دو سال سے جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ آپ کی اس سے علاوہ بھی کافی مصروفیات ہیں۔

✓ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ صاحبہ رقمطراز ہیں:

رانا صاحب سلام۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ایک خوبصورت میگزین بھیجا۔اس میں اپنی غزل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ۔ میں مزید اپنا کلام لکھ رہی ہوں اگر ہو سکے تو اسے بھی شامل میگزین کریں۔

✓ عبدالحمید حمیدی صاحب کنیڈا سے لکھتے ہیں:

رانا صاحب قندیل ادب پڑھ کر مزا ہی آ گیا۔ خدا تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ جاری رکھیئے۔

✓ ف س ایڈیٹر ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ انڈیا سے رقمطراز ہیں:

آپ نے اچھی قندیل جلائی ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ اسے سدا روشن رکھے۔

✓ نسرین شگفتہ لکھتی ہیں:

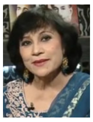

محترم ایڈیٹر صاحب قندیل ادب آپ کو میری طرف سے اور ڈاکٹر نسرین فاطمہ کی طرف سے اتنا خوبصورت اور معلوماتی رسالہ نکالنے پر مبارکباد پیش کرتی ہیں۔ اللہ آپ کے رسالے کو مزید ترقی سے نوازے۔آمین

✓ ڈاکٹر ایم اے حق چیف ایڈیٹر عالمی انوار تخلیق رانچی انڈیا سے لکھتے ہیں:

محترم رزاق بھائی! گلہائے عقیدت جناب امجد مرزا صاحب نے آپ کا بے انتہا خوبصورت رسالہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن بھیج کر مجھ پر بڑا احسان اور کرم کیا ہے۔ میں صرف افسانے لکھتا ہوں میرے افسانوں کو امجد مرزا کافی پسند فرماتے ہیں۔ چند افسانے قندیل ادب کیلئے حاضر ہیں۔ اگر پسند فرمائیں تو کسی قریبی شمارے میں جگہ دیکر ممنون فرمائیں۔

✓ محترم فرید احمد ناصر صاحب فرماتے ہیں:

آپ کا قندیل ادب پہلی بار ملا۔ مختلف موضوعات پر کئی ایک مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ ماضی قریب اور ماضی بعید کے استاد شاعراء کا متنوع کلام پڑھ کر تعریف کرنا بخل ہوگا۔ اسی طرح وقت کے معمور کے تابع اور زیرِ سایہ شعراء کا کلام بھی اس رسالہ میں ملا دونوں زمانوں کے شعراء کا حسین امتزاج اور سنگم محسوس ہوا۔

✓ محترم سوہن راہی صاحب رقمطراز ہیں۔

رانا صاحب سلام۔ آپ کی محبتوں اور محنت کا ثمر قندیل ادب مسلسل مل رہا ہے۔ یہ مجھ جیسے معمولی طالب علم کی علمی پیاس بجھانے کیلئے بہت مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں موجود محبت اور نور کی کرنیں مجھے زندہ رکھتی ہیں۔ اس مشکل اور خوبصورت کام کو جاری رکھنا علم دوست اور فراخدل لوگوں کا کام ہے۔

✓ محترم شیخ رفیق طاہر صاحب لکھتے ہیں۔

جناب محترم رانا صاحب نیا سال مبارک ہو۔ قندیل ادب ملا۔ جب یک لخت میں اسے پڑھ چکا تو میرے دل کے جو تاثرات تھے کہ یہ مختلف بہترین اقسام کے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو جزا دے۔ آمین

✓ محترم تنویر خان سڈنی آسٹریلیا سے تحریر فرماتے ہیں:

محترم رانا صاحب سلام و دُعا۔ خاکسار کو آپ مسلسل دو سال سے قندیل ادب بھجواتے ہیں جس کیلئے بندہ آپ کا بہت ممنون ہے۔ جنوری کا شمارہ دیکھا۔ ہر شمارے کی طرح اس میں بھی ادب، ثقافت، نظم نثر، شاعری، دینی اور دنیاوی معلومات، قصے کہانیاں اور افسانے حالاتِ حاضرہ مزاح لطائف بلکہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ ہر ماہ آپ ایک سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ ہر ماہ ایک شمارہ نکالنا بہت مشکل کام ہے جو کہ آپ کی ٹیم مسلسل کئے جا رہی ہے ہر تحریر خوبصورت الفاظ سے مزین ہر ماہ نیا سرورق انتہائی جدت سے تیار کردہ صفحات آپ کی ادب سے محبت عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس کیلئے مجھ جیسے ادب کے طالب علم پر آپ کی عقیدت اور شکر گزاری لازم ہے کہ بندہ کو یہاں آسٹریلیا میں بیٹھے ادبی تشنگی مٹانے کیلئے معاون ثابت ہوتا ہے۔ میں آپ کا اور معاون ارکنان کا مشکور ہوں۔

علامہ اقبال اور حب الوطنی

ڈاکٹر احمد علی جوہر
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

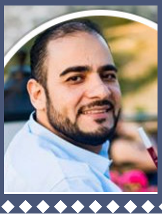

علامہ اقبال دنیا کے نابغہ روزگار شاعر ہیں۔ ان کا کلام شعری جمالیات کا مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی آواز ہے۔ اس عظیم المرتبت شاعر کی پیدائش بروز جمعہ، ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ علامہ اقبال کے مورث اعلی کشمیری برہمن تھے جو علم و دانش میں یگانہ عصر تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ والدہ مذہبی اور خداترس خاتون تھیں اور والد غیر معمولی صوفی بزرگ تھے۔ اس طرح تصوف اور شریعت دونوں نے اقبال کی ابتدائی زندگی میں ان کی کردارسازی میں اہم رول ادا کیا تھا۔ علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم مولانا میر حسن صاحب کی درسگاہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں داخل کرائے گئے جہاں انھوں نے ایف۔اے تک کی تعلیم مکمل کی۔ علامہ اقبال نے ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کالج میں پروفیسر تھامس آرنلڈ نے انھیں فلسفہ پڑھایا جن سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ ایم۔اے کے بعد کچھ دنوں تک علامہ اقبال نے اورینٹل کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فلسفہ کے شعبہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال اعلی تعلیم کے حصول کے لیے یورپ کے سفر پہ روانہ ہوئے۔ یورپ میں انھوں نے ٹرینٹی کالج سے فلسفہ کی ڈگری، کیمبرج یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ٹرینٹی کالج میں علامہ اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر میکٹگرٹ، پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن تھے۔ ان اساتذہ نے انھیں کافی متاثر کیا۔ ۱۹۰۸ء میں علامہ اقبال اپنے وطن ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۳۴ء تک وہ وکالت سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۳ء میں انگریز حکومت نے ان کو 'سر' کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ دنیا کے اس عظیم شاعر نے بروز جمعرات، ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ علامہ اقبال ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ سماجی مفکر و دانشور اور فلسفی تھے۔ ان کی فلسفیانہ اور سماجی شخصیت کی تعمیر میں اسلامی تاریخ و تہذیب اور مشرقی و مغربی علوم و فنون کے مطالعہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ علامہ اقبال مشرق و مغرب دونوں سے متاثر تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؔ کی متصوفانہ شخصیت اور ان کی فکر و نظر نے ان کے ذہن و قلب کو شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ رومیؔ کے علاوہ جن اسلامی مفکروں، درویشوں اور علماء و حکماء سے علامہ اقبال متاثر ہوئے تھے، ان میں بابا طاہر عریاں، محی الدین ابن عربی، ابن طفیل، فخرالدین رازی، امام غزالی، محمود و شستری، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ، شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی، قاضی ابوبکر باقلانی، علی پاشا، حلیم ثابت، ابن مسکویہ اور البیرونی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال کو اپنے ہم عصر مغربی فلسفیوں میں برگساں، ولیم جیمس، نطشے، گوئٹے، میکٹگرٹ، ہالڈن، شوپنہار، آئنسٹائن، وہائٹ ہیڈ اور برٹرنڈ رسل کے نظریات و تصورات نے بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ علامہ اقبال کے سیاسی تصورات پر قدیم یونانی مفکرین اور جدید مغربی مفکرین علی الخصوص ارسطو، ہابس، لاک اور روسو کے اثرات کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے سماجی تصورات کی رو ابن خلدون کے فکری دھاروں سے مل جاتی ہے۔ علامہ اقبال ایسے شاعر ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں بقول اقبالؔ: ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے... بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا علامہ اقبال کی شاعری کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہر بزم و انجمن کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بچے، بوڑھے، مرد و عورت، غرض ہر طبقے کو متاثر کیا۔ آج بھی ان کا کلام زبان زدِ خواص و عوام ہے۔ علامہ اقبال اعلی اخلاقی قدروں اور انسانی عظمتوں کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے گوناگوں پہلو ہیں۔ ان متنوع پہلوؤں میں ان کی شاعری کا ایک تابناک پہلو ان کی حب الوطنی ہے۔ علامہ اقبال ایک سچّے اور پکّے محبّ وطن شاعر تھے۔ وہ مذہبی رواداری کے پُرزور حامی اور ہندوستانی فلاسفروں اور سنتوں کے مدح خواں تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے شروعاتی دور میں چند بہت ہی متاثر کن اور جذبہ حب الوطنی سے بھرپور نظمیں لکھیں۔ ایسی نظموں میں ''ہمالہ''، ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، اور ''نیا شوالہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظم ''ہمالہ'' میں شاعر علامہ اقبال نے ہندوستان کی قدیم تہذیب، اس کے دلفریب مناظر اور اس کی عظمت رفتہ کا گن گایا ہے اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں... چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں ''ترانہ ہندی'' علامہ اقبال کی وطن پرستانہ شاعری کا اعلی ترین نمونہ ہے۔ اس نظم سے مادرِ وطن سے ان کی شدید محبت کا بہت ہی پرتاثیر اظہار ہوتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

اس نظم میں علامہ اقبال نے مذہبی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کا نغمہ یوں گایا ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

مہاتما گاندھی نے ایک خط میں ''ترانہ ہندی'' کی تعریف اس طرح کی تھی۔''جب ان (اقبال) کی مشہور نظم 'ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے''۔

ایک موقع پر مہاتما گاندھی نے ''ترانہ ہندی'' کی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان کا نمونہ قرار دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔''کون ایسا ہندوستانی دل ہے جو اقبال کا 'ہندوستاں ہمارا' سن کر دھڑکنے نہیں لگتا اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔ اقبال کے اس ترانے کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے؟ یا اردو ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی قومی زبان نہیں ہے''۔''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' علامہ اقبال کی ایسی نظم ہے جس میں حب وطن کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس میں علامہ اقبال نے ملک کی وحدت اور یکجہتی کا گیت گایا ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے وطن ہندوستان کے اوصاف اور اس کی عظمت کو بڑے دلآویز انداز میں نمایاں کیا ہے۔ حب الوطنی کے حوالے سے ''نیا شوالہ'' علامہ اقبال کی انتہائی معروف اور موثر نظم ہے جس میں حب وطن کے جذبہ کا اظہار بہت ہی پُر تاثیر انداز میں ہوا ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی آپسی رنجش اور مذہبی اختلافات کو تج کر، باہمی اتحاد و اتفاق اور یگانگت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

دراصل جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات پیدا کر کے انھیں آپس میں لڑا رہے تھے۔ ہندوستانیوں کے یہ آپسی جھگڑے حصولِ آزادی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہے تھے جس سے علامہ اقبال بے حد متردد تھے۔ اس دیر و حرم کے جھگڑوں سے تنگ آ کر علامہ اقبال ایک ایسے شوالے کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے جس میں دیر و حرم کا کوئی امتیاز باقی نہ ہو۔

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اس نظم میں علامہ اقبال وطن کی محبت میں اس درجہ سرشار نظر آتے ہیں کہ انہیں خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آتا ہے۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو، ہر ذرہ دیوتا ہے

اس نظم کا خلوص اور اس کا جوش آج بھی اردو زبان میں وطنی شاعری کا بلند ترین نقطہ ہے۔ اس نظم کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:''شاعری کے اعتبار سے یہ نظم اقبال کے دورِ وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے۔ شاعر نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لیے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کر دیا ہے۔ اکثر ناقدین اقبال کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر یہ اقبال کی بہترین نظم ہے''۔

(۱) علامہ اقبال کے حب وطن کے شدید جذبہ کو ''بچوں کی دعا''، ''صدائے درد'' اور ''تصویر درد'' جیسی نظموں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''بچوں کی دعا'' میں علامہ اقبال نے اپنے وطن ہندوستان کے سجنے سنورنے اور اس میں پھول کی طرح سے زندگی گزارنے کی تمنا کی ہے۔

ہو مرے دم سے یوں ہی مرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

نظم ''صدائے درد'' میں علامہ اقبال اپنے وطن عزیز میں رونما ہونے والے مسلسل فرقہ وارانہ اختلافات پر مضطرب و بے چین ہیں۔

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے، اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

نظم ''تصویرِ درد'' دراصل وطن ہندوستان کے درد و غم کی تصویر ہے۔ اس نظم

میں وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے عناصر جیسے ہندوستانی قوموں کے درمیان باہمی نفاق وآویزش، افتراق وانتشار، تنگ نظری وتنگ دلی اور بدگمانی کا تذکرہ بڑا ہی غمناک ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے وقت میں وطن کی موجودہ صورت حال کی اندوہناک تصویر اس دردناک انداز میں پیش کی تھی۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

اورحال کے آئینے میں مستقبل کے اندیشے کی پیشین گوئی اس طرح کی تھی۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ان دونوں نظموں کے ذریعے علامہ اقبال اہل وطن کو فرقہ پرستی، تعصب و تنگ نظری اور شقاوت وسنگ دلی سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور قومی اتحاد اور باہمی محبت پر زور دیتے ہیں۔ علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ اہلِ وطن اپنی عظمتوں کے شناسا ہوں، فکر میں بلندی پیدا کریں، ذہنی پستی کے قعر سے نکلیں اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل ہوں۔ علامہ اقبال کی یہ ابتدائی نظمیں حب الوطنی کے جذبہ سے لبریز ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری کے تعلق سے رقم طراز ہیں: ''جب ہم اقبال کی ابتدائی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو قدرت اور عورت کے حسن کی پرستش کے بعد جو جذبہ سب سے پہلے نظر آتا ہے وہ وطن کی پرستش ہے''۔ علامہ اقبال نے اپنی ان نظموں کے ذریعے جذبۂ حب الوطنی کو فروغ دیا جس سے آزادی کی قومی جدوجہد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ علامہ اقبال نے کبھی وطن کی محبت کے جذبے کو فراموش نہیں کیا۔ ان کے دورِ آخر کے کلام میں بھی حب الوطنی کا گہرا رنگ موجود ہے۔ ''جاویدنامہ'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی جذبۂ حب الوطنی کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے ہندوستانی سنت وشوامتر کو بڑے احترام سے یاد کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کی روح کا خوبصورت روپ بھی بیان کیا ہے لیکن اس کی غلامی پر آنسو بھی بہایا ہے۔ اس نالہ وشیون علامہ اقبال کے قوت جگر کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ 'ضربِ کلیم' میں دو نظمیں ''گلہ'' اور ''شعاعِ امید'' ہیں۔ دیکھئے ان میں وطن کی محبت کے لئے علامہ اقبال کا دل کس طرح دھڑک رہا ہے۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

'ارمغانِ حجاز' میں بھی وطن کی محبت اور اس کو آزاد دیکھنے کی خواہش کا اظہار موجود ہے۔

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گذر نیست

(ہندی غلاموں کی شب تاریک سحر آشنا نہیں ہے، گویا اس سرزمین پر آفتاب کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ وطن کی غلامی سے علامہ اقبال کس قدر نالاں ہیں، یہ شعر اسی باطنی کرب کی عکاسی کرتا ہے۔ علامہ اقبال کو اپنے وطن سے اس قدر گہرا لگاؤ اور شدید محبت ہے کہ انھوں نے یہاں مقدس و برگزیدہ ہستیوں کو بڑی عقیدت ومحبت سے یاد کیا ہے۔ دیکھئے انھوں نے 'رام' کو کس جوشِ عقیدت سے یاد کیا ہے۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

گرونانک کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

ان کے علاوہ علامہ اقبال نے سوامی رام تیرتھ، شنکر آچاریہ، بھرتری ہری، شیو، گوتم بدھ اور عارفِ ہندی کا تذکرہ بڑے احترام اور عقیدت ومحبت سے کیا ہے جو علامہ اقبال کے وطن سے گہری محبت کی دلیل ہے۔ معروف شاعر علی سردار جعفری علامہ اقبال کی حب الوطنی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ خونِ بہار کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے''۔

(۲) علامہ اقبال کے اشعار میں حب الوطنی کے جذبے کا اظہار بہت ہی خوبصورت اور موثر انداز میں ہوا ہے۔ علامہ اقبال کے کلام میں حب الوطنی کا جذبہ جس طرح پایا جاتا ہے، اس معاملہ میں ہندوستان کے بہت ہی کم شاعران کے مقابل نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کا کلام آج بھی ہمیں انسانیت اور حب الوطنی کے مقدس جذبے کا درس دیتا ہے اور ہمارے جذبہ حب وطن کو تحریک دیتا ہے۔

(۱) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح بانگ درا، ص: ۳۱۹۔

(۲) علی سردار جعفری، اقبال شناسی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص: ۱۱

****

مزاج اپنا اپنا

انشائیہ امجد مرزا امجدؔ

ہر علاقے میں لوگوں کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے اور بول چال بات چیت میل ملاپ کے جدا جدا طریقے ہوتے ہیں۔ ہر شہر کا اپنا الگ حسِ مزاح ہوتا ہے اور اسکو پرکھنے کے لئے آسان طریقہ ہے کہ ان میں رہنے والے کسی فرد سے راستہ پوچھیں یا وقت پوچھیں۔ جیسے گجرانوالہ کے لوگ چند باتوں میں اپنا انوکھا مزاج رکھتے ہیں ان کی مزاح کی حس بہت تیز ہے۔ اس شہر کے لوگ کسی برات میں کسی دوسرے شہر جائیں تو وہاں کے ہوٹل یا تو شرمندگی سے بند ہوجاتے ہیں یا پھر دو گنا کھانا پکاتے ہیں کہ خیر مناؤ آج گجرانوالہ کے براتی آئے ہیں۔ جس گھر میں ان کی برات جائے تھوڑی دیر میں وہاں کی دیگیں اور دیگچے خالی ہوکر کھڑکنے لگتے ہیں۔ اور میزبان بے چارے کو کسی قریبی ہوٹل سے کھانا منگوانا پڑتا ہے۔ گجرانوالہ سیالکوٹ اور فیصل آباد کے لوگ لطیفہ بازی اور جگت بازی میں بھی بہت مشہور ہیں۔ عموماً سٹیج کے مزاحیہ ڈراموں میں وہیں کے لوگ کام کرتے ہیں۔ آپ بازار چلتے کسی شریف عمر رسیدہ اور سنجیدہ شکل آدمی سے وقت پوچھیں تو جواب ملے گا۔ ''کیوں تو گڈی تے چڑھناا ے''۔ (کیوں گاڑی پر سوار ہونا ہے؟)

'میں نے ایک بار ایک دوکاندار سے وقت پوچھا تو وہ مجھے مسکرا کے کہنے لگا۔ ''کیوں جی دوائی دا ویلا ہوگیا جے!'' (کیوں آپ کی دوائی کا وقت ہوگیا ہے؟) جہلم میرا بچپن کا شہر ہے وہاں کے لوگ بھی حسِ مزاح رکھتے ہیں میں نے ایک دوکاندار سے پنجابی میں پوچھا۔ ''چاء ہے'' (چائے ہے) تو وہ مسکرا کے بولا۔ ''جی ہے تہانوں ملن دی'' (جی ہے آپ کو ملنے کی) اس نے چاء کو چاہ بنا دیا۔ اور پھر دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا اور میں اسکی بات سے لطف اندوز ہوتا بغیر چائے خریدے گھر آ گیا۔۔۔

لاہور زندہ دل لوگوں کا شہر مشہور ہے۔ یہاں کے لوگ باتوں میں کھانے پینے میں سیاست میں پیار محبت اور لڑائی مار کٹائی غرضیکہ ہر کام میں دوسرے تمام شہروں سے مختلف ہیں۔ سکول کے زمانے میں ایک بار کسی کے ساتھ گیا تو ڈرائیور راستہ بھول گیا۔ سڑک کے کنارے ایک مریل کمزور سا شخص جیسے بانس کے گرد کپڑا لپٹا ہو جو شاید ہوا کے زور پر چل رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے مخاطب کیا۔ ''اے بھائی صاحب'' کوئی جواب نہ ملا۔ ''ملک صاحب۔'' جواب ندارد 'اے چوہدری صاحب۔ شیخ جی۔ اے بٹ صاحب۔'' مگر اس نے مڑ کر دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ یکدم ڈرائیور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ پہلوانوں کے شہر میں کسی کو مخاطب کر رہا ہے تو اس نے جوں کہا۔ ''اے پہلوان جی'' تو اس چلتی ہوئی لاش جیسے لاہوری پہلوان نے فوراً گھوم کر جواب دیا۔ ''کہو بھائی جی کی گل ہیگی اے'' (کہیں بھائی صاحب کیا بات ہے) اور فوراً اپنی باہیں مرغ کے پروں کی طرح پھیلا کر سینہ تان لیا۔ اور پھر اسنے محض ہمیں راستہ ہی نہ سمجھایا بلکہ ساتھ بیٹھ کر وہاں چھوڑ کے بھی آیا۔

ایک بار ہم پشاور ایک دوست کے بیٹے کی شادی پر گئے تو نکاح وغیرہ سے فارغ ہوکر سوچا چلو یہاں کے مشہور قصہ خوانی بازار کی سیر کر لیتے ہیں۔ گھوم پھر کے جب واپس جانے لگے تو محسوس ہوا کہ راستہ بھول گئے ہیں۔ ہمارے پنجابیوں کے دلوں میں پٹھان لوگوں کا ایک الگ تصور قائم ہے۔ بچپن میں اکثر مائیں بچوں کو ڈراتی ہیں کہ اگر کھانا نہ کھایا تو باہر کھڑا پٹھان لے جائے گا۔ ہمارے ہاں بے چارے پٹھانوں کو یا تو ہینگ نسوار بیچنے والا سمجھا جاتا ہے اور یا پھر بچے اٹھانے والا۔ ہر قوم اپنی عادات واطوار سے ہی پہچانی جاتی ہے۔!! تو جب ہم پشاور کے بازار میں گم ہوگئے تو بڑی سوچ بچار کے بعد اور دیکھ بھال کے بعد ایک بزرگ نما پٹھان سے راستہ پوچھا، اس نے ہمیں جو غور سے دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں شہد کی نہریں پھوٹ پڑیں اور شہادت کی انگلی پھیر کر ہونٹوں میں دبی ہوئی نسوار کو ہموار کیا اور ہندکو میں کہا۔ ''اوہ چنا توں کیوں گوا چا پھر دا ایں ساڈھے ول آ کے رہونا اوئے۔ ایمان نال نالیں سارے شہر دی مفت سیر وی کرا ساں ای تے نالیں ہور وی بہتی عیش کرا ساں ای۔'' (اے چاند! تم کیوں بھٹکے ہوئے پھرتے ہو ہمارے ہاں رہونا تو ایمان سے تمہیں مفت میں سارے شہر کی سیر بھی کرائیں گے۔ اور بہت سی عیش بھی کرائیں گے۔۔۔!) ہم نے بغیر اس سے پتہ دریافت کئے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔۔۔ اسی طرح ایک کام سے گجرات جانے کا اتفاق ہوا تو بس سے اترے ہی تھے آذان کی آواز آئی سوچا اس شہر کے کام کو اللہ کے نام پر اس کے گھر سے شروع کرتے ہیں۔ لہٰذا پہلے نماز کے لئے ایک قریبی مسجد گئے۔ نماز پڑھی باہر آئے تو جوتیاں غائب تھیں۔ کچھ دیر وہیں ننگے پاؤں بیٹھ گئے کہ شاید لے جانے والے کو احساس ہوجائے کہ غلط جوتی پہن لی ہے یا پھر گھر جا کر اسے پتہ لگ جائے اور وہ نمازی ہونے کے ناطے کسی کے ننگے پاؤں کا احساس کرکے واپس آجائے۔ مگر جو سنا تھا وہ سچ پایا ہم بھی گجرات جا کر مسجد میں جوتیاں گنوا بیٹھے۔ اب جو ننگے پاؤں ایک قریبی جوتیوں کی دوکان پر گئے اور دوکاندار سے جوتی مانگی تو اس نے بڑے حیران ہوکر ہمیں دیکھا اور کہنے لگا۔ ''بھائی صاحب! نئی جوتی خریدنے آئے ہو تو گھر سے کوئی پرانی چپل ہی پہن کر آجاتے ہم نے کون سی وہ چھین لینی تھی۔'' اب میں اس کے شہر کی شہرت کا بھرم رکھ گیا ورنہ کہتا۔ ''لگتا ہے تمہاری دوکان سے باہر کے ہی لوگ آکر جوتیاں خریدتے ہیں ورنہ مقامی لوگ تو مسجدوں سے ہی جوتیاں اٹھا کر گزارا کرتے ہیں۔'' یہاں گھومنے کا کوئی پروگرام نہ تھا ورنہ اللہ جانے کپڑے بھی سلامت رہتے۔!! ایک بار کراچی کی سیر کرتے بھی اسی طرح راستہ پوچھ بیٹھے تو مخاطب نے ہمیں پہلے بڑے غور اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا، پان کی پیک ہمارے قدموں کے قریب تھوک کے فرمایا ''پھر سے کہو میاں! کہاں جانا ہے۔۔۔ ہم نے تو یہ نام پہلی بار سنا ہے۔ ہماری مانو تو کسی ٹیکسی ویکسی کو پکڑ لو وہ چھوڑ آئے گا۔ یہ پوچھ تاچھ کا جھنجھٹ اچھا نہیں ہوتا۔ تم بھی پریشان ہوگے اور دوسرے کو بھی پریشان کر رہے ہو۔ یہاں نئے لگتے ہو۔۔۔!!'' اب سوچتے ہیں کہ ان سب سے اچھے یہ انگریز لوگ ہیں ایک بار کسی میم سے راستہ پوچھ لیں تو وہ بے چاری گھر تک چھوڑ کر آتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو گھر ہی میں ٹک جاتی ہے اور ساری عمر جان چھڑانی مشکل ہوجاتی ہے ایسا راستہ سمجھاتی ہے کہ بندہ باقی سارے راستے بھول جاتا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ کا دورہ جرمنی

رپورٹ: رانا عبدالرزاق خان

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی کے صدر محترم عبدالغفور ڈوگر صاحب نے ستمبر میں صدر صاحب تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ کو دورہ جرمنی کی دعوت دی۔جس میں ادبی سرگرمیوں اور باہمی میل جول اور سپورٹس کو پروموٹ کرنا تھا۔جو کہ ہمارے صدر صاحب نے ایک عاملہ میٹنگ میں قبول کر لی۔اور باہمی مشورہ سے دو دن کا دورہ تجویز ہوا جو کہ ۲۱/ اکتوبر سے ۲۴۔اکتوبر ۲۰۲۲ء کو طے پایا۔محترم صدر مبارک صدیقی صاحب نے آرگنائزنگ کمیٹی بنا دی۔جس کے چار ممبران تھے۔رانا عبدالرزاق خاں، عبدالمنان اظہر صاحب، عرفان شہزاد صاحب، عطاء القادر طاہر صاحب۔سب ممبران ایسوسی ایشن کو اطلاع کر دی گئی۔مورخہ ۲۱/ اکتوبر بروز جمعہ بوقت گیارہ بجے کل سترہ ممبران تین گاڑیوں میں دعا کے بعد روانہ ہوئے۔جن کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) محترم صدر مبارک صدیقی صاحب۔ ۲۔رانا عبدالرزاق خاں ۳۔عبدالمنان اظہر صاحب ۴۔رانا عرفان شہزاد صاحب۔ ۵۔عطاء القادر طاہر صاحب۔ ۶۔عامر خالد

محمود صاحب، ۷۔مرزا عبدالباسط صاحب، ۸۔ضیاء الحق قرشی صاحب، ۹۔عزیز طاہر صاحب۔ ۱۰۔ خالد محمود صاحب، ۱۱۔میر شفیق صاحب، ۱۲۔آغا حبیب اللہ صاحب، ۱۳۔فاروق اکبر صاحب، ۱۴۔رانا ناصر احمد صاحب، ۱۵۔طاہر انعام قریشی صاحب، ۱۶۔اسحٰق ناصر، ۱۷۔فضل ناصر صاحب۔ ۱۸۔آصف علی پرویز صاحب۔ ۱۹۔مظفر احمد چٹھہ صاحب بنیادی ہدایات سب کو دے دی گئیں۔امیر قافلہ عبدالمنان اظہر صاحب تھے۔محترم شفیق میر صاحب نے کھانا بڑی محنت سے تیار کیا جو تینوں گاڑیوں میں رکھوا دیا گیا۔پانی، جوس، فروٹ، ریفرشمنٹ کا کافی سامان بھی تھا۔راستہ میں نماز جمعہ اور طعام کے لئے دو وقفے کئے گئے۔

ہمارا قافلہ گیارہ بجے رات فرینکفرٹ جرمنی بیت السبوح پہنچا تو صدر محترم عبدالغفور ڈوگر صاحب کو خوش آمدید کے لئے منتظر پایا۔رات کو بہت اچھا کھانا پیش کیا گیا۔سب احباب کو ان کی بہترین رہائش دے دی گئی۔جو بہت ہی آرام دہ تھی۔رات بہت ہی آرام سے گزری۔رانا عرفان شہزاد صاحب سیکٹری سپورٹس تھے۔دوسرے دن گیارہ بجے باسکٹ بال کا میچ شروع ہوا۔برطانیہ اور جرمنی کی ٹیموں نے حصہ لیا۔جس کا آغاز دعا سے ہوا جو محترم مولانا حیدر علی ظفر صاحب نے کروائی۔اور کھلاڑیوں سے تعارف بھی ہوا۔اس موقع پر کافی ممبران موجود تھے۔باسکٹ بال کے کھلاڑی مندرجہ ذیل تھے۔مرزا عبدالباسط صاحب کیپٹن، انعام الحق قریشی، ضیاء الحق قریشی، فضل ناصر، اسحٰق خالد، رانا ناصر احمد۔جرمنی کے کھلاڑی۔سید شکیل احمد صاحب، ملک امجد صاحب، ثاقب مسعود صاحب، قیصر جمال صاحب، عبدالرزاق ڈوگر صاحب، صادق پرویز صاحب، منصور

رسول صاحب۔عطائالعزیز صاحب،محمد افضل گردیزی صاحب،کرکٹ کے تین میچ ہوئے دو یو کے نے جیتے اور ہال میں گہما گہمی کا سماں تھا۔صدر صاحب ٹکوسا جرمنی اور صدر صاحب برطانیہ پروفیسر چوہدری حمید احمد صاحب،عبدالرحمن مبشر صاحب،حمیداللہ ظفر صاحب اور ان کے علاوہ بہت سے ممبران بھی موجود تھے۔ ۱۲ بجے کرکٹ میچ ہوا۔کھلاڑیوں کے نام۔رانا عرفان شہزاد،انعام الحق قریشی،فضل ناصر،اسحق خالد، رانا ناصر احمد،عزیز طاہر،آصف علی پرویز،شفیق میر،مبارک صدیقی، عامر خالد محمود، خالد محمود،۔جرمنی کے کھلاڑی۔محمد افضل،رانا شاہد،نفیس بٹر،مامون احمد۔ایک بجے بیڈمنٹن کا میچ ہوا۔مقابلے بہت ہی دلچسپ رہے۔یو کے ٹیم نے میچ جیتا۔بیڈمنٹن کے کھلاڑی۔رانا ناصر احمد،فضل ناصر،اسحق خالد۔جرمنی کھلاڑی۔عطائالعزیز صاحب،محمد افضل گردیزی صاحب۔نماز ظہر کے بعد کھانا کھایا گیا۔نماز عصر کے بعد ادبی مجلس کا آغاز ہوا جو کہ کمیٹی روم میں تھی۔تلاوت۔عبدالرزاق ڈوگر صاحب نے کی۔نظم،عبدالرحمن مبشر صاحب نے پڑھی۔جس میں محترم صدر مبارک صدیقی صاحب سے گزارش کی گئی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ بنصرالعزیز کی مصروفیات پر روشنی ڈالیں۔صدر صاحب نے تفصیلی ذکر کیا۔اور پھر اپنی چند غزلیں بھی پیش کیں جن سے سامعین و

ناظرین کافی محظوظ ہوئے۔ پھر مقامی شعرا کا مشاعرہ ہوا جس میں کچھ شعرا نے خلافت پر اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ شعرا کے نام یہ ہیں۔ رانا عبدالرزاق خاں عاصی صحرائی لندن سے۔ جرمنی سے حمیداللہ ظفر صاحب، اسحاق اطہر صاحب، عبدالحمید رامہ صاحب، اشرف بٹ صاحب، ماعر افتخار صاحب، طاہر مجید صاحب۔ آصف علی پرویز صاحب۔

اس مجلس میں بہت سے ممبران مجلس عاملہ جرمنی بھی شامل ہوئے۔ اور یہ ادبی مجلس بہت کامیاب رہی۔ احباب نے بہت داد دی۔ اور سبھی بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد نماز مغرب اور عشاء ادا کی گئیں۔ آٹھ بجے ہال میں مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ ہال کو بہت ہی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ امیر صاحب جرمنی محترم عبداللہ واگس صاحب تشریف لا چکے تھے۔ ان کے دائیں بائیں دونوں صدران ٹکوسا اور پروفیسر چوہدری حمید احمد صاحب، پرنسپل جامعہ احمدیہ جرمنی محترم شمشاد احمد قمر صاحب، تشریف رکھتے تھے۔ پروگرام تلاوت قرآن کریم سے شروع ہوا۔ جو کہ عبدالرزاق ڈوگر نے کی۔ نظم شیخ خالد محمود نے پڑھی اس کے بعد صدر تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ محترم مبارک احمد صدیقی نے خلافت کی برکات اور ہدایات پر روشنی ڈالی۔ تقسیم انعامات کے بعد بعد ازاں امیر صاحب جرمنی نے تقریر کی اور فرمایا کہ ہم سب کو خلافت احمدیہ کی ہدایات عمل پیرا رہنا چاہیئے۔ پھر ان کے بعد صدر تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی محترم عبدالغفور ڈوگر صاحب نے تمام حاضرین کا تشریف لانے

پرشکریہ ادا کیا۔امیر صاحب نے دعا کرائی اور کھانا شروع کرنے کی درخواست کی گئی۔دوسرے دن مورخہ ۲۳۔اکتوبر کو محترم مولانا الیاس منیر صاحب ایڈیٹر اخبار احمدیہ جرمنی سے ایک ملاقات تھی۔محترم صدیقی صاحب نے ان سے درخواست کی کہ اپنے ایام اسیری کے واقعات سنائیں تا کہ ہم بھی ان امتحانی دور کے واقعات سے مستفید ہو سکیں۔
محترم مولانا الیاس منیر صاحب ایڈیٹر اخبار احمدیہ جرمنی نے اپنے بھی اور رانا نعیم الدین صاحب مرحوم مجاہد ساہیوال کی اسیری کے روح پرور واقعات سنائے اور حضور خلیفة المسیح الرابعؒ کی شفقتوں اور پیار کے واقعات سنائے کہ سب سامعین محظوظ ہوئے۔اس کے بعد چند تصاویر ہوئیں۔اس کے بعد ہمیں دعوت تھی پرنسپل جامعہ احمدیہ جرمنی محترم مولانا شمشاد احمد قمر صاحب کی طرف سے کہ دوپہر کا کھانا جامعہ احمدیہ میں کھانا ہے اور جامعہ احمدیہ کو وزٹ کرنا ہے۔ہم سب صدر تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی کی راہنمائی میں جامعہ احمدیہ جرمنی پہنچے تو جناب پرنسپل جامعہ احمدیہ ہمارے منتظر تھے۔بہت ہی محبت سے استقبال کیا۔آفس،لائبریری،کلاس رومز کے وزٹ کے بعد ہم سب نے باجماعت نماز ظہر وعصر ادا کیں۔پھر سب مہمانوں کے لئے بہت ہی پرتکلف کھانا لگا دیا گیا۔سب نے سیر ہو کر کھایا۔اس کے بعد طلباء کے بہت اصرار پر محترم مبارک احمد صدیقی صاحب سے شاعری سنی گئی۔سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری سے سب نے لطف اُٹھایا۔اور محفل کشت زعفران بن گئی۔
اس دوران چائے بھی پیش کی گئی۔اس کے سب کے ساتھ اجتماعی تصاویر ہوئیں۔اور پرنسپل صاحب کی مہمان نوازی سے ہم سب بہت ہی متاثر ہوئے۔اس کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔جب فرینکفرٹ پہنچے تو پتہ چلا کہ صدر محترم عبدالغفور ڈوگر صاحب نے شام کی چائے اپنے گھر میں پیش کرنی ہے۔ان کا گھر دیکھ کر سبھی بہت خوش ہوئے۔پر تکلف چائے نوش کرنے کے بعد کئی دوستوں کے انٹرویو بھی ریکارڈ کئے گئے۔تصاویر بھی ہوئیں۔پھر ہم سب بیت السبوح کے لئے روانہ ہوئے۔نمازوں کی ادائیگی کے بعد کھانا کھایا۔اور آرام کے لئے اپنی خوابگاہوں کی طرف لوٹے۔صبح فجر کے بعد ہماری تیاری اور روانگی تھی۔ناشتے کے بعد ہم سب اپنا اپنا سامان پیک کر کے گاڑیوں میں رکھ چکے تھے۔صدر مبارک صدیقی صاحب نے بھی ان کا شکریہ ادا کیا۔اہلیان جرمنی کا حسن سلوک اور مہمان نوازی بہت ہی شاندار تھی۔جو ہمیشہ یاد رہے گی۔صدر محترم عبدالغفور ڈوگر صاحب نے سب سے ہاتھ ملایا اور دعا کرائی، اور قافلہ آٹھ بجے روانہ ہوا۔راستہ میں ہمارا قیام برسلز یورپی یونین Belgium کے قریب تھا۔ہم سب وہاں بروقت پہنچ چکے تھے۔کھانا کھانے کے بعد سب نے تصاویر بنوائیں۔وہاں سے ہم روانہ ہوئے رات آٹھ بجے ہم ٹرین پر سوار ہو چکے تھے۔مسلسل سفر کے بعد ہم ساڑھے دس بجے بیت الفتوح پہنچے۔اور وہاں سے ہم سب نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔گاڑی چلانے والے دوستوں کا شکریہ۔محترم عامر خالد محمود صاحب،رانا عرفان شہزاد صاحب،فاروق اکبر صاحب کا شکریہ۔جنہوں نے بڑی محبت اور مہارت سے گاڑیاں ڈرائیو کیں۔اور باقی سب احباب کا بھی شکریہ جنہوں نے باہم ایک دوسرے کا خیال رکھا۔اور صبر و شکر سے سفر کو پرامن اور خوشگوار رکھا۔

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG 4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- ✓ Company incorporation / Registered Office Address
- ✓ Personal Income Tax Return investigations,
- ✓ Rental Income Tax Returns
- ✓ UK State Pension Entitlement Review
- ✓ Advice on filling Gaps in UK State Pension
- ✓ UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- ✓ Private UK Pension Tracing.
- ✓ Assets Review for Inheritance Tax
- ✓ Appealing-Past years HRMC Penalties
- ✓ Preparation / Filing of Prior year tax returns
- ✓ Duplicate-Payslips/ P60s

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD KHAN ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD MORDEN SURREY SM4 5HP UK
TEL +44(0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
E-MAIL: INFO@SARMADGLOBAL.COM
WEB. WWW.SARMADGLOBAL.COM
CELL +44 (0) 7903 416966

SHARIF
JEWELLERS
TIMELESS JEWELS, PRICELESS MEMORIES

28 London Road, Morden. SM4 5BQ London
@sharifjewellers +44 7888 300 399

حق اور سچ دیکھنے کے لئے یوٹیوب چینل

9 Brothers TV International

9 Brothers Tv International دیکھئے

TRANSLATIONS
ENGLISH - URDU
ATA TAHIR
DPSI ENGLISH LAW

IOLET DIPLOMA IN PUBLIC SERVICE
Interpreting Urdu-English Law

07818210181
atatahir@hotmail.com

HEATING LTD.
24/7
EMERGENCY SERVICE

Domestic & Commercial
Contact: 07722 222 965
www.247breakdownsolution.co.uk

FREE CONSULTATION & LEGAL ADVICE
24 Hours Emergency Numbers

مفت قانونی مشاورت
24 گھنٹے ایمرجنسی سروس

07878 33 5000 / 07774222062

RASHID & RASHID LAW FIRM
211, The Broadway, Southall, UB1 1NB.
Near McDonalds Southall.
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

190 Merton High Street, Wimbledon
London SW191AX
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

راشد اینڈ راشد لاء فرم
211، دا براڈو، ساؤتھ ہال، UB1 1NB نزد میکڈونلڈز ساؤتھ ہال
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

190 میرٹن ہائی سٹریٹ، ویمبلڈن
لندن SW19, 1AX
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

SOW THE SEEDS OF LOVE

Benefit with very competitive rates, tailored advice & service to suit your specific needs, 24 hour response to all online enquiries and our many years of experience
www.rashidandrashid.co.uk

مناسب ریٹس میں آپ کی مخصوص ضروریات کے
تحت موزوں مشورہ، 24 گھنٹے آن لائن سروس
اور ہمارا سالوں کا تجربہ

- Asylum & Immigration
- New Point Based System
- Settlement Application (ILR)
- European Law
- Nationality & Travel Documents
- Human Rights Applications
- High / Court of Appeals
- Family Matters and Divorce
- Switching Visas
- Over Stayers
- Legacy Cases
- Work Permits
- Visa Extensions
- Judicial Reviews
- Tribunal Appeals
- Student appeals

- اسائلم / سیاسی پناہ اور امیگریشن
- نیا پوائنٹ بیسڈ امیگریشن سسٹم
- ویزا میں تبدیلی
- ویزا توسیع / ایکسٹینشن
- سیٹلمنٹ درخواست (ILR)
- یورپین قانون
- اوور سٹیئرز
- جوڈیشل ریویو
- نیشنیلٹی اور سفری دستاویزات
- درخواست برائے انسانی حقوق / ہیومن رائٹس
- وراثتی معاملات / لیگیسی کیس
- ٹرائیبونل اپیل
- ہائی / کورٹ آف اپیل
- طلاق و دیگر خاندانی معاملات
- ورک پرمٹ
- سٹوڈنٹس اپیل

RASHID & RASHID
Solicitors, Advocates
Immigration Specialists
Commissioners of Oaths

راشد احمد خان
وکیل (پرنسپل)